

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226582

UNIVERSAL
LIBRARY

O.P.—552—7-7-66—10,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۲۹۷۵

Accession No. ۷۵۳۵

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

مضامین ابوالکلام آزاد

جلد دو

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا إِنَّا نُرِيدُ الْأَعْلَىٰ

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

مضامین ابوالکلام آزاد

مرتبہ

بدیع الحسن بی اے (جامعہ)

ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس - دہلی

مطبوعہ جناح پریس، دہلی
مئی ۱۹۴۲ء

فہرست

۷	۱۔ مقدمہ
۱۱	۲۔ سیاست :
۱۳	۱۔ اہلال کی پوشیدہ تعلیم
۳۲	۲۔ صبح امید
۵۶	۳۔ القسطاس المستقیم
۱۰۵	۴۔ الجہاد فی سبیل الحریث
۱۲۵	۳۔ ادب :
۱۳۷	۱۔ خط و کرب
۱۵۸	۲۔ اکاذیب و شرمناک
۱۶۵	۳۔ مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام

۱۸۹	۴۔ تعلیم اور تعلیمی ادارے
۱۹۱	۱۔ مسلمانان ہند اور گورنمنٹ کی تعلیمی حکمت عملی
۲۰۴	۲۔ ندوۃ العلماء
۲۴۱	۳۔ نشہ شام کی نصف شب (سلم یونیورسٹی)
۲۶۵	۴۔ نشہ نیم شبی کا صبحِ خار (" ")
۳۱۷	۵۔ عالم اسلام
۳۱۹	۱۔ عظیم الشان ادارہ
۳۲۵	۲۔ سقوطِ ادارہ
۳۵۸	۳۔ تسخیرِ ادارہ
۳۶۱	۴۔ بطلِ ادارہ

مقدمہ

سماں حرم باز بہ تعمیر حرم خیزند
کتے بابرکت اور کتے محترم ہیں وہ لوگ جن کے دم سے زندگی کے
مرجھائے ہوئے پورے پھر سے جی اٹھتے ہیں جن سے تاریکی کو روشنی چہل کر
علم، اور رنج کو عرفان حاصل ہوتا ہے

جو گرتوں کو سنبھالتے ہیں، بہکتوں کو راہ دکھاتے ہیں اور سوتوں
کو جگاتے ہیں۔ ظلم و عدوان، طغیان و تمرد، خواہگی و قیصریت جب ان
باصفا حق پرستوں کے مقابلے پر آتی ہے تو یہ لوگ اُس کا جم کر مقابلہ
کرتے ہیں، یہاں تک کہ جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کا آغاز مسلمانوں کے
سیاسی اور تمدنی اقتدار کے انتشار کا آغاز تھا۔ خلافت الہیہ کے علم بردار
اب اپنی حفاظت کرنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ انھیں ان کے گھروں سے
بکالا جا رہا تھا اور دنیا کی تمام مسیسی قوتیں اپنی پوری طاقت کے ساتھ ملی ہوئی
تھیں کہ اللہ کی زمین پر کوئی اللہ کا نام لینے والا باقی نہ رہے۔

خود مندوستان میں مسلمانوں کی جاہ و شہرت، شان و شوکت بہت
صورت، نقش ماضی اور قصہ پارینہ بن چکی تھی سلطنت مغلیہ کے نقوش

آہستہ آہستہ بالکل مٹ چکے تھے۔ نئی روایات نے بُرائی روایات کی جگہ لے لی تھی، ہندوستان کے مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے اور اُن کی روحوں پر موت کی پڑمردگی طاری ہو چکی تھی۔ امرا، وکبار عیش و عشرت میں مست ہو کر غم کو غلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور عام مسلمان زندگی کی حقیقتوں کو جام شراب کی رنگینیوں میں گم کر دینا چاہتے تھے۔ اُن کی قومی سیرت جو اُن کا طرہ امتیاز تھی باطل مسخ ہو چکی تھی۔ اُن میں صداقت، جوش، ہمت، شجاعت ایسے بلند جذبات کی جگہ تعصب، پست ہمتی، غلامی، جھوٹ، ریاکاری جیسے رکیک جذبات نے گھر کر لیا تھا۔ اس زبردست انقلاب نے اُن پر سکتہ طاری کر دیا تھا اور وہ نقش حیرت بن کر رہ گئے تھے۔ اُن کے پاس دماغ تھے مگر صلاحیت فکر سے عاری، اُن کے پاس آنکھیں تھیں مگر نصارت سے محروم، اُن کے پاس کان تھے مگر سننے کی طاقت سے عاجز، ہاں اُن کے پاس دل بھی تھے مگر دردناک اور خالی از اضطراب!

نٹو مارے اصلاحات اور تقسیم بنگالہ کی تہنیت لے اُن کی آنکھیں کھول دیں۔ اب انھیں تلاش تھی ایک ایسے مجاہد کی جو حریت کے نام پر کٹ مرنا جانتا ہو۔ ایک ایسے مجدد کی جو ملک کے جد بے روح میں جانتا۔ تازہ پھونک دے۔ اور ایک ایسے امام کی جو بے این تیرگی انھیں منزل کا پتہ دے۔

مسلمان اسی انتظار میں تھے کہ ۱۹۱۲ء میں بنگال کے خط سے

وہ رعد آسا صدا بلند ہوئی جس نے سارے عالم میں انقلاب کی لہر دوڑادی، اور مسلمانوں کے جمود اور تن آسانی کو تاریکیوں کی طرح لرزاں کر دیا۔ یہ آواز تھی ایک مہینہ سالہ نوجوان کی جو طوفان بکراٹھا اور ساری دنیا کے احساسات پر چھا گیا۔ یہ آواز تھی اُس مجاہد اعظمؒ کی جس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ زمین کا چپہ چپہ ظلم و تعدی اور جبر و استبداد کے بوجھ سے دبا چلا جا رہا ہے جس کے کانوں میں تقسیم بنگالہ کی تینج کے خلاف احتجاج کی آوازیں گونج رہی تھیں اور جو بلقان کی بواڑوں اور یتیموں کی فریادیں سن رہا تھا۔ یہ آواز تھی اُس مرد مومن کی جو ازل سے ایک درد مند دل لیکر آیا تھا، جو مسلمانوں کے خیال سے تڑپ اٹھتا تھا۔ یہ آواز اُس مرد مجاہد کی تھی جو تمام دنیا کو پاک و استحقار سے ٹھکراتا ہوا مشہد آزادی و حریت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ نوجوان، یہ مجاہد اعظمؒ یہ مرد مومن کون تھا؟ احمد الملکی ابوالکلام آزاد جس نے خواب غفلت میں ڈوبی ہوئی قوم کو جھجھوڑا اور اُٹھیں آواز دی :-

”میں وہ صور کہاں سے لائوں جس کی آواز چالیس کروڑ
دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرے؟ میں اپنے ہاتھوں
میں وہ قوت کیسے پیدا کروں، جس کی سینہ کو بی کے شور
سے سرکش تگاب خواب موت آور ہٹیا رہو جائیں؟
آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری
کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جس کو زوالِ ملت

زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر جو آتش غیرت و محبت
 کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟ اور پھر آہ! کہاں ہیں
 اس پریم شدہ انجن کے ماتم گار، اس برباد شدہ قافلہ
 کے نالہ ساز، اس صنف ماتم کے فغاں سنج، اور اس
 کشتی طوفانی کے مایوس مسافر جن کی موت و حیات کے
 آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا
 خاموش۔ روتے ہیں، یا مایوسی سے چپ و راست
 بگمراں، مگر نہ ان کے ہاتھوں میں اضطراب ہے اور
 نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام ہر اور نہ ارادوں
 میں عمل کا ولولہ۔ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں
 اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے
 قفل توڑ دئے ہیں اور گھر والے سوئے بھی نہیں، مگر اب
 تک آنکھ ملنے سے ہمت نہیں ملی ہے۔ جب کسی کے گھر
 میں آگ لگتی ہے تو محلہ کے دوست، دشمن سب ہی پانی
 کے لئے دوڑتے ہیں لیکن اسے رونے کو ہمت اور مایوسی
 کو زندگی سمجھنے والا یہ کیا ہے کہ تمہارے گھر میں آگ
 لگ چکی ہے، ہوا تیز ہے، اور شعلوں کی بھرپور سخت
 لگن میں سے کوئی نہیں جس کے ہاتھ میں پانی ہو۔ پھر
 اگر اسی وقت کے منتظر تھے، تو کیا نہیں سنتے کہ وہ دقت

آگیا ہے۔ اگر تم کشتی کے ڈوبنے کا انتظار کر رہے تھے، تو کیا نہیں دیکھتے کہ اب اس میں دیر نہیں؟ اور آہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی سیزدہ صد سالہ کشتی، جو بارہا ڈوبی اور بارہا اچھلی، اور نہیں معلوم اب ڈوبنے کے بعد ہمیشہ کے لئے سطح عالم سے ناپید ہو جاتی ہے، یا اس کے ٹوٹے ہوئے تختے اور تار تار بادبان کے ٹکڑے سمندر کی موجوں کا چند گھنٹے اور مقابلہ کرتے ہیں۔“

مسلمانوں نے اس آواز کا جواب دیا اور اُس مرد مجاہد کے پیچھے چل پڑے۔ مگر جس راستے پر چلے وہ ایسا راستہ نہ تھا کہ ننٹوں، گھنٹوں یا برسوں میں طے ہو جاتا۔ صعوبت راہ سے ان کے قدم ڈمگنا لگے۔ غبار تو تاک میں بیٹھ ہی تھے۔ بھکے ہوئے قدموں کی لغزش کو بھانپ گئے اور لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کا پُرانا سبق اُنھوں نے بھروسہ بنا شروع کر دیا۔ برسوں کی قربانیوں کے بعد جو چیز حاصل ہوئی تھی مسلمان اس سے بے پروا ہو کر ایک دفعہ پھر عیش و عشرت میں مبتلا ہو گئے۔ اتفاقاً سے انھیں اپنے لیڈر بھی مل گئے جنھوں نے اُن کے سامنے ایک ایسی راہ عمل پیش کر دی جس میں نہ کسی قسم کا خطرہ تھا، نہ کوئی صبر آزما منزل۔ مگر اس مرد مجاہد نے اس کی پروا تک نہ کی اور مگر کہ بھی نہ دیکھا کہ اُس کی قوم کے کتنے افراد آج اُس کے ساتھ ہیں۔ اُس نے جس راستہ پر قدم رکھا تھا اُس پر بڑھتا ہی چلا گیا، اور آج بھی آہنی سلاخوں کے پیچھے، اپنی قوم

سے دور، نہ معلوم کہاں ظلم و جور اور جبر و تشدد کے خون آشام دیوؤں سے
برسرِ بیکار ہے۔

یہ اُسی دردِ آشنا مسلمان کے مضامین کی دوسری جلد ہے
اسے پڑھ کر مسلمانوں کو پھر اپنا بھولا ہوا راستہ یاد آ جائے تو میں سمجھوں گا
کہ میری محنت مشکور ہوئی۔

ابھی اس کی دو جلدیں اور باقی ہیں۔ اگر سیاسی فضا اور موافق
حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ بہت جلد ہیہ مجموعے بھی آپ کے سامنے
ہوں گے۔

مولانا کے بعض مضامین اتنے طویل تھے کہ اگر انھیں پورا نقل کیا جا
تو ایک جلد میں دو تین مضمون سے زیادہ نہ آسکتے۔ اس لئے بعض مضامین
میں ہم نے مجبوراً بعض حصوں کو نظر انداز کر دیا ہے جس کا ہمیں افسوس ہے۔
میں جناب حسین حان صاحب اڈیٹر پیام تعلیم - بشیر احمد صاحب
بی اے جامعہ - برکت علی صاحب بی اے جامعہ کا نہایت شکر گزار ہوں
جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و اشاعت کے سلسلہ میں اپنے مفید
مشوروں سے میری رہنمائی کی۔

علامہ الدین خالد صاحب منیر مکتبہ جامعہ، حکیم حافظ محمد اسماعیل صاحب
اور حکیم حافظ عبد الجلیل صاحب کا بھی ولی شکر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے
اس کتاب کی اشاعت میں میری ہر طرح مدد کی۔

یاست

۱۔ الہلال کے مقاصد اور پوٹیکل تعلیم

۲۔ صبح امید

۳۔ انقسط اساتذہ

۴۔ الجہاد فی سبیل التحریت

الہلال ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

” ۲۲-۲۹ ستمبر ۱۹۱۲ء

الہلال ۹، ۱۶، ۲۳ اکتوبر

” ۶ نومبر ۱۹۱۲ء

” ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء

الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم

اس ہفتہ ہمارا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھینگے، لیکن ایک بزرگ دست کی تحریر نے اور زیادہ ضرورت پیدا کر دی۔ وہ لکھتے ہیں :-

”..... ان سات نمبروں کو بغیر ایک حرف چھوڑے ہوئے پڑھ لینے کے بعد بھی صاف صاف معلوم نہیں ہوتا کہ آپ قوم کو کس قسم کی پولیٹیکل تعلیم دینا چاہتے ہیں؛ ایک بہت بڑا بنیادی اصول جو آپ کا معلوم ہوتا ہو اور اسی نے آپ کی بے انتہا عزت میرے دل میں پیدا کر دی ہو، یہ کہ آپ مسلمانوں کے تمام امراض کا علاج مذہب اور قرآن کو سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ان میں اسلام کی اصلی مذکر رسمی روح پیدا کی جائے۔ اس اصول کو اور بھی بہت سے لوگ جانتے اور کہتے ہیں مگر سچ یہ کہ آپ سے بڑھ کر اس کو کوئی عمل میں نہیں لا سکتا۔ ابھی صرف چند تحریروں ہی آپ کی نکل چکی ہیں، لیکن انہی سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ کی نظر قرآن مجید اور اس کے حقائق و معارف پر ایسی وسیع اور گہری ہو؟

لیکن معاف کیجیے گا آپ اپنے مذہبی رنگ میں پالینکس کو بھی غلط ملط کر دیتے ہیں اور اس طرح ملا دیتے ہیں کہ پہچان مشکل ہو جاتی ہو میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح الہلال

کے صد ہا ناظرین کو بھی یہی غلجیان پریشان کرتا ہو گا۔ پس آپ کو چاہیے کہ سب سے پہلے آپ اپنی پالیسی کی تشریح کر دیں اور کم از کم پولیٹکل تعلیم کو مذہبی تعلیم سے الگ کر کے صاف صاف بتلا دیں کہ آپ قوم کو کس راہ پر لے جانا چاہتے ہیں؟ ایک راستہ تو وہ ہے جس پر آج تک چلتے رہے، دوسرا راستہ اعتدالی مسند ہندوؤں کا ہے جو لبرل

شہنشاہی کو قائم رکھ کے اپنے حقوق طلب کرتے ہیں تیسری جماعت ان ہندی انارکسٹوں کی ہے جو ہم کے گولے اور ریوالور چلا کر بھارت ماتا کو اجنبیوں سے خالی کرنا چاہتے ہیں۔ براہ کرم آپ بتلا دیں کہ آپ کس جماعت میں ہیں، اور کس کے ساتھ ہم کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟ اس وقت ہم یا تو آپ کا ساتھ دینگے اور یا مذہبی تعلیم میں شریک رہینگے اور اور صیغوں سے الگ ہو جائینگے.....

میرا مقصد یہ ہے کہ آپ نے ہمیں معلوم کس قدر دقیق اٹھا کر ایسا بڑا کام شروع کیا ہے..... آپ کی صداقت اور خلوص نیت میں بھی شک نہیں اور علم و فضل علی الخصوص مذہبی مصنوعات کا درجہ تو میری تعریف سے بھی بلند ہے۔ یہ چیزیں ہمیشہ ہماری قسمت قوم کو میسر نہیں آتیں، ایسا نہ ہو کہ خدا نخواستہ یہ تمام قوتیں ضائع جائیں اور قوم آپ کی قابلیتوں سے محروم ہو جائے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے الہلال کے مقاصد پر ایک جامع سلسلہ مضمون شروع کریں گے اور ایک مرتب صورت میں بتلا دیں گے کہ ہمارے سفر کے حدود و مقاصد کیا ہیں؛ لیکن بعض مسائل درمیان میں ایسے آگئے جن پر

بے اختیار قلم کو حرکت ہوئی اور تمہید سے پہلے اصل کتاب شروع کر دینی پڑی۔
لیکن ہم اپنے کرم دوست کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس ضروری سوال
کو چھیڑ دیا۔

انہوں نے جن الفاظ میں میرے مذہبی افکار و تحریرات کی تعریف کی
ہر یہ ان کا بزرگانہ حسن ظن ہے لیکن بلا شائبہ انکسار عرض کرتا ہوں کہ اس کی
اہمیت کسی طرح اپنے اندر نہیں پاتا، ممکن ہے کہ مذہبی باتیں تھوڑی بہت مجھے
معلوم ہوں لیکن قرآن کریم کے معارف تو اتنے ارزاں نہیں جس کو میں اپنی
حرف شناسی دے کر خرید سکوں۔ میں تو ان کے خطا میں اپنی نسبت ایسے الفاظ
دیکھ کر بے اختیار کانپ اٹھا۔ اگر اس کے حقائق و اسرار کے فہم کے لیے عربی
دانی کی ضرورت ہوتی تو میں عربی کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں، اگر مذہبی معلومات کی
ضرورت ہوتی تو ان کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا، اگر کتب تفاسیر کے
مطالعے کی ضرورت ہوتی تو کتابوں کی میرے پاس کمی نہ تھی، لیکن اس کے
ایسے یہ تمام باتیں بے کار ہیں، پہلی شرط اتفاقاً اور ترکیباً قلب پر اور ساری محرومی
اسی میں ہے کہ اس سے محروم ہوں۔ جو دل زاد تقویٰ سے محروم اور بوائے نفسانی
و آلائش دنیا پرستی میں گرفتار ہو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی قرآن کے حقائق و
معارف کا تجلّی گاہ نہیں بن سکتا۔ علم و فضل اس کے لیے بالکل بیکار ہے اور ذہن
دماغ کو یہاں کوئی نہیں پوچھتا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ

از منطق و حکمت نکشاید در محبوب

اینہا ہمہ آرایش انسانہ عشق است

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے گھونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالینکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اہلی عظمت میں نہیں دیکھا، عَمَّا قَدْ نَزَّلَ اللَّهُ حَقَّ قَدَرِهِ دُورَنہ پولیٹیکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنے ڈرتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدار کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اُس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل نہیں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیا کی حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز، اور اُس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقہ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نور و کتاب مبین،

یقین فرمائیے کہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں بالکل سچ ہے۔ قرآن کے اسرار و معارف میں ایک غیر متقی انسان کے لیے کوئی حصہ نہیں گودہ علم و فضل کے تمام مدارج طے کرے۔ انصاف فرمائیے کہ جب حالت یہ ہو تو پھر میری اس مقام میں کیا ہستی ہے؟

ان کے خط میں کئی باتیں قابل غور ہیں :-

۱۔ پولیٹکل مباحث مذہبی تعلیم سے الگ ہونے چاہئیں۔

۲۔ ہندوستان میں اس وقت جو پولیٹکل گروہ ہیں ان میں سے الہلال

کس کا ساتھ دیتا ہے؟

امراؤں کی نسبت گزارش ہے کہ یہ توجہ اب نے اس بنیادی اصول

کو بھیر دیا جس پر ہم الہلال کی پوری عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کہیں کہ محراب خوشنما نہیں تو ممکن ہے کہ ہم بدل دیں، لیکن اگر آپ کی خواہش ہو کہ بنیاد کا پتھر بدل دیا جائے تو معاف فرمائیے اس کی تعمیل سے ہم مجبور ہیں۔ انسانی اعمال کی خواہ کوئی شاخ ہو ہم تو اسے مذہب ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں، اگر دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے تو یقین کیجیے کہ ہمارے پاس تو "سراج منیر" کی بجلی ہوئی ایک ہی روشنی ہے اسے ہٹا دیجیے گا تو بالکل اندھے ہو جائیں گے

کِتَابُ أَنْزَلْنَاهُ الْكِتَابَ الْحَقِيقَ

قرآن ایک کتاب ہے جو تم پر نازل کی گئی اس لیے کہ

النَّاسَ مِنَ الظَّالِمِينَ إِلَى التَّوْبَةِ

انسان کو تارکی سے نکلے اور روشنی میں لائے

آپ فرماتے ہیں کہ پولیٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجیے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں، وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے گھونکر الگ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالینکس بھی اس میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ آپ حضرات نے اسلام کو کبھی بھی اس کی اہلی عظمت میں نہیں دیکھا، عَمَّا قَدْ تَرَاهُ اللَّهُ حَقَّ قَدْرِهِ اور نہ پولیٹیکل پالیسی کے لیے نہ تو گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنے پڑتا اور نہ ہندوؤں کے اقتدار کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو آپ نے سب کچھ سکھلایا تھا۔ اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقضہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو، وہ اپنی توحید تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اُس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل نہیں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیاوی حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ وہ خدا کی آواز اور اُس کی تعلیم گاہ خدا کا حلقہ درس ہے جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دستگیری کا محتاج نہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ہر جگہ اپنے تئیں امام مبین، حق الیقین، نور و کتاب مبین،

تَبَيَّنَا لِكُلِّ شَيْءٍ، بَصَائِرُ لِلنَّاسِ، هَادِيٌ إِلَى السَّبِيلِ،
جامع اضرابِ امثال، بلاغِ لُتَّاس، حاوی بحرِ دُر، اور اسی طرح کے
ناموں سے یاد کیا ہے۔ اکثر موقعوں پر کہا کہ وہ ایک روشنی ہے، اور روشنی جب
نکلتی ہے تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہیوں کی ہو، خواہ
سیاسی۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَ
كِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ
السَّلَامِ، وَفِيهِ نُورٌ مِّنَ الظُّلُمِ
إِلَى النُّورِ وَيَهْدِي اللَّهُ إِلَى
صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (۵: ۱۵)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے
روشنی اور ہر بات کو بیان کرنے والی کتاب
آئی ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کے راستوں
پر ہدایت کرتا ہے، اُس کو جو اس کی رضا چاہتا
ہے اور اس کو ہر طرح کی گمراہی کی تاریکی سے
نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا، اور صراطِ
مستقیم پر چلاتا ہے۔

دنیا میں کوئی کتاب ہے جس نے خود اپنی زبان سے اپنی نسبت ایسے
عظیم انشاں دعوے کیے ہوں؛ اس آیت میں صاف بتلادیا ہے کہ قرآن مجید
روشنی ہے، اور روشنی ہے تو تمام انسانی اعمال کی تاریکیاں صرف اسی سے دور
ہو سکتی ہیں۔ پھر کہا کہ وہ ہر بات کو کھلے کھلے طور پر بیان کر دینے والی ہے اور
انسانی اعمال کی کوئی شاخ ایسی نہیں جس کے لیے اس کے اندر کوئی فیصلہ
نہ ہو۔ اس ٹکڑے کی تائید دوسری جگہ کر دی کہ :-

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ

بے شک ہم نے اُن کو کتاب دی جس کو ہم

عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً ۖ
لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ علم کے ساتھ مفصل کر دیا ہر وہ ہدایت بخش
اور رحمت ہر ارباب ایمان کے لیے۔

اس کے بعد پہلی آیت میں قرآن کو سب سلام کے لیے ہادی بتایا
کہ وہ تمام سلامتی کی راہوں کی طرف راہنمائی کرتا ہر او اگر آپ کے سامنے
پہلے عمل کی بھی کوئی راہ ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی سلامتی آپ کو قرآن
سے نہ ملے۔ پھر کہا کہ وہ انسان کو تمام گمراہیوں کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی
روشنی میں لاتی ہر اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری پولیٹیکل گمراہیاں صرف اس لیے
ہیں کہ ہم نے قرآن کے دست راہنما کو اپنا ہاتھ پیر نہیں کیا، ورنہ تاریکی کی جگہ آج
ہمارے چاروں طرف روشنی ہوتی۔ آخر میں کہہ دیا کہ وہ ”صراط المستقیم“ پر
لے جانے والی ہر اور ”صراط المستقیم“ کی اصطلاح قرآن کی زبان میں ایسی جامع
و مانع ہو کہ ساری دنیا اسی کے اندر سمجھئے۔

افسوس ہو کہ طول بیانی کا موقع نہیں ورنہ اس بحث نے سیکڑوں
آیتیں رماغ کے سامنے کر دی ہیں، ایک جگہ فرمایا :-

أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا ۖ
لِّكُلِّ شَيْءٍ ۖ وَهُدًى وَرَحْمَةً ۖ
لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝

بخش اور رحمت ہر صاحبان ایمان کے لیے۔

سورہ یوسف کے آخری رکوع میں فرمایا :-

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ ۚ
لَكِن تَصَدِّيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ ۚ

قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ جو
مصدقہ اس سے پہلے کی موجود ہیں ان

وَتَقْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَهُدًى
وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُونَ ۝

کی تصدیق کرتا ہو اور اس میں ارباب ایمان کے
لیے ہر چیز کا تفصیل بیان اور ہدایت اور رحمت ہو۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوا :-

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا
الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لِّعَلَّاهُمْ
یَتَذَكَّرُوْنَ

ہم نے انسان کے سمجھانے کے لیے اس قرآن
میں سب طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں تاکہ لوگ
نصیحت حاصل کریں۔

ان آیات میں قرآن کا دعویٰ بالکل صاف ہو وہ ہر طرح کی تعلیمات کے
لیے اپنے تئیں ایک کامل معلم ظاہر کرتا ہو۔ پھر اس کی تعلیم صاف اور غیر پیچیدہ
ہو بشرطیکہ اس پر تدبر اور تفکر کیا جائے :-

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی
عَبْدِهٖ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ
عِوَجًا ۝ (۱۸:۱)

تمام تعریفیں اُس خدا کے لیے ہیں جس نے
اپنے بندہ پر قرآن اتارا اور اُس میں کسی طرح
کی پیچیدگی نہ رکھی۔

پس یہ کیونکر ممکن ہو کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے ایک ضروری شعبہ
یعنی سیاسی اعمال کے لیے دوسروں کے دروازوں کے سائل بنیں، حالانکہ
خود قرآن اُن کے پاس ایک حکم اور ایک امام مبین ہو۔

وَكُلُّ شَیْءٍ اَحْصَيْنَاهُ فِیْ اَقَامٍ
مِّبْرٰیْنِ (۱۲:۳۶)

اور ہر شے کو ہم نے اس کتاب واضح (قرآن)
میں جمع کر دیا ہو۔

دوسری جگہ اس کو تمام امور کے لیے قول فیصل بیان کیا :-

اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا
بِیْشٰکَ یَہِ قرآنِ اِیْکَ قولِ فیصلِ ہو، تمام اختلافات

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَجَعَلْنَا
 بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
 بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُورًا ۚ
 وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ
 يَفْقَهُوهُ وَفِيْ اُذُنِهِمْ وَقْرًا
 وَاِذَا ذُكِّرْتُمْ كَرِهَتْ رُبَّاكَ فِي الْقُرْآنِ
 وَحَدَّثَكُمْ وَلَوْ اَعْلَى اَنْ بَارَهُمْ تَقْوَرًا
 اے پیغمبر جس وقت تم قرآن پڑھتے
 ہو، ہم تم میں اور ان لوگوں میں
 جنہیں آخرت کا یقین نہیں
 ایک چھپا دینے والا پردہ ڈال دیتے
 ہیں، نیز ان کے دلوں پر غلاف ڈال
 دیتے ہیں تاکہ قرآن نہ سمجھ سکیں اور ان
 کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں
 تاکہ سن نہ سکیں۔ (۱۷۲: ۱۷۴)

پس اگر آپ کو یہ خلجان پریشان کیے ہوئے ہوں تو افسوس ہو کہ ہم اُسے
 دور نہیں کر سکتے۔ اگر ہم کو اپنے مقاصد با تفصیل بیان کرنے کی مہلت نہیں
 ملی تو مضائقہ نہیں وہ نہایت مختصر لفظوں میں بھی آج سنائے جاسکتے ہیں۔
 ہم بالاختصار عرض کر دیتے ہیں کہ الہدال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں
 کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور
 سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہو اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں
 خواہ تمدنی، سیاسی ہوں خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا
 چاہتا ہو۔ اس کی مدد صرف یہی ہو کہ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكَمْ
 (۵: ۴۷) اُس کتاب اللہ کی طرف آؤ جو ہم اور تم دونوں میں مشترک ہو اور جس
 سے کسی کو اعتقاد انکار نہیں مگر علامہ یہ حال ہو کر کہ:-

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا اٰمَنَّا بِالَّذِيْنَ اٰوٰهِيْهِمْ اُنْهَوْنَ نِيْلًا عَنْ سَبِيْلِ سَيِّئَةٍ اَوْ يَنْهَوْا عَنْ سَبِيْلِ سَيِّئَةٍ

وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ (۲۵: ۵) لائے ہیں لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں
 خدا تم کو اپنے کلام کے آگے سر بلند کرتا ہے، تم کیوں اس سے گردن
 موڑ کر انسانوں کے آگے ذلت کا سر جھکاتے ہو؟ اس کے سوا الہلال کی تعلیم
 کا اور کوئی مقصد نہیں۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا قَمْنِ دَعَا
 إِلَى اللَّهِ وَعِلِّ صَالِحًا وَقَالَ
 ائْتِنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۳۱: ۳۲) اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی تھی
 جو خدا کی طرف دعوت دے اور عمل چھے

آپ کا دوسرا سوال یہ ہے کہ منہ دستان میں پولیکل خیالات کے تین راستے
 موجود ہیں۔ الہلال کس راہ پر قوم کو چلانا چاہتا ہے؟ پھر آپ نے ان کو گناہ بھی
 دیا ہے، لیکن انہوں نے کہ آپ ایک چوتھی راہ کو بالکل بھول گئے۔ یہ تین راستے
 توح آپ کے سامنے نمودار ہوتے ہیں مگر وہ چوتھی راہ تو وہ قدیمی راہ ہے جس پر چل کر
 ہزاروں ہستیاں منزل مقصود تک پہنچ چکی ہیں۔ آسمان و زمین کے فاطر نے جس
 وقت انسانوں کو آنکھیں دیکھنے کے لیے عطا فرمائیں اسی وقت اس کے سامنے
 یہ راہ بھی کھول دی تھی۔ آدم نے اس پر قدم رکھا اور نوح نے پتھروں کی بارش میں
 اس کا وعظ کیا، ابراہیم نے اسی کی نشانی کے لیے قریبا نگاہ بنائی اور اسمعیل نے
 اس کے لیے انیٹیں جنیں، یوسف سے مصر کے قید خانہ میں جب ایک ساتھی
 نے پوچھا تو اسی راہ کی اُس نے راہنمائی کی، اور موسیٰ جب وادی الیمین میں دشمنی
 کے لیے بیقرار ہوا تو اسی راہ کی تحتی ایک سبز درخت کے اندر نظر آئی، گلیل کا اسرائیلی
 دھڑ جب یروشلم کے قریب ایک پہاڑ پر چڑھا تو اس کی نظر اسی راہ پر پڑی اور پھر جب

خداوند سیر سے چمکا اور فاران کی چوٹیوں پر نمودار ہوا تو وہی راہ تھی جس کی طرف اُس نے دنیا کو دعوت دی۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا
وَضَعَى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا
بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى
أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا
فِيهِ

اللہ نے تمہارے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا
جو جس پر چلنے کا اُس نے نوح کو حکم دیا،
اور اُسے پیغمبر ہی تمہاری طرف اتارا گیا
اور اسی کا ہم لے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ
کو حکم دیا کہ اس دین کے راستہ کو قائم رکھنا
اور اُس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہی وہ راہ ہے جس کی نسبت (یوسف صدیق) نے قید خانہ مصر میں یہ کہہ کر اپنا وعظ ختم کیا تھا کہ :-

ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنْ أَكْثَرُ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۲۰: ۱۲)

یہی سیدھا راستہ ہے مگر بہت ہیں جو
نہیں جانتے۔

اور جس کی نسبت داعی اسلام کو حکم ہوا تھا کہ کہہ دے !

هٰذَا سَبِيلِي أَدْعُوا إِلَى
اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ
اتَّبَعَنِي (۱۰۸: ۱۲)

میرا راستہ یہ ہے، تم سب کو اللہ کی طرف
بلاؤ، تمہارے میں اور جو لوگ میرے پیرو ہیں
سب عقل و بصیرت کے ساتھ اسی حق کے راستے
پر ہیں۔

الحمد للہ کہ ہم ”مَنِ اتَّبَعَنِي“ کے ذمے میں داخل ہیں اور اسی لیے جناب
کی قراردادیں ہوئی ان تینوں انسانی راہوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے، بلکہ

اس چوتھی راوا الہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ قرآن کی بتلائی ہوئی راہ صراط المستقیم ہے۔ اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل و اعتقاد کے لیے بھی اس کتاب کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا راہنما بنالے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لیے مشرک ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰی لِهٰذَا نَفْسًا وَ مَا کُنَّا لِنَهْتَدِیْ لَوْلَا اَنْ هَدٰی اللّٰهُ

مسلمانوں کے سامنے خود انکی پولیٹیکل راہ موجود ہے

آپ پوچھتے ہیں کہ آج کل ہندوؤں کے ڈوپلٹیکل گروہ موجود ہیں آپ اُن میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ گذارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ صرف خدا کے ساتھ ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اُس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کوئی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو ساری دنیا اُن کے آگے کھڑی ہو جائیگی۔ اُن کا خود اپنا راستہ موجود ہے، راہ کی تلاش میں کیوں اوروں کے دروازوں پر بھٹکتے پھریں؟ خدا ان کو مرید کرنا ہی تو وہ کیوں اپنے سروں کو جھکاتے ہیں؟ وہ خدا کی جماعت ہیں اور خدا کی غیرت و العزّۃ من شان حضرت ابوبکرؓ اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کی چو کھٹ پر جھکنے والوں کے سر غیروں کے تسکے بھی جھکیں :- اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ

اَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيُغْفِرَ مَا دُونِ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ
مگر وہ راہ کس طرف لیجانا چاہتی ہو

پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالیٹکس میں بھی دعوت ہو کہ
نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقہٴ درس میں خربک ہو جیے
صرف اُس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراطِ المستقیم ہو۔

۱۔ اسلام کا اساس اولیں اصول توحید ہے، وہ سکھاتا ہے کہ صرف خدا کو
مانو اور صرف خدا کے آگے جھکو، اُسی سے ہر مانگنی چاہیے اور اسی کی اعانت
پر اعتماد کرنا چاہیے لَیْسَ لَكَ نَعْبُدُ اِلَّاكَ نَسْتَعِیْنُ (جس طرح خدا کی ذات کو ایک
ماننا توحید میں داخل ہے اسی طرح اس کی صفات میں کسی دوسری ہستی کو شریک
نہ کرنا جز توحید ہے۔ پس خدا کے سوا کوئی نہیں جس کا حکم انتہائی حکم ہو، کوئی نہیں
جو عاجزی و تذلل کا مستحق ہو، کوئی نہیں جس کی جبروت و عظمت کے آگے چون
دھڑکی گنجائش نہ ہو، اور کوئی نہیں جو ڈرنے اور خوف کرنے کے لائق ہستی ہو
۲۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خیر الائم بنایا اور دنیا میں اپنی نیابت اور
خلافت بخشی، پس اپنے درجہ کو ہر مسلمان محسوس کرے اور افسردگی، بے ہستی،
خوف و مرعوبیت کی جگہ اپنے اندر بندی، خودداری، طاقت اور استحکام
پیدا کرے۔

۳۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک عادلانہ قوت قرار دیا اور فرمایا کہ
”جَعَلْنَاكَ اُمَّةً وَسَطًا“ ان کا ہر کام عدل و اعتدال پر مبنی ہوگا، پس
مسلمانوں کو ہر موقع پر میانہ روی اور اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۴۔ مسلمان دنیا میں صلح و امن کا پیام ہیں، انہوں نے تلوار بھی اٹھائی ہو تو صلح کی حمایت میں، پس فتنہ و فساد اگر اوروں کے لیے معیوب و مجرم ہو تو ان کے لیے تو معصیت اور فسق ہو۔ دنیا میں جن قوموں نے فتنہ و فساد اختیار کیا وہ قرآن الہی سے مغضوب و مردود ہو گئے۔

۵۔ قرآن ان کو سکھاتا ہو کہ :-

لَعَنَّا وَلَوْ اَعْلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَ اَیْکَ دُوسرے کی مدد کرو نیکی اور پرہیزگاری
لَا تَعْدُوْا کُوْدًا عَلٰی الْاَوْتَمٰہِ وَالْعَدُوْا اِنِ کَے کاموں کے لیے، گناہ اور فساد کے لیے نہیں۔
وہ دنیا میں خدا کے پاس اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ نیکی کی حفاظت کریں اور فساد کو رد کریں، پس ہر اچھی بات کرنے والوں کے وہ مددگار ہوں خواہ وہ گورکھٹ ہو یا کوئی اور قوم۔

۶۔ قرآن انتظام عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہو کہ شخصی استیلا و اقتدار کی مخالفت کرے، اس کی تعلیم یہ ہو کہ خدا کے سوا کوئی نہیں جو انسانوں کو محض اپنی رائے اور خواہش کے بناءے ہوئے احکام کی تعمیل پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہو۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ
اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَ وَ التَّوْفِیْقَ
یَحَقُّ کَسی بشر کو نہیں پہنچا کہ اللہ تعالیٰ
اُسے کتاب اور عقل اور حکم اور نبوت
عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ
اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو۔
عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ

جس چیز کا اختیار انبیاء کرام کو نہیں اس کا حق کسی دنیوی طاقت و حکومت کو بھی نہیں مل سکتا۔ البتہ وہ ملت اور جماعت کے اندر اپنی عقل کو مخفی بتلاتا ہو اور کہتا ہو **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَى الْجَمَاعَةِ** "اشد کا ہاتھ جماعت پر ہو" پس اس کے نزدیک وہی حکومت جائز ہو سکتی ہو جو شخصی نہ ہو بلکہ کسی ملت اور قوم کے ہاتھ میں ہو، اسی بناء پر اس نے مشورے کا حکم دیا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ اور "من کو حکم دیا کہ آپس میں مشورہ کر کے تمام کام انجام دیتے ہو" **وَشَاوَرَهُمْ** دیں اے پیغمبر تمام امور و معاملات کو مشورے کے **فِي الْأُمْرِ** ساتھ انجام دیا کرو۔

پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت مہنیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں۔

یہ اصول ہیں جن سے ہم اپنی پولیٹیکل پالیسی تیار کر سکتے ہیں اور جس کے لیے ہمیں نہ تو ماڈریٹ ہندوؤں کی کاسرہ لسی کی ضرورت ہو نہ اکثریتی کی۔ اگر ہم ایسا کریں تو ایک اعتدال پسند گروے خوف جماعت ہونگے اور ہم سے کسی فرقہ کو ضرر اور نقصان کا خوف نہ ہوگا۔ ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی اور آزادی کے لیے سعی کریں گے لیکن ہماری سعی فتنہ، فساد اور شورش و بغاوت سے بالکل پاک ہوگی۔ قرآن نے ہم کو سکھایا ہے **(لَا تَفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا)** اس کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ برٹش گورنمنٹ نے یقیناً ہم کو امن دیا ہو اور اس امن میں ہم آزادی کے ساتھ

اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں بس اب باغیانہ شیروفساد اور خویانہ قانون شکنی اصلاح کے بعد زمین کو آلودہ فساد کرنا ہوگا، اور یہ یقیناً خدا کا جرم اور عصیان ہے قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ تَعَاوُذًا عَلَى الْكِبَرِ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَلْكَؤُا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ پس جو لوگ ملک میں فساد پھیلاتے ہوں خواہ وہ ہندو نازکست ہوں یا جرائم پیشہ جماعتیں ہمارا فرض ہونا چاہیے کہ ان سے دوری ڈھونڈیں اور بن پڑے تو ان کے دفعے کے لیے کوشش کریں۔

گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے نفس کے لیے مفید ہونگے، اتنا ہی گورنمنٹ کے لیے، نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لیے۔ اس کو بھولنا نہ چاہیے کہ اگر ہم سچے مسلمان ہوں تو ہمارے ہاتھ میں قرآن ہوگا اور جو ہاتھ قرآن سے رُکا ہوا ہو وہ ہم کا گولہ یار یا رولور نہیں کھڑکتا۔ البتہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے دونوں کی تعلیم دی ہے۔ ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی، اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں۔ ہم خدا کی مرضی اسی میں یقین کرتے ہیں کہ قوموں اور ملکوں کو اپنے اوپر آپ حکومت کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے اور یورپ خود اسی اصول پر کاربند ہو کر آزاد ہو چکا ہے۔ ہم انگلستان سے آج اسی چیز کے طالب ہیں جس شر کے لیے وہ خود کل تک بے قرار تھا۔ بے شک اگر اسلام کی بتلائی ہوئی پالیٹکس کی راہ ہمارے سامنے ہوگی تو ہم ایک طاقتور گروہ ہونگے، بے خوف ہونگے، اظہار حق میں میاں ہونگے، کیونکہ ہم خدا کے یہاں کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن اسلام ہی کے بتلائے ہوئے اصولوں کی وجہ سے قانون اور حکومت بھی ہماری طرف

سے بے خطر ہوگی۔ چونکہ ہماری راہ صاف اور غیر مشتبہ ہوگی اس لیے ہماری نیت اور ہماری زبان بھی ایکجگہ ہوگی۔ ہم جو سن میں بھی آئیں گے لیکن بہارِ جوش اور لہجہٴ میمن قانون اور امن کے درود کے اندر چوکا کیونکہ خدا نے کہا کہ فساد مٹ کر دے۔ اب تک مسلمانوں کے جو پیشوا قوم کو چپ اور غافل رکھنے کی سعی کرتے رہے وہ اندر ہی اندر چھوڑے کو پکانا اور راگھو کے اندر چنگاریوں کو دبانے پابستے تھے، لیکن اگر ہم اس راہ پر آئے تو ہمارے زخم دل پر نہیں بلکہ کھلے ہوئے چہروں پر ہونگے، ہماری خواہشوں اور رشکایتوں کے پھوڑے اندر یک کر امن کے جسم کو نقصان نہیں پہنچائیں گے، بلکہ پھوٹ کر بہہ جائیں گے۔ ہم شور و ضرور چائیں گے مگر پھر دل میں کچھ باقی نہ رہیگا، فریاد ضرور کرینگے مگر نہ رشکایتوں کی ٹھک کو نہیں پائیں گے پس گورنمنٹ کی بھی مصلحت یہی ہے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لیے چھوڑ دے، کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لیے، نیز تمام عالم کے لیے کہاں طور پر مفید ہستی ہو سکتے ہیں۔

یہ اہلِ اہل کی پالیسی ہے اور یہی دعوتِ نبویؐ کی طرف ہم مسلمانوں کو بلانا چاہتے ہیں۔ کیسی انسانی دماغ کی اختراع نہیں اور نہ کسی انسانی گروہ کا اتباع، تقلید ہے بلکہ اُس رب العالمین نے جس نے کتاب و حکمت اور عدل و میزان کے ساتھ اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجا ہے، وہ راہ ہمارے سامنے کھول دی ہے۔ وہ اگر توفیق بخشے تو اُس کی دی ہوئی زندگی کو اسی دعوتِ حق میں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ نہ کسی سے جنگ ہے نہ کسی سے مناقشہ، نہ صلہ کی توقع نہ داد کی امید، اس راہ کے داعی کریم کو جو حکم دیا گیا تھا وہ ہمارے سامنے موجود ہے:-

قَادِرٌ وَاسْتَقِيمَ كَمَا أُمِرْتُ
 وَلَا تَتَّبِعِ أَهْوَاءَ هُمْ وَفُلٍ
 اٰمَنْتُ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ
 مِنْ كِتٰبٍ وَّ اُمِرْتُ لِاعْمَلُ
 بِبَيِّنٰتٍ مِّنْ اللّٰهِ رَبِّنَا وَرَبِّكُمْ
 لَنَا اَعْمَالُنَا وَنَكُوْنُ اَعْمَالُكُمْ
 لَا حِجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ
 يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ
 دے پیغمبر تو ان کو دعوت دے اور جو حکم
 دیا گیا ہو اس پر قائم ہو جا، انکی خواہشوں
 پر نہ چل اور ان کو کہہ دے کہ تم امتری
 ہوئی کتابوں پر میرا ایمان ہو اور مجھ کو
 حکم ملا ہے کہ عدل کروں۔ وہی اللہ ہمارا
 اور تمہارا دونوں کا پروردگار ہے، ہمارا عمل
 ہمارے لیے اور تمہارا عمل تمہارے لیے۔
 جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اللہ نے
 ہم سب کو ایک جا جمع کر دیا اور سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔

مسلم ایک مسلمانوں کی پولیسکل راہنمائی کرنا چاہتی ہے تو اس کو یہی
 راہ اختیار کرنی چاہیے۔ واللہ یُکَدِّیْ مِنْ یَّشَاءُ اِلٰی عِزٍّ طَمْسُفِیْم۔

صبحِ اُمید

برہمستی سزدگر متسم سازد مراساتی
ہنوز از بادہ پارینہ ام پسیا نہ بردارد

نزول رحمتِ الہی حیات بعد المات

قدرتِ الہی کی بخشائشوں کو کون شمار کر سکتا ہے:-

وَإِنْ تَعَدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصَوْهَا (۱۶۳:۳۳) کہیں نہ کر سکو گے۔
اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو

عالم کائنات کی کونسی شے جو اپنے اندر قدرتِ الہی کی کوئی نشانی نہ رکھتی ہو؟
وَكَآتِلٌ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَوَاتِ اور آسمان زمین میں اس کی قدرت و
وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ عَلَيْهَا وَهْوَ عِلْمٌ كَثِيرٌ فِي فَلَانِیاں ہیں جن پر سے
عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ فاضل انسان گذر جاتا ہے اور غور نہیں کرتا

لیکن عالمِ سہادی کے آثار و آیات میں ایک بہت بڑی نشانیِ باری کا نزول اور
زمین کی نہایت سیات و مات ہے:

اللَّهُ الَّذِي يُزِيلُ إِلَهُاتِهِ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادلوں
يُنْزِلُ مِنْهَا مَاءً فَيُخْرِجُ مِنْهَا نَبَاتًا کو ان کی جگہ سے ابھارتی ہیں، پھر خدا

کَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كَيْفًا جس طرح چاہتا ہو ان سے کام لیتا ہو،
 فَتَرَى الْوَدَّ قَدْ يَخْرُجُ مِنْ کبھی بادلوں کو آسمان پر پھیلا دیتا ہو کبھی
 خِلَالِهِ فَإِذَا أَصَابَ مِنْ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہو اور تم کو
 بَيْشَاءٍ مِنْ عِبَادِهِ، إِذَا هُمْ ایسا نظر آتا ہو کہ گویا ان کے بیچ سے مینہ
 يَسْتَبْشِرُونَ. نکلا چلا آتا ہو۔ پھر جب خدا اپنے بندوں

میں سے جن پر چاہتا ہو اسے برسا دیتا ہو تو وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

اس غاکہ ان حیات کی ساری زندگی پانی کے وجود سے ہو
 وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ اور ہم نے دنیا کی ہر چیز میں پانی سے زندگی
 شَيْءٍ حَيٍّ. اور زندگی کی شادابی رکھی۔

جب زمین آفتاب کے تشککہ حرارت سے قریب ہو جاتی ہو، اس کی
 شکلہ باریوں سے سطح زمین کا ذرہ ذرہ چمٹنے لگتا ہو، زندگی کی تمام علامتیں مفقود
 ہو جاتی ہیں، ہر شے پرمرونی، اور ہر چہرہ پر افسردگی چھا جاتی ہو، دریا اتر جاتے ہیں، اندیا
 خشک ہو جاتی ہیں، زمین کے اندر کا خزانہ رطوبت بھی خالی ہو جاتا ہو، اور سبزہ و گل
 کی تروتازگی اور کھیتوں کی شادابی دونوں خشک سالی کی تیغ سے ہلاک ہو جاتی
 ہیں، تو اُس وقت زمین اور زمین پر بسنے والی ہر نباتاتی اور حیوانی مَرحِ پانی کے لیے
 بیقرار ہوتی ہو، اور کوئی آنکھ نہیں ہوتی جو آسمان کی طرف اُمید سے نہ اُٹھتی ہو
 اور پھر ایوس ہو کر العطش! العطش! نہ پکا رتی ہو لیکن جب ایسی انتہا درجہ تک
 پہنچ جاتی ہو اور اُمید کا کوئی سہارا باقی نہیں رہتا تو پھر کیا یک عالم سادی میں
 ایک انقلاب عظیم نمودار ہوتا ہو اور بجلی کی چمک اور بادل کی گرج صدائے اُمید

بن کر دنیا میں پھیل جاتی ہے:-

فَأَنْظُرْ إِلَى آثَارِ رَحْمَةِ اللَّهِ
كَيْفَ يُغِي الْأَكْرَهْنَ بَعْدَ
مَوْتِهَا إِنَّ ذَلِكَ لَمُحْيٍ
الْمُؤْتَى وَهُوَ عَلَى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ (۵۰: ۳۰)

پس رحمت الہی کی ان نشانیوں کو دیکھو کہ
کیونکر وہ زمین کو موت کے بعد دوبارہ
حیات بخشتا ہے؟ بے شک وہ مردوں
کو جلائے والا ہے۔ اور ہر شے پر قادر ہے۔

اخلاقی و قلبی حیات و موات

انسانی قلوب کی حیات و موات اور قوموں کی اخلاقی زندگی اور موت کا بھی یہی حال ہے۔ مایوسیوں جب حد درجہ تک پہنچ جاتی ہیں، اور انسانی سعی و امید کی کوئی راہ اپنے سامنے نہیں دکھیتی تو وہ خدا جو انسان کی جسمانی زندگی کے لیے اپنے آسمان کو حکم دیتا ہے کہ بارانِ رحمت کا درد ازہ کھول دے، ضرور ہے کہ انسان کی قلبی زندگی کے لیے بھی اپنے ملائکہ رحمت کو بھیج دے تاکہ پیغامِ امید سے مژدہ دلوں میں زندگی کی حرکت پیدا کر دیں۔

صبحِ اُمید

گزشتہ چند سالوں سے تمام عالمِ اسلامی میں ایک اخلاقی بیداری کے جواثر نمایاں ہو رہے ہیں، وہ اُمید دلاتے ہیں کہ شاید ہماری مایوسیوں کی انتہا سے اُمید کا آغاز شروع ہو، لیکن آج ہم صرف مسلمانانِ ہند کے موجودہ حالات پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہم نے ابتدائے اشاعت سے راہِ ہلال میں مسلمانوں کی گزشتہ اور موجودہ

حالت پر مثنوی خوانی کی ہو اور ان کے اعمال زندگی کی ہر شاخ کو مایوسی کی نظر سے دیکھا ہو۔ لیکن حضرت یعقوب نے اپنے لڑکوں کو نصیحت کی تھی: لَا تَأْتِسُوا مِنْ تَرْفُوحِ اللَّهِ الشَّدَّ کی فرح رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اور اسلام پہلی چیز جو اپنے پیرو کو بخشتا ہے وہ اُمید ہی ہے۔

وَمَنْ يَغْضُ مِنْ دُحْمَةِ رَبِّهِ
إِلَّا الصَّالُّونَ
اور اللہ کی رحمت فرمائی سو کافروں کے
کے سوا اور کون نا اُمید ہو سکتا ہے؟

نا اُمید مشو، کر نا اُمیدی کفر است

دیکھتے ہیں، تو باوجود اس ہمارے سبب مایوسی، پھر بھی اُمید نے ہمیں بالکل چھوڑ نہیں دیا ہے، اور ہندوستان میں جو تغیرات و انقلابات پھٹنے دنوں کے اندر ظاہر ہوئے ہیں انہوں نے مسلمانوں کے موجودہ حالات میں اُمید کی ایک جھلک نمایاں کر دی ہے۔ گو ہمارے بے بسے میں دیر ہو مگر موسمِ آثار و علم سے ظالی نہیں۔
بیداری کی ایک کر دھ

انسان کی تمام اندرونی قوتیں اور جذبات خارجی محرکات کی محتاج ہوتی ہیں، اور ان کی مثال سوئے ہوئے انسان کی سی ہوتی ہے، جو گر زندہ ہو مگر حرکت کرنے کے لیے کسی بیدار کس صدمہ کا محتاج ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تمام نشو و ارتقاء کی قوتیں ابتداء سے وقفِ غفلت رہیں ان کو کوئی جگانے والا ہاتھ اور کوئی مہیثار کرنے والی خدا نصیب نہیں ہوئی۔ قوموں کی زندگی کی اصلی قوت عوام کا طبقہ ہے مگر اس طبقہ کی قوت چند نفوسِ خاص کے ہاتھ میں ہوتی ہے ان کی بیداری سے تمام ملت بیدار رہتی ہے اور انسان کی غفلت سے تمام ملت پر

غفلت چھا جاتی ہے، لیکن بدبختی سے مسلمانوں کے رہنماؤں کا یہ حال رہا ہے کہ:-
 اونھیں شستن گم است، کمر اہری کند

خدا کی بخشائش عام ہے۔ فطرت کی فیاضیوں میں نسل و قوم کی تمیز نہیں
 اور ان کے جسم کے اندر جو خون ہو وہی ہماری رگوں کے اندر بھی دوڑ رہا ہے۔ ہندوستان
 میں گزشتہ نصف صدی کے اندر بیسیوں تغیرات ہوئے۔ تعلیمی رفتار کو خواہ
 کتنا ہی سُست کہا جائے، مگر ترقی رفتار سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ سب سے
 بڑی چیز شب و روز کے ساتھ یوں کی حرکت تھی اور کوئی نظر ایسی نہ تھی جس کے
 سامنے سے قافلے نہ گزرتے ہوں اور شہسواروں کی اُٹائی ہوئی گودے غبار آلود
 نہ ہوتی ہو۔ ضرور تھا غافل دلوں میں اُنگ اور حرکت کی گدگد سی پیدا ہوتی
 اور ساتھیوں کو دوڑتے دیکھ کر بلا قصد بھی پاؤں حرکت کرنے لگتے، مگر بدبختی
 یہ تھی کہ لگام اتنا ہتھوں میں تھی جو لگام سے نگام کا نہیں بلکہ زنجیر کا کام لیتے
 تھے، اور بیداری کے قدرتی ولولوں اور انگوں کو ہمیشہ اپنی مصنوعی خواب مقالیسی
 کے عمل سے دبا دینا چاہتے تھے۔ دلوں میں جوش اُٹھتا تھا، اور آنکھیں راہ
 مقصود کو ڈھونڈھتی بھی تھیں لیکن جوش یا تو دبا دیا جاتا تھا، یا اُس کے لیے
 ایک غلط مصروف پیدا کر دیا جاتا تھا، جس میں خرچ ہو کر ضائع ہو جاتا تھا۔
 اور تلاشِ راہ کی خواہش کو یا تو بڑھانے سے روک دیا جاتا تھا یا پھر ایک پڑتیج
 و خم راہ ضلالت سامنے کر دی جاتی تھی، تاکہ جستجوئے منزل کا قدم اسی میں
 جکڑ کر رہ جائے۔

مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ :- اس کی کتنی صاف اور بین مثال ہمارے سامنے

ہر مسلمانوں کی افسردگی اور بے ہمتی کے افسانے نصف صدی سے ہماری
 انجمنوں کا دائمی مرثیہ ہیں، لیکن مسلم یونیورسٹی کی صدائے تحریک کے بلند ہوتے
 ہی تمام ملک میں ایک عام جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ملک کا کوئی حصہ اور
 قوم کا کوئی طبقہ نہیں جس کے اندر اس صدائے حرکت پیدا نہ کر دی ہو، علی
 الخصوص صوبجات متحدہ اور پنجاب میں تو جاں نثارانہ فداکاریوں کے دلوں نے نظر
 آنے لگے، اور بازار کے دوکاندار اور دیہاتوں کے کاشتکار تک پوری یکسوئی
 اور شغف کے ساتھ اس کے چندے میں شریک ہوئے۔ غور کیجیے کہ یہ کیا بات
 تھی؟ بار بار کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی عام تعلیمی خواہش اور جستجو کا یہ نتیجہ تھا، لیکن
 اس سے بڑھ کر اور کوئی غلط بیان نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں نے لاہور میں
 یونیورسٹی ڈپٹیشن کی گاڑیاں کھینچی ہیں، راہ میں جلوس کو روک کر شربت کے
 گلاس تقسیم کیے ہیں اور کوٹھڑوں اور برآمدوں پر سے پھولوں کے گلے سے پھینکے
 ہیں اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ قصبوں اور دیہاتوں میں جن لوگوں نے سیکڑوں
 روپیوں کی رقمیں چندے میں شامل کی ہیں، یہیں بتایا جائے کہ ان میں کتنے آدمی
 تھے جو یونیورسٹی کی ضرورت کو محسوس کرنا ایک طرف اس کی حقیقت سے بھی
 واقفیت رکھتے تھے؟

اصل یہ ہے کہ یہ تمام جوش و ہنگامہ اس امر کا ایک تین ثبوت تھا کہ لوگ
 سوتے سوتے اب تھک گئے ہیں۔ اور قلوب حرکت اور جہد و جہد کے قدرتی دلولوں
 کو اور زیادہ نہیں روک سکتے طبیعتوں میں جوش بمقامی پیدا کر دیا ہے۔ تو تین ہجرت
 کے لیے یحییٰ ہیں، اور جذبات مضطرب ہیں کہ باہر سے کوئی صدائیں، تو لبیک کہہ کر

اٹھ کھڑے ہوں۔ یونیورسٹی کی صدا غیر معمولی بلند آہنگی سے بلند ہوئی، توجہ دقت کا سیلاب اسی رخ پہنچے لگا۔ پاؤں چلنے کے لیے بے قرار تھے، جو راہ سامنے نظر آگئی، اُسی پر دوڑنے لگے۔ یہ کام کرنے والوں کا کام تھا کہ طاقتوں اور انگلیوں کے لیے ایک صحیح مصروف تجویز کرتے اور انجن کو پٹری کی لائن پر چلا تے۔ اس کی اسٹیم کو جنگل میں دوڑا کر ضائع نہ کر دیتے، لیکن وہ روزاول سے اس کوشش میں معین ہونے کی غلطی کر رہے ہیں کہ یا تو قدرتی ولولوں کو دبایا جاتا ہے اور یا پھر ایک غلط راہ پر لگا کر راہ مقصود سے غافل کر دیا جاتا ہے۔
قدرتی ولولوں کو روکنا ممکن نہیں۔

لیکن تاہم دل کے جوش اور ولولے کو باہر کی کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔ قدرتی نشوونما کو کتنا ہی روکیے، وہ ابھر ہی کر رہیگا۔ آپ نے بار بار اپنے دروازے کے آگے کسی بے موقعہ درخت کے پودے کو بڑھنے دیکھ کر کچل دیا ہوگا، مگر چند دنوں کے بعد پھر دیکھا ہوگا تو اُس کی جگہ خالی نہ ہوگی۔ یہ قدرت کے کاروبار ہیں اور ان میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ مسلمانوں کے دنوں کو برسوں تک زلزلے کی آواہوں سے غافل رکھا گیا، لیکن یہ ایک زبردستی کی پٹی تھی جو ان کی آنکھوں پر باندھی گئی۔ ممکن تھا کہ ابھی کچھ نورِ زمانہ غفلتوں اور گمراہیوں کو فرصت کا بل جاتا لیکن ہم نے جاگنے میں دیر کی تھی، تو قدرت نے جگانے میں اور زیادہ دیر نہ کی۔ یکے بعد دیگرے چند واقعات و تغیرات نے بھی ظہور کر کے تنبیہ اور غفلت شکنی میں مدد دی اور الحمد للہ کہ اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہیں تو یاری کی جگہ اُمید کے اثر کو غالب پاتے ہیں تو اب تک کوئی اصلی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔

نہ تو پچھلی راہ سے پورے قدم ہٹے ہیں اور نہ آئندہ کے لیے کوئی نئی راہ متعین ہوئی ہے۔ اب تک جو کچھ تغیرات ہوئے ہیں، صرف ذہن و دماغ تک محدود ہیں اور وہ بھی کوئی کامل تغیر نہیں، بلکہ صرف ایک جنبش ہے جو دماغوں کے جمود نے محسوس کی ہے۔ پھر جو کچھ کئی ہر کسی مقدّمہ میں منسلک نہیں اور اب تک اتنا دمبالہ آراء کی قوت سے محروم ہے۔ تاہم ہر حرکت کی ابتدا جنبش سے اور ہر عمل کا آغاز ذہن و خیال سے ہوتا ہے۔ برسوں کی فیند کے متوالے اگر ابھی گروٹ بھی لے رہے ہیں تو اُنکے کرپیٹھ جانے کے لیے جلدی نہ کرنی چاہیے۔ شب کی سرستیوں کا ابھی کچھ عرصہ تک تو خمار رہے ہی گا۔ شب نہیں کہ نئے موسم کے آنے تک کچھ زمانہ تاخیر کی ہے، قوانینوں کا بھی گزرے، لیکن ہر حال میں عقل و ہوشمندی خرم و احتیاط اور اعتدال و توسط کے ساتھ نظرِ حواقب امور پر رہنی چاہیے۔

وَعُوْا اِلَیَّ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْ بَیْنِ مَا فَنطُوْا اَوْ یَنْشُرْ رَحْمَتًا وَهُوَ الْوَلِیُّ
الْحَمِیْدُ (۲۷: ۱۳۲)

انسان کی سنالالت کا اصلی مبدا

ہر اصلاحی و ترقی دہ دعوت کے لیے پہلی منزل ”تقلید“ کی بندشوں کو توڑنا ہے، کیونکہ تقلید کے اہرمن سے بڑھ کر انسان کی تمام نیردانی حضائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں، ان سب کی تعمیر و مرمت صرف تقلید ہی کی زمین میں ہوتی ہے۔ اس لیے راہِ اصلاح کا اولین منظر یہ ہے کہ تقلید پرستی کے سداسل و اغلال سے انسانوں کو نجات حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا، اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے۔

اَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِۭ وَلِيْسَا نَا كِيَا هَمْ نَے اِنْسَان كُو دِكِهْنِے كَے لِیَے دُو آنْكِهِيں
وَشَفَتَيْنِ وَهَدَّيْنِۭ الْمُجْدَيْنِ هِنِس دِیَس؛ اُو ر بولنے كَے لِیَے ذَبَان اُو ر لِسِیں
ہِنِس عطا كِیَس! اُو ر پھر ہدایت و صلا ت (۸: ۹۰)

کی دونوں راہیں اس کے سامنے نہیں کھول دیں؟

اس لیے ہر انسان اپنی ہدایت و گمراہی کا ذمہ دار، اور اپنے فکر و دماغ سے کام لینے کے لیے خود مختار ہے۔ لیکن انسان کی تمام قوتیں نشو و نما کی محتاج ہیں اور نشو و نما ہو نہیں سکتی، جب تک قوتوں کو بغیر کسی سہاے کے خود در زش کرنے کے لیے چھوڑ نہ دیا جائے، انسان چلنے کی قوت اپنے ساتھ لے کر رہا ہے، مگر بچے کو جب تک دیکھڑا ہونے اور پاؤں پر زور دینے کے لیے چھوڑ نہ دیجیے گا کبھی اُس کے پاؤں نہیں کھینکے۔ تقلید سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے، وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آباؤ اجداد کے طریق و رسوم پر اپنے تئیں چھوڑ دیتا ہے، اور صرف اُنہی کا تعبد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت بھول جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اُس کی حالت بالکل ایک چارپائے کی سی ہو جاتی ہے اور انسانی ادراک و عقل کی تمام علامتیں منفقہ ہوئے لگتی ہیں۔ انسان کا اصل شرف نوعی اور مابہ الامتياز اس کے دماغ کا تدبیر و فکر اور اجتہاد و تحسس ہے۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا، قوانین الہیہ اور انوار میں فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اُٹھے، اشیائے کائنات کے خواص کا جو کچھ سراغ لگا، تمدن و مصنوعات میں جس درجہ ترقیاں ہوئیں، نئے نئے آلے اور نئے نئے وسائل راحت جس قدر ایجاد ہوئے غرض کہ انسان کے

اور قلعے ذہنی و فکری کے جس قدر کشتے دنیا میں نظر آ رہے ہیں، یہ تمام تر اسی
انسانی تفکر و تدبر کے نتائج ہیں، لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی
کی ایک چٹان ہے، جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و عقل کی تمام قوتوں کو کھل
ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشوونما کا دائمی اسد باب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس
دعوت کو لے کر آیا فی الحقیقت اس کا اصل مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد

فکری کی زنجیروں سے افسان کو نجات دلائے۔ مثبت پرستی اور انسان پرستی
کی تمام شاخیں بھی اسی تقلید آباد رسوم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی لیے قرآن نے
اپنی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْعُرْثَانِ أُمِّ عَلِيٍّ كَيْلَا لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِ الْفَاسِقِينَ
کرتے، با ان کے دلوں پر قل گئے ہیں۔

مقلدین محض کو پارسایوں اور حیوانوں سے تشبیہ دی، اور پھر اس کو بھی اہل
ضلالت کے لیے ناکافی قرار دے کر ان سے بھی بدتر فرمایا:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بَيِّنَاتٍ مِّنْ دُونِهَا
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بَيِّنَاتٍ مِّنْ دُونِهَا
وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بَيِّنَاتٍ مِّنْ دُونِهَا
لِيُذَكَّرَ الَّذِينَ يَخْلَعُونَ
اُن کے پاس دل و دماغ ہیں مگر نہیں سمجھتے، آنکھیں ہیں پر نہیں دیکھتے، کان ہیں مگر نہیں سنتے، خود اپنے ذہن سے کام نہ لیتے اور مقلد محض ہونے میں وہ مثل چار پاؤں کے ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔

پس خواہ مذہبی اصلاح ہو یا اخلاقی، تمدنی ہو یا سیاسی، ہر راہ میں پہلا پتھر
تقلید کا حائل ہو گا ہے، اور اگر یہ مٹ جائے تو پھر آگے کے لیے راہ صاف ہے۔ ہم کو

مسلمانوں کے موجودہ سیاسی تغیرات میں سب سے پہلی علامت اُمید جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس راہ میں لیڈروں کی تقلید اتباع کی جو بیڑیاں برسوں سے قوم کے پاؤں میں پڑی تھیں، الحمد للہ کُرآن کو توڑ کر پھینک دینے کے لیے ہر پاؤں بے قرار ہے، اور اب اور زیادہ اس بوجھ کو برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ اب تک فی الحقیقتہ پالیٹکس میں تو قوم کی کوئی پالیسی تھی اور نہ کوئی رائے، صرف چند اربابِ رِسم و اقتدار تھے جو اپنے محلوں میں بیٹھ کر تجویز بانی کر لیا کرتے تھے اور پھر تمام قوم کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کے ہاتھوں میں اپنی چھڑی پکڑا دیتے تھے، اور وہ کو لوہے کے پیل کی طرح ان کے بنائے ہوئے مرکزِ ضلالت کا طواف کرتی رہتی تھی۔ اصل قوت عام قوم کی ہے، اور سچی پالیسی وہی ہے جو خود قوم کے دماغوں میں پیدا ہوئی ہو۔ لیڈروں کا کام یہ ہونا ہے کہ اُس کی نگہداشت کریں اور اس کو ایک صحیح اور باقاعدہ تنظیم کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھیں۔ مسلمان لیڈروں نے نہ تو کبھی خود قوم کو سوچنے اور سمجھنے کا موقعہ دیا اور نہ خود قوم کو اپنے ذاتی اجتہاد فکری اور فونی فکر و تدبیر سے کام لینے کی ہمت ملی۔ ابتدا سے لیڈروں کی یہی تعلیم رہی کہ تقلید و اتباع پر قناعت کرو اور جو کچھ کہا جائے اُس پر چون چرامت کرو، کیونکہ ابھی تم میں تعلیم نہیں، اور کئی صدیوں تک چار پائیوں کی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہو گویا لغو بالہ پٹنیاں یا ان قوم کا صحیفہ تعلیم بھی کلامِ الہی تھا کہ:-

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
جب قرآن کریم پڑھا جائے تو پوری
توجہ اور انقطاع کے ساتھ سناؤ

تَوَحُّمُونَ۔ (۲۰:۷) اور چپ رہو تاکہ تم پر اللہ کی نظر رحم مبذول ہو۔
ہمارے سلف صالحین کی تو تعلیم تھی کہ اللہ پر توکل کرو اور مقام تفویض
حاصل کرو لیکن لیڈروں کی تعلیم یہ تھی کہ گورنمنٹ پر توکل و تفویض کی عادت
ڈالو کہ وہی کارساز حقیقی اور عجیب الدعوات و قاضی الحاجات ہو۔

وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ
إِلَٰهَةً لِّيَكُونَ تَوَكُّلُهُمْ
عَلَيْهَا سَبِيلًا يَمْتَدُّونَ
وَيَكُونُوا عَلَيْهِمْ مُدْنًا
اور انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اوروں کو اپنا
معبود بنا رکھا ہے تاکہ ان کے لیے عزت ہو
لیکن یہ تو کبھی ہونے کا نہیں، عزت کی جگہ
معبودان کی بندگی سے انکار کرینگے اور
کئے اُن کے دشمن ہو جائیں گے۔ (۸۳:۱۹)

لیکن اب حالات بدل گئے ہیں، اور قوم ان احکام کی تعمیل کرتے
کرتے اُکٹا گئی ہے یہ پہلا موقع ہے کہ عوام نے اپنی قوت کو محسوس کیا ہے اور لیڈروں
کی تعلیم محض کی جگہ خود اپنے دماغ اور فکر سے اپنے مصالح پر غور کرنا چاہا ہے پس
فی الحقیقت یہ قومی زندگی کے لیے سب سے بڑی بشارت اور روح ملی کا
پیغام حیات ہے اور ہم اس کو کوئی معمولی حرکت نہیں سمجھتے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی اور مسئلہ الحاق علی گڑھ

بلکہ اگر مذہب اُمید کی تعلیمات کو زیادہ کشادہ دلی کے ساتھ قبول
کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ جتنے قلیل عرصے کے اندر خیالات میں تغیر کی روشنی
پیدا ہوئی ہے وہ گزشتہ تاریکی کو دیکھتے ہوئے تعجب انگیز ہے یا تو لوگوں کا یہ حال
تھا کہ لیڈروں کے ہر حکم کے آگے سمعنا و اطعنا کہتے ہوئے سر بسجود

ہو جاتے تھے یا یکایک دلوں کی کل اس طرح بگڑ گئی کہ ہر بائی جنس سر آغا خاں
 ڈھا کہ یونیورسٹی کو تقسیم بنگال کا فہم البیل قرار دے کر حکم دیتے ہیں کہ "تسبیخ
 تقسیم پر اظہار ناراضی کی جگہ گورنمنٹ کا شکریہ ادا کرے" اور لیگ کے دفتر میں
 جلسہ منعقد کیا جاتا ہے، لیکن نہ تو کوئی بندہ خدا مولوی عزیز مرزا مرحوم کی
 سنتا ہے اور نہ اس فرمان عالی کی تعمیل کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔

ہیں آج کیوں دلیل کھل تک تھی ناپسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اس سے بھی بڑھ کر یونیورسٹی کے احاق کا مسئلہ ہے، یہ مسئلہ فی نفسہ
 خواہ اہم ہو یا نہ ہو لیکن قوم کی خواہشوں کے ضرور خلاف تھا۔ اگر پچھلے
 وقتوں کی صحبتیں ہوتیں تو لوگ غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے لیکن
 پریس کمیونک کی اشاعت کے ساتھ ہی تمام ملک میں ایک عام حبش نے
 پیدا ہو گئی اور لیڈروں نے قوم کو اس قدر محکم دکھیا کہ قوم کو اپنے آگے بھٹکا
 کی جگہ پہلی مرتبہ خود اس کے آگے جھک گئے۔ یہ حالات یقیناً مایوسیوں
 کی شب تاریک میں ایک "صبح امید" کی آمد کے آثار ہیں۔ پہلی شو بھی تھی
 کہ تقلید کی بندشیں ڈھیلی ہوں اور پاؤں خود چلنے کے لیے حرکت کریں
 الحمد للہ کہ اس اولین منزل کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔

(۲)

کسیکے محرم راز صباست امی دانہ
 کہ باوجود خزاں بوئے یا سمن باقیست

دوسری علامت : رہبانی اقتدار کا خاتمہ

ایک بہت بڑی اُمید افزا علامت یہ بھی ہے کہ ہمارے لیڈروں کی اس اجاری اور رہبانی سطوت و تسلط کا خاتمہ ہو گیا، جس نے قوم کے قلوبِ اذہان کی ذاتی قوت سلب کر دی تھی، اور کسی منفس کو اس کے آگے چون دچرا کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح کے پُر خوف رعب کا کسی ایک گروہ کے تہذیب میں رہنا، ہمیشہ سے قوموں کے دماغی تنزل کی ایک حقیقی علت رہا ہے، اور تقلید کی حبس گرہاں میں، وہ اسی رعب و جبروت کی ہوا میں نشوونما پاتی ہیں۔ ہم نے گذشتہ نمبر میں کہا تھا کہ ہر اصلاح کی اولین منزل تقلیدی بندشوں سے رہائی ہے، لیکن تقلید کے قید خانے سے آدمی نکل نہیں سکتا، جب تک پیشواؤں کے رعب و جبروت کی زنجیروں سے رہائی نہ پائے۔ انسان کے نظامِ دماغی پر صرف اعتقادات کی حکومت ہے، اس کے تمام حالات اسی شر کے ماتحت، اور تمام اعمال و افعال اسی سے وابستہ ہیں، پس جب اس کا دماغ کسی خارجی عظمت و جبروت کے اثر سے مرعوب ہو جاتا ہے، تو اس کے تمام اعمال و معتقدات میں اس مرعوبیت کا اثر سرایت کر جاتا ہے، بلکہ وہ جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہے، وہ بھی اس مرعوبیت کے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ چونکہ اس کی قوتِ فکری بیکار ہو جاتی ہے، اس لیے یہ مرعوبیت جو کچھ دکھاتی ہے، دیکھتا ہے، اور جو یقین دلاتی ہے، یقین کرتا ہے۔

ایک بت پرست جب انتہا درجہ کی عاجزی کے ساتھ ایک پتھر کی مورت کے آگے سر ٹکتا ہے، تو کیا اس کا دماغ مغل ہو جاتا ہے؟ کیا اس کی قوتِ بصارت جوابِ بیتی ہے؟ کیا سوچنے اور سمجھنے والی قوت اس کے دماغ سے اُس وقت چھین لی جاتی ہے؟ اور

کیا کوئی خاص قوت تفکر موجدِ الہ پرست انسان کو نصیب ہو، جو بت پرستوں کو نصیب نہیں؟ پھر کیا بات ہو کہ ہم کو جو شے محض پتھر کا ایک ٹکڑا نظر آتی ہو، مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَيَضُرُّهُمْ اُسی شے میں بت پرست الہی طاقتوں اور عظمتوں کا کرشمہ دیکھتا ہو، اور جو قوت فکری ہیں اُس پر ہنساتی ہو، وہی اس کی طاقتوں کا اُسے عین دلاتی ہو؟ اس کا اصلی سبب یہی ہو کہ تقلیدِ آباء و رسوم نے اُن بتوں کی عظمت و جبروت سے اس کے دماغ کو مرعوب کر دیا ہو، اور تمام قوتیں اور حواس کو قائم و صحیح ہیں، مگر اس رعب و سطوت کے بوجھ سے اس طرح دب گئی ہیں، کہ ان کو اپنے اعمال کا موقع ہی نہیں ملتا۔ قوت فکری ضرور اس کے دل میں شک اور ترزل پیدا کرے کہ ان بتوں میں دھڑا ہی کیا ہو؟ مگر مرعوبیت اس کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ آنکھیں ضرور اس کو دکھلائیں کہ یہ ایک حقیر و ذلیل پتھر ہو، مگر مرعوبیت کی بندھی ہوئی پٹی دیکھنے ہی نہیں دیتی۔ اس کے پاس غور اور فکر کی وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو ایک موجد اور "ملکوت السموات والارض" پر غور کرنے والے حکیم کے پاس ہیں، مگر اعتقادِ عظمت کا دیو انہیں اپنے بچے کی گرفت سے نکلنے نہیں دیتا۔ قرآنِ کریم نے اسی حالت کی نسبت فرمایا ہو کہ:

فَاَنَّهُمْ لَا تَحْسِبُ الْاَبْصَادَ
وَلَكِنْ تَحْسِبُ الْقُلُوبَ الَّتِي
فِي الصُّدُورِ (۲۲: ۳۵) سینوں میں ہیں۔

یہ حالت عام ہو اور اس کی نظیریں انسانی اعمال کی ہر شاخ میں مل سکتی ہیں۔
کطرۃ السنۃ۔ ہم مسلمانانہ رائے مشاؤون کی عظمت و جبروت کا رعب

اس طرح چھایا ہوا تھا کہ ان کو کبھی خود غور کرنے اور اپنی حالت کو سمجھنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اگر کبھی کسی شخص کے دل میں شک و شبہ پیدا بھی ہوتا تھا، تو اس مرحومیت کے استیلا سے شکست کھا جاتا تھا۔ مگر احمد شاہ کہ اب تقلید کی بندشوں کی شکست نے اس الہی رعب و سطوت کی زنجیروں سے بھی مسلمانوں کے دماغوں کو نجات دلا دی تھی، اور ہماری نظر میں یہ اصلاح و تغیر کی دوسری نبیاء، جس کو ہر طرح کے اصلاحی تغیرات کا دیا چہ سمجھنا چاہیے۔ یہ کوئی معمولی انقلاب نہیں ہے کہ کل تک جن لیڈروں کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا، سب سے بڑا انسانی جرم سمجھا جاتا تھا، آج تمام قوم علانیہ اخبارات میں ان پر سخت سے سخت نکتہ چینی کر رہی ہے اور شدید سے شدید الزام دینے میں بھی کوئی گناہ نہیں سمجھتی۔ اب لیڈروں کی بنائی ہوئی سیاسی شریعت کے احکام میں عقل کو دخل دینا کفر نہیں رہا، بلکہ صرف بدعت ہے، اور ہیتوں کے عقیدے میں تو بدعتِ حسنہ اب آزادانہ حقوق طلبی اور پولیٹیکل جدوجہد کی دعوت دینے والے کو گزشتہ سیاسی اصطلاح کی سب سے بڑی گالی دینے، یعنی ”کانگریسی“ کہنے میں جلدی نہیں کی جاتی، حالانکہ یہ وہ گالی تھی، جس میں گویا اخلاقی، ہمتی، اور مذہبی ردائیں و عیوب کی ایک دنیا پوشیدہ تھی۔ غرض کہ اب مسلمان لیڈروں اور ان کی ”مسلمہ پالیسی“ کی عظمت و رعب کا بیتِ عنکبوت ہبائے منشور ہو گیا: دان اودھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون (۲۹: ۳۱) نعرہ انا الحق کہنے پر منصور کو سولی پر چڑھایا جاتا تھا، اب بہت سے منصور پیدا ہو گئے ہیں جو دار و رس کی سطوت سے بے خوف و نڈر ہیں، اور خود لیڈروں نے بھی اس تغیر کی قوت کو محسوس کر کے اپنے اقتدار کا اٹل

اللہ بہا من سلطان کی گرفت ڈھیلی کر دی ہو، بلکہ دیوہ فور کے ساتھ لکھا جائے تو لیڈروں کے رعب و سطوت کی جگہ اب خود لیڈر قوم کے رعب سے مرعوب ہوئے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس تغیر کی فرصت کو ضائع نہ کر دیا گیا تو انشا اللہ بہت جلد قوم میں زندگی کی حرکت پیدا ہونے والی ہو جیتی اللہ سبحانہ و لو کرہ المجرمون (اور خدا اپنے کلام سے حق بات کو حق کر دکھائیگا، اگرچہ شکر دلوں کو برا لگے)

اسلامی پریس کا تغیر

اگرچہ اس تغیر حالت کا اصلی سبب قدرتی دلولوں کا اضطراب، اور پھر اس کا جلد ظہور، تسبیخ تقسیم بنگال کو سمجھنا چاہیے، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلامی پریس کے ایک دانشمند اور اثر پذیر حصے نے بھی اس تغیر کی تشکیل میں بہت مدد دی، اور یہ سخت نا انصافی ہوگی اگر اب، اور آئندہ بھی اس تغیر کے تذکرے میں ان کے ذکر کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں بلحاظ تقدیم اشاعت سب سے پہلے کامریڈ کا ذکر کرنا چاہیے جس نے گو قیدی اصطلاحات و اسما کو ہمیشہ قائم رکھنے کی سعی لا حاصل کی (لا حاصل اس لیے کہ اب ان میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی، لیکن تاہم معافی بہت کچھ بدل دئے، اور گو تغیر کی رفتار مصلحتاً مسست رکھی، مگر پچھلی منزل سے آگے بڑھتا رہا، اور مسلمانوں میں تبدیع ملکی معاملات سے دلچسپی لینے کے مذاق اور ہر پولیٹیکل مسئلے میں لیڈروں کے فتوؤں کی جگہ قومی آراء کے ظہور و نشو و نما کا ایک موثر محرک ہوا۔ اصلاح و تغیر کے مختلف طرق میں سے یہ بھی ایک بے خطر اور آسان تر طریقہ ہے۔ کامریڈ کے ساتھ ہی سلم گزٹ

لکھنو اور زمیندار لاہو کے نام نظر آتے ہیں، جن کی آزادانہ پالیسی کو فی الحقیقت اس نئی بیداری کے طواریں نمایاں دخل دے۔ پیرانے اخباروں میں وکیل امرتسر بھی قابل تذکرہ ہے، جس نے یونیورسٹی کے متعلق ابتداء سے آزادانہ رائیں ظاہر کیں۔ اسی سلسلے میں خاص طور پر البشیر کا بھی ذکر کرنا چاہیے جس نے سچائی اور قابل تعریف دلیری سے نئے تغیرات کا ساتھ دیا ہے اور پچھلی پالیسی سے دست بردار ہو جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ یونیورسٹی کمیٹی کی نسبت بھی جو مضامین آج کل وہ لکھ رہا ہے، وہ آزادی اور راست بیانی سے خالی نہیں۔ اور گو وہ ہم ”قدیمی دشمنانِ کالج“ اور ”اعدائے قوم“ سے کتنا ہی ناراض ہو، مگر جب وہ اپنی جگہ چھوڑ کر حرکت کر چکا ہے، تو اب ہم کو اس سے کوئی ناراضگی نہیں، بلکہ خوشی ہیں کہ

اندک اندک عشقِ درکار آور دہیگا نرا

ان کے علاوہ اب تو عام طور پر اکثر معاصرین کو اس تغیر سے متاثرہ اور راہِ حق گئی و آزادی کے قریب قریب پاتے ہیں۔ نئے نئے پرچے بھی جو نکل رہے ہیں، وہ بھی الحمد للہ نئے خیالات لے کر نکلتے ہیں اور پیرانے طریق کو چھوڑ رہے ہیں۔ اکثر صاحبوں نے تو علانیہ نئے خیالات کا اظہار شروع کر دیا ہے اور بعض مصلوٰۃً صرف تغیر لبِ لہجہ سے نئی پالیسی کی ابتدا کرنی چاہتے ہیں اور نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔ علی الخصوص یونیورسٹی کے معاملہ میں تو تقریباً تمام اسلامی پریس آزادانہ رویہ پر متحد ہو گیا ہے اور کوئی اخبار بھی ایسا نہیں، جس نے نہایت سخت لفظوں میں نکتہ چینی نہ کی ہو۔ شکو اللہ سید محمد دفعنا اللہ سبحانہ و یا اھو

کما مچھ و برضاه
مسلم گزٹ لکھنؤ

مگر حقیقت موجودہ تغیرات کے ذکر میں سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ مسلم گزٹ لکھنؤ کا ذکر کرنا چاہیے، جس نے موجودہ سیاسی تغیرات خیالات کی تولید میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا، اور اس خدا پرستانہ دلیری، اور حق گو یا نہ آزادی کے ساتھ صدا بلند کی، کہ فی الحقیقت ”لاتجانون لومۃ لاکم“ کے نفوس خاص میں اس کا شمار ہو۔ ہم اپنے مخدوم رصیف سے متمنی ہیں کہ اپنے قلبی جہاد کو اور زیادہ محکم و شدید کریں۔ اور آگے چل کر ہم جن امور کا ذکر کرنے والے ہیں ان سے غفلت نہ فرمائیں، وہ یقین کریں کہ حق اور سچائی کے لیے فتح ہر باطل اور باطل پرستی کے لیے نہیں کہ ان الباطل کا ن زھوفا۔

موجودہ لیڈروں کے خیالات میں تغیر

اس سلسلے میں اس تغیر کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جو آج کل خود کار فرمایاں ملت کے خیالات میں بھی صاف صاف نظر آ رہا ہے۔ اور اگر یہ تغیر بعض مصالح وقت، اور اضطرار حالات کی بنا پر نہیں، بلکہ سچے طور پر دل اور دل کے اندر تک پہنچا ہوا ہو تو فی الحقیقت اس کو ایک بہت بڑی ذال نیک سمجھنا چاہیے۔ ہم نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں سخت سے سخت الزام ان کو دیے ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہو رہا ہے کہ ہم نے ان کی نیتوں تک کو بھی مشتبہ قرار دیا ہے، مگر وہ یقین کریں کہ ہم ان سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ ہمارے بعض دوستوں نے ہم کو الزام دیا ہے کہ ہم لیڈروں کی پوری جماعت کو یکساں تاریکی میں ظاہر کرتے ہیں۔

حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں، ہمارا تو ان کی نسبت ابتداء سے یہ خیال ہو کہ :
 مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ بعض ان میں سے طریق ہدایت کو چھوڑ کر اپنے نفس
 وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ پر ظلم کر رہے ہیں، بعض ان میں سے درمیانی راہ چلتے
 وَمِنْهُمْ سَابِقٌ ہیں اور پھر انہی میں سے ایسے بھی ہیں، جو واقعی اعمال
 بالخیرات (۳۵: ۳۱) نیک میں پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں۔

لیڈروں سے ہماری صرف یہ التجا ہو کہ وہ گزشتہ باتوں کو بھول جائیں
 تو ہم بھی بھول جانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کو موجودہ تغیرات سے عبرت پکڑنی
 چاہیے اور ان کو چاہیے کہ آئندہ کے لیے اپنا معاملہ اپنے خدا سے درست
 کر لیں، اور اپنی نیتوں اور ارادوں کو صرف رضائے الہی کے تابع کر دیں۔
 جس دن وہ ایسا کر لینگے پھر ان سے بڑھ کر قوم کے لیے اور کوئی مفید وجود نہ
 ہوگا۔ یہ کیسی سخت غلطی ہو کہ خدا ان کو دین اور دنیا، دونوں کی عزت دینا
 چاہتا ہو، مگر وہ بے ہمہتی سے صرف دنیا کو پوجتے اور اس کے پیچھے سرگرداں ہیں؟
 وَمَنْ كَانَ يَرْيدُ ثَوَابَ جو شخص دنیا کی بہتری چاہتا ہو اس سے کہہ دو
 الدنیا فعد الله ثواب کہ خدا کے پاس دنیا اور دین، دونوں کی بہتری ہو۔
 الدنیا وَالْآخِرَةِ (۶: ۷۸) وہ دونوں کا کیوں نہیں طالب ہوتا؟
 وَمَنْ كَانَ يَرْيدُ الْعِزَّةَ، فَلله اور جو عزت کا طلبگار ہو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ
 الْعِزَّةُ جَمِيعًا (۳۵: ۲۱) عزت اللہ کے لیے اور اسی کے ہاتھ میں ہو۔

لیکن اس فرصت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

یہ حالات یقیناً امید افزا ہیں، اور تغیرات نے نئی بنیادیں رکھنی شروع کر دی

ہیں، گلاب سب سے مقدم بات یہ کہ اس انقلاب و تغیر کی اہمیت و نزاکت کو نظر انداز نہ کیا جائے اور کمال حزم و احتیاط کے ساتھ آئندہ اقدامات کا ایک نقشہ مرتب ہو۔ اگر خدا نخواستہ یہ فرصت محض اخبار کی قلم فرسائیوں اور ذہنی نقشہ آرائیوں میں ضائع کر دی گئی، تو پھر یاد رہے کہ ہمارے لیے ہمیشہ ایک طلائی فرصت کے کھودینے کا ماتم ہوگا۔ قدرت اپنی بخشائشوں میں جس قدر فیاض ہے، اتنی ہی غافلوں اور کافرانِ نعمت کی تعذیب میں شدید بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ پھر ایک مدت تک کے لیے ہمارے دل ہم سے روٹھ جائیں، اور زمانہ ہماری ملی قوت کو محض ایک عارضی ہیجان سمجھ کر ہمیشہ کے لیے ناقابلِ التفات سمجھ لے۔ اس وقت تک نئے قافلے کے ساز و سامان کی فراہمی کے لیے جتنی دوا و دھوپ ہو چکی ہے، کافی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ الرحیل! الرحیل! کی صدا بلند کر دی جائے، اور قافلہ منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائے۔

مکرِ مستقبل

پس گزشتہ افسانہ کو ختم کر کے آئندہ کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ اب ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ پھپھی راہِ صلیح نہ تھی، اور گو: مَا وَجَدْنَا عَلَيْهَا بَأْسًا الْقَوَّائِنِ کی صدائیں اب بھی کہیں کہیں سے آرہی ہیں، اور گویا یہ بھی ہیں جو اب بھی زبان سے اپنی پھپھی صلاحت کا اقرار کرتے ہوئے شرارتیں ہیں، لیکن اگر دلوں کو ٹٹولا جائے، تو کوئی بھی نہیں جو تزلزل اور حبش محسوس نہ کرتا ہو۔ اس لیے اب تمام قوتِ غور و بحث اس میں صرف کرنی چاہیے کہ آئندہ کے لیے کونسی راہ اختیار کی جائے، اور اس کا نظام اور مقصد کیا ہوگا؟ جن لوگوں نے موجودہ تغیرات

کے پیدا کرنے میں سسی مشکور کی ہے، ان کو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ ناکام نہیں ہے مگر ساتھ ہی اب ان کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر ایک راہ سے ان کو ہٹایا ہے تو دوسری راہ پر لگا بھی دیں۔ اگر اس وقت قوم کے آگے کوئی نئی راہ پیش نہ کی گئی، تو خوف ہے کہ کہیں بے خانماں ہو کر اور زیادہ بھٹک نہ جائے۔ بیشک اب تک قوم کے پاس کوئی محفوظ گھر تھا ہی نہیں، گھر اگر بنے گا، تو اب بنیگا، تاہم ایک گھر ہے ہوئے گڑھے میں تو ضرور پڑی تھی، جب اس سے نکل آئی ہے، تو زیادہ دیر تک کھلی زمین پر آوارہ نہ رکھیے۔

ہم اس نکتہ سے بے خبر نہیں ہیں کہ ہر اصلاح و تغیر کے لیے اصلی کام پیش کا پیدا کر دینا، اور گمراہی کے قفس کا دروازہ کھول دینا ہے۔ جب حرکت پیدا ہوگی اور قفس کی قید سے باہر نکلیں گے، تو پھر خود ہی اپنے لیے کوئی نہ کوئی آشیانہ ڈھونڈھ لینگے۔ یہ بالکل سچ ہے، اور جو لوگ آج قوم میں حرکت پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کو ہرگز اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتے کہ وہ قوم کو گڑھے سے نکال کر اس کے لیے کوئی نیا محل بھی تیار کر دیں۔ یہ کام ان کا نہیں ہے، ان کا اصلی فرض یہاں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے کہ پانی بند ہے، اس کا بند توڑ دیں، جب وہ چلیگا تو خود اپنا راستہ نکال لیگا، اور اگر وہ نہ نکال سکیگا تو پھر بخیر نینگے اور اس کے لیے ایک مستقیم نہر کا خط کھینچینگے۔

یہ اصلاح کے تقسیم عمل کا ایک سچا اصول ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لیے وہ قومیں موزوں ہیں، جن کے یہاں تقسیم عمل کے لیے داغوں اور ہاتھوں کی کمی نہیں۔ ان کے یہاں ایک دماغ صرف نقاد ہوتا ہے جو صرف

نکتہ چینی کرتا ہے اور بتلا دیتا ہے کہ عمارت کی دیوار میں اس جگہ کچی ہے۔ پھر دوسری جماعت معماروں کی ہوتی ہے، وہ دیوار کو ڈھاکرا زسرو اٹھاتی ہے۔ مگر مسلمانوں میں اصلی سوال دماغ اور رائے ہی کا نہیں، بلکہ آدمیوں کا ہے۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں آدمی نہیں، اور آدمی مشینوں میں ڈھل نہیں سکتے۔ پس ہم کو ہمیشہ اپنی بے بضاعتی پر نظر رکھنی چاہیے، اور اس لیے ہر شخص کو صرف اپنا فرض ہی نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اپنے امکان اور مقدور پر نظر رکھنی چاہیے۔

اس کے زمانے میں جب فوج اپنی اپنی بارکوں میں رہتی ہے، تو توپ چلانے کی ہوتی ہے، ان کو اٹھا کر اپنی پیٹھ پر لیے ہوئے نہیں پھرتی، لیکن جب جنگ کی نیازک گھڑیاں آجاتی ہیں تو پھر اس وقت صرف فرض اور ذمہ داری ہی ہر شخص کی نہیں دیکھی جاتی، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اپنے اپنے مقدور اور اپنی اپنی طاقت بھر جو سپاہی جس قدر کام کر سکتا ہے اس سے دریغ نہ کرے۔ اگر بہاڑ سائے آکر حائل ہو جاتے ہیں تو سپاہی چخروں اور مزدوروں کا انتظار نہیں کرتے۔ خود ہی توپوں کو کھولتے ہیں، خود ہی اپنی پیٹھوں پر لاد بھی لیتے ہیں، اور پھر خود ہی وقت پر ان سے کام بھی لیتے ہیں۔ اسلام کے لیے درحقیقت یہ ایک جنگ کی نیازک گھڑی ہے، جس میں وہ اپنے ہر سپاہی سے صرف اس کی ڈیوٹی ہی کا نہیں، بلکہ وہ جو کچھ کر سکتا ہے، اس کا طالب ہے۔ اس وقت کام کرنے والوں کو خود ہی تجویز پیش کرنی چاہیے، خود ہی قوم میں اس کی دعوت پھیلانی چاہیے، اور پھر کوشش کرنی چاہیے کہ ہو سکے تو خود ہی اس تجویز کو عمل تک پہنچائیں اور اگر نئی تلاش کی دعوت دی ہے تو خود ہی اس کو ڈھونڈھ کر سامنے بھی کر دیں۔

اسی بنا پر اب ہم گزشتہ کے ذکر و افسوس کو بالکل بیکار سمجھتے ہیں۔ اصلی کام یہ ہے کہ پھلی راہ سے ہٹانے کے بعد اب قوم کے آگے ایک نئی راہ کھول دی جائے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس بارے میں رب کریم و عزیز و حکیم نے جو خیالات ہمارے دل میں ڈالے ہیں، اُن کو آئندہ نمبر میں پیش کریں گے۔ اور تمام باتیں اُسی کے فضل و توفیق پر موقوف ہیں۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْهِ التَّكْلَانِ۔

القسط المستقيم

(۱)
مسلمانوں کی آئندہ شاہراہ مقصود کیا ہونی چاہیے؟

مراد و خضر عنان گیر باید از چپ دراست
کہ کج روی نہ کنم در نہ عزم راہ خطاست
اللَّهُمَّ اِدِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَاَصْرِ قَنَا اِتِّبَاعَهُ وَاَدِنَا
الْبَاطِلَ طِلًّا وَاَصْرِ قَنَا اجْتِنَابَهُ

ہم نے گذشتہ دو نمبروں میں مسلمانوں کے موجودہ تغیر خیالات کو صحیح امید
کے نفاذ سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ ہر اصلاح کی بنیاد اولین تغیر خیالات پر
افکار ہے، اس لئے اس تعبیر میں کوئی مبالغہ و اغراق نہ تھا، لیکن آج جن

امور پر ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں، یہ وہ امور ہیں، جن سے اگر بے پروائی کی گئی، تو بارگھنا چاہئے کہ یہی تصریح امید نہیں، بلکہ گمراہیوں اور باطل پرستیوں کی ایک سخت خطرناک قسب پیدا ہو جائے گی

جمہور اور خرات

حقیقت یہ ہے کہ خیالات کی جنبش اور حرکت فی نفسہ کوئی مقید شے نہیں ہے۔ جب تک وہ کسی آئندہ صحیح ایجاد و افکار سے متصل نہ ہو جائے اگر ایسا نہ ہوا، تو حرکت محض بعض حالتوں میں بے کار و لا حاصل، اور اکثر حالتوں میں جمود سے زیادہ مہلک اور خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

بالفاظ سادہ تر، اس کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص مدتوں سے ایک جگہ بیٹھا ہے، بالکل بیٹھا رہنا زندگی کے لئے نہایت مضر اور اعضا و جوارح کو معطل کر دینے والا ہے، اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ وہ حرکت کرے یہ نہایت عمدہ خیال ہے، لیکن یہ حرکت اس وقت مفید ہوگی جب آپ نے چلا کر کسی عمدہ بارغ کی روش پر لا کھڑا کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ نے اس میں حرکت پیدا کر کے سلسلے کے گڑھوں سے اُسے نہ بچایا، اور وہ غریب اس میں گر گیا، تو اس حرکت سے تو اس کا بیٹھا رہنا ہی بہتر تھا۔

مسلمانوں کے لئے خطرات حیات اب شروع ہوں گے

یہودیوں کا طبقہ اپنے گزشتہ عہد کو خواہ جدوجہد کی ایک شاندار تاریخ سمجھے، مگر ہمارے نزدیک مسلمانوں کی حرکت کی تاریخ اگر شروع ہوگی تو اب سے شروع ہوگی۔ وہ فی الحقیقت اب تک سو رہے تھے، زندگی کی ان

میں کوئی حرکت نہ تھی، اور مینڈ نے ان پر موت کا جمود طاری کر دیا تھا اور وہو
 الذی یتوقا کہ بالکسل) ایک سوئے ہوئے انسان سمجھے اس
 کی کوئی بحث نہیں ہونی کہ دوڑنا بہتر ہے یا آہستہ چلنا؟ تکیہ لگا کر بیٹھنا بہتر ہو
 یا دوڑنا ہو کر بیٹھنا؟ کیونکہ یہ حالتیں اسے پیش ہی نہیں آتیں۔ لیکن وہ اب
 جلگے ہیں، ان کو بیٹھنا بھی پڑے گا، اٹھنا بھی پڑے گا، اور کبھی آہستہ خرامی او
 کبھی تیز قدمی سے چلنا بھی پڑے گا۔ پس اب ان کی حالت پیستری کی سی بے خطر نہ
 ہوگی، کیونکہ امن موت میں، مگر خطرہ صرف زندگی ہی میں ہوتا ہے۔ جب تک
 غافل پڑے ہوئے اینٹھ رہے تھے تو نہ ان کو فرش گل پر چلنا تھا، اور نہ جنگل کے
 خارزار پر، لیکن اب دونوں طرح کی زمینوں پر ان کے قدم پڑ سکتے ہیں۔ اس
 لئے فی الحقیقت سوچنے، غور کرنے، اور حزم و احتیاط کا وقت اب آیا ہے۔ بہت
 ممکن ہے کہ میٹھے کی جگہ اٹھ کھڑے ہوں، کچھ بعید نہیں کہ آہستہ چلنے کی جگہ بے اختیار
 دوڑنے لگیں۔ ٹھوکریں بھی کھا سکتے ہیں، اور درود دیوار سے ٹکرا بھی سکتے ہیں کیونکہ
 اب وہ سوئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زندہ اور متحرک ہیں۔ خطرات سے مقابلہ زندگی
 اور حرکت میں ہوتا ہے۔ جمود اور سکون میں نہیں ہوتا۔

پس پہلے ہمیں ثواب ضرورت ہے کہ ایک ایسی حقیقی رہنمائی کے ہاتھ میں ان
 کا ہاتھ ہو، جو انھیں مطلق میٹھے نہ دے۔ چلانا رہے، لیکن سب اتنا ہی نگران بھی ہے
 کہ کہیں راہ کے اِدھر اُدھر گڑھوں اور غاروں میں پھسل نہ پڑیں۔

مرا د و خضر عناں گیر باید از چپ راست
 کہ کج روی نہ کنم، در نہ عزم راہ خطا است

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم

کہ مسلمانوں کے لئے تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو رہنما ہو سکتا ہے اور ایک ہی ختم نگران ہے، جو غرضوں سے بچا سکتی ہے۔ یہ وہی ہے جو کبھی کوہ سینا پر تعالیٰ حق بن کر چمکی، کبھی فاران پر ابر رحمت بن کر نمودار ہوئی۔ کبھی غار نور میں **لَا تَخْشَوْنَ إِنَّا اللَّهُ مَعَنَا** کی صدا میں تھی، کبھی بدر کے کنارے **إِن يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ** کے پیغام میں تھی، کبھی احد کے دامن میں **وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ** کی بشارت تھی اور آج بھی ایک نئے ہوئے کاروان، ایک برباد شدہ قافلے اور ایک برہم شدہ انجمن کے لئے اسید کا آخری مہارا اور زندگی کی آخری روشنی ہے :

اَمِنْ تَحِيْبِ الْمُضْطَرِّ اِذَا دَعَاكَ
وَيَكْشِفِ السُّوءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَاءَ الْاَرْضِ مِنْ عَالِي مَع
اللّٰهِ قَلِيْلًا مَا تَذَكَّرُوْنَ
اَمِنْ يَهْدِيْكُمْ فِى ظُلُمَاتِ الْبَرِّ
الْجَنِّ وَمَنْ يُوسِلُ الْوَيْلَاحَ بَشَرًا لِّبَن
يَدِىْ رَحْمَتِ اللّٰهِ مَعَ اللّٰهِ تَعَالٰى
کون ہے کہ جب ایک مضطر ادبے قرا
روح اس کو بجاتی ہے تو اس کی فریاد
کو سنتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا
ہے ؟ اور کون ہے کہ اس نے تم کو زمین
پر اپنا نائب بنایا اور اس کی وراثت
بخشی، کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے ؟
پھر بتلاؤ کون ہے جو خشکی اور تری کی
تاریکوں میں ہدایت کرتا ہے اور بارانِ رحمت سے پہلے بوادوں کو بشارت کے لئے
بجھ دیتا ہے۔ کیا خدا کے سوا کوئی دوسرا ہے ؟

دنیا میں جب کبھی کسی بنی آدم نے اصلاح حیات کی کوئی منزل طے کی ہو

تو صرف اسی ہاتھ کی رہنمائی سے، اور جو اس کی رہنمائی میں آگیا، پھر اس کے لئے مگر اسی نہیں۔

فَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَ الْيَسِيرَةِ
يُشْرَحُ صَدْرُهُ لِلْإِسْلَامِ (۶۷-۶۸)
اَفَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَ الْإِسْلَامِ هُوَ
عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ زَيْلٍ فَقِيلَ لِلْقَاسِيَةِ
قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ (۱۳۹-۱۴۰)
خدا جب کسی شخص کو راہِ راست پر چلانا چاہتا ہے تو اس کا دل اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کا دل کھول دیا گیا، تو پھر وہ اپنے پروردگار کی روشن کی ہوئی مشعلِ ہدایت اپنے ساتھ پاتا ہے۔ مگر انہیں ان لوگوں پر جن کے دل ذکرِ الہی سے غافل ہو کر سخت ہو گئے ہیں۔

اولین اور بنیادی مسئلہ

سب سے پہلے اس امر پر غور کرنا چاہئے کہ اس تغیر خیالات کا منشاء کیا ہے؟ اور رخ کس طرف ہونا چاہئے؟ ہم کو نہایت رنج اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس لحاظ سے موجودہ تغیرات خیال کا منظر زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے ہم صاف صاف اور بآواز بلند کہہ دیتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی قدیمی پالیسی کو صرف اس لئے چھوڑنے ہیں کہ تینخ بنگال، اور مسئلہ یونیورسٹی کی وجہ سے وہ گورنمنٹ سے روٹ گئے ہیں، یا یہ تغیر صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ آزاد خیال ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی پالیٹکس! پالیٹکس!! پکارنے کے لئے مضطرب ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ اس نئے تغیر اور انقلاب میں ان کے لئے کوئی برکت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اب تک جہاں پڑے سسک رہے تھے، وہیں بقیہ ایامِ ذلت و فحاشی

ادھ کاٹ لیں۔ تاریکی ہی میں رہنا ہے، تو پھر اس سے کیا بحث کہ وہ کوئی گڑھا ہے یا عمدہ بنایا ہوا تہ خانہ؟ آج تک اُن کی نام ناکا میوں کی علت ضیق یہی رہی ہے کہ اُنھوں نے اپنے اعمال زندگی کی کسی شاخ کو ”سلطانِ مسران“ کے ماتحت نہیں رکھا اور جب کبھی کوئی تحریک شروع کی، یا اپنے لئے کسی پالیسی کا پروگرام مرتب کیا، تو قرآنِ کریم کو اس طرح بھوئے رستے، گویا اس کا نازل تاریخِ عالم کا کوئی واقعہ ہے ہی نہیں، اور یہ بھی سچ نہیں کہ وہ اس نام کی کسی کتاب کے پیرو ہیں۔ اگر مسلمان اس تغیر کے بعد پھر اسی گمراہی میں پڑنا چاہتے ہیں تو یہ ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں پھنسا، اور ایک دام سے نجات پا کر دوسرے میں گرفتار ہونا ہوگا۔ پھر اگر گمراہیوں کے قفس ہی میں میٹھے مفید رہنا ہے تو موجودہ قفس میں کون سی برائی ہے کہ نئے پتھر کی جستجو کی جائے، بے شک تقسیمِ بنگال کی تیئیس اور یونیورسٹی کا مسئلہ ہمارے جمود و غفلت کے لئے ایک تازیانہٴ تنبیہ ضرور ہے، اور ہم یقیناً مشال الداد عند اللہ ہوں گے، اگر اس سے عبرت نہ لکڑیں، لیکن ہماری آئندہ پالیسی کی بنیاد کوئی وقتی یا فوری واقعہ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ وہ ایک مستقل اور دائمی اعتقاد ہونا چاہئے جو اپنے قیام کے لئے کسی بیرونی سہارے کا محتاج نہ ہو۔ فرض کیجئے کہ کل گورنمنٹ نے پھر بنگال کے دو نہیں بلکہ دس ٹکڑے کر دئے اور وزیرِ ہند نے اعلان کر دیا کہ یونیورسٹی کا نام علی گڑھ نہیں بلکہ مسلم ہوگا، کیونکہ جو گورنمنٹ ایک مرتبہ تقسیم کر کے اُسے منسوخ کر سکتی ہے، وہ اب سب کچھ کر سکتی ہے پھر کیا اس حالت میں مسلمانوں کی پالیسی پر ایک تیسرا انقلاب طاری ہو جائے گا؟

اور پھر تغیر! تغیر! کی صدا بلند کی جائے گی؟ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ آپ کا کوئی عقیدہ، کوئی خیال، کوئی مقصود، کوئی نصب العین اور کوئی اہلی پالیسی نہیں، آپ صرف گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی حرکت کا نام میں اور صرف اُسی کو تنگے رہتے ہیں۔ اگر مصلحتِ لطف و مہر کی علامتیں نمایاں ہوئیں تو سمعاً و اطمعاً کہہ کر سر بسجود ہو گئے، اور اگر مصلحت نے گوشہ چشم رفیقوں کی طرف پھیر دیا، تو لگے منہ بسورنے اور آنسو بہانے۔ سوال یہ ہے کہ خود آپ کے پاس بھی کوئی شے ہے یا نہیں؟

ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ جو لوگ تقسیمِ بنگال کی تیئیس سو نہیں بلکہ بیشتر سے اپنے اندر آزادی اور حقوق طلبانہ پالیسی کا دلولہ رکھتے ہیں، گو عام راہِ انقلاب سے الگ رہنے کا انھیں الاؤ نہیں دینا چاہیے، لیکن افسوس ہے کہ ان کے سامنے بھی ہندوؤں کی پولیٹیکل جدوجہد کے سوا کوئی مستقل اور علیحدہ راہ نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی ترقی کا سدِ رواۃ بنتی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہندوؤں کے قدم قدم چلنا سیکھ جائیں بے شک ہمارے عقیدے میں بھی آج کل مسلمانوں کے لئے عبرت و تنبیہ کا سب سے بڑا سبق ہندوؤں کے سیاسی اعمال میں ہے اور بڑی باریک بینی سے بھی کہ آج تک اس سے عبرت حاصل نہیں کی گئی، لیکن پیردان "امام مبین" کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مذہبی موت نہیں ہو سکتی کہ اعمال و زندگی کے ایک ضروری شعبے میں ان کو اسلام تعلیم دینے سے مجبور و لاچار ہو گیا ہو، اور اس کی طرف سے مایوس ہو کر انھیں ایک دوسری قوم کے دستِ خوان کی چوڑی ہوئی بلڑیوں

پر لپکانا پڑے۔ اگر ایسا ہی ہے، تو یہ بت رہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبہ کھاج میں چند آیتیں بڑھ دینے، یا بستر نزع پر سورت یا سین کو دہرا دینے ہی کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک اسلام کے دامن تقدیس پر اس سے بڑھ کر اور کوئی بدناما و صہ نہیں ہو سکتا کہ انسانی حریت اور ملکی فلاح کا سبق مسلمان دوسری قوموں سے لیں۔ اس بارے میں ہمارے خیالات الحمد للہ، عام خیالات کی سطح سے بہت بلند ہیں اور گو موقع نہیں، مگر ضمناً ان کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہو۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جس طرح اسلام کا خدا اپنی ذات و صفات میں "وحدہ لا شریک" ہو کوئی مہنی اور وجود اس میں شریک نہیں اسی طرح اس کا قرآن کریم اپنی جامعیت اور کمال تعلیم میں "وحدہ لا شریک" ہے۔ اور بالکل اسی طرح اس کا لسنے والا رسول کمال انسانیت و تعبد اور قوائے نبوت و اصلاح میں بھی "وحدہ لا شریک" ہو۔ ان کی صفات و خصائص میں کوئی ان کا شریک نہیں۔

راہ نسبت طلبی ہیں کہ چہ شایاں رفتم

پس ضرور ہے کہ جو امت اس خدا کے واحد، اس قرآن واحد، اس رسول واحد کے دامن تعلیم سے وابستہ ہو، وہ بھی اپنے اندر اس شان وحدت و یکتائی کا جلوہ رکھے۔ وہ بھی اپنے اعمال زندگی کی ہر شاخ میں "وحدہ لا شریک" ہو۔ اس کے اعمال و خصائص بھی "من ذاتی فقد داء النحت کی صدائے اتحاد سے غلغلہ انداز عالم ہوں۔ تمام دنیا کی قومیں اس کے اعمال کا اتباع

کریں۔ زندگی کے ہر حسن و جمال میں اس کے خال و خط مرقع عالم کے لئے نمونہ بنیں
وَلَقَدْ لَئِكَ جَعَلْنَاهُ آئَةً وَمَسْطَا
مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا؛

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ تَقْوَا
اللَّهِ يُجْعِلْ لَكُمْ قُرْبَانًا
مسلمانوں اگر تم اللہ کا خوف اپنے اندر
پیدا کر کے منتفی بن جاؤ گے تو وہ تمہارے
لئے تام و ثنائیں ایک خاص امتیاز اور
(۸: ۹۲)

خصوصیت پیدا کر دے گا۔

جس قوم کو اس عداۓ الہی نے مخاطب بنایا ہو، اس کے لئے اسے
بڑھ کر کیا بر بخنی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ہر شاخ میں غیروں کے لئے نمونہ
بنے کی جگہ، خود دوسروں کو اپنا کعبہ مقصود اور قبلہ آمال بنا رہی ہے؛ یہاں
بحث تو ضمنی ہے، ہمارا اصلی ماتم صرف اتنے ہی پر موقوف نہیں، ہم کو تو یہ
نظر آ رہا ہے کہ آج مسلمانوں کے لئے تعلیم، اخلاق، معاشرت، سیاست بلکہ
مدنی زندگی کی ہر شاخ میں ان کے لیڈر صرف اسی کو فرض رہنمائی سمجھتے ہیں کہ
ان کے آگے دوسری قوموں کے اعمال پیش کریں۔ تہذیب انسانیت کی ضرورت
ہے تو مسلمان یورپ کی شاگردی کریں۔ پولیٹیکل آزادی کی ضرورت ہے تو اپنی
ہمسایہ قوموں سے بھیگ مانگیں۔ پھر ہمیں بتلایا جائے کہ خود بد بخت مسلمانوں کے
پاس بھی کچھ ہے یا نہیں؟ جو مسلمانوں کے رہنما قوم کے جلب قلوب کے لئے مذہب
کے ذکر کو ناگزیر دیکھ کر، اپنے شاندار اسٹیجوں پر مذہب! مذہب! اور سلام!
اسلام! پکارتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ خود ان کی زندگی میں اس اسلام

کا اثر کہاں تک موجود ہے۔ ہم بوجھتے ہیں کہ انھوں نے کبھی قوم کو یہ بھی بتلایا ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں خود اسلام کا نمونہ کھسا ہے ؟ اور اگر نہیں بتلایا ہے تو قوم کے لئے ایک سچی رہنما اور ایک مسلمان لیڈر میں کیا فرق ہے ؟ پچہ پچہ کہ وہ غریب خود جس متاع سے تہی دست ہیں، دوسروں کے آگے کیا پیش کریں گے
خفتہ را خفتہ کے کند بیدار ؟

بہی بنیادی گمراہی ہے، جس نے جسم ملت کی ریڑھ کی ہڈی دم کو ٹھلا دیا ہے۔ مسلمان اگر مسلمان ہوتے، تو سمجھتے کہ ان کے لئے خود ان کے سوا دنیا میں اور کوئی نمونہ نہیں ہو سکتا۔ اگر فی الحقیقت دنیا کی کسی قوم کے پاس کوئی عمدہ خیال کوئی واقعی سچائی، اور کوئی اچھا عمل پایا جاتا ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بدرجہ اولیٰ اسلام میں موجود ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اس کی اچھائی بھی قابل تسلیم نہیں۔ اسلام کے معنی کی اصلی وسعت سے دنیا بے خبر ہے۔ اسلام تو عقائد و عمل کی ہر صداقت اور کائنات کے ہر حسن و جمال کا نام ہے۔ جہاں کہیں صداقت اور جمال موجود ہے، یقین کرنا چاہئے کہ وہ اسلام ہے، گو دنیا کو اس کی خبر نہ ہو واللہ درمآقال

عبارت ناشی، حسنک واحد

دکل الی ذاک الجمال بشیر

اللہ اللہ! خدا تو مسلمانوں سے چاہتا ہے کہ مجھ کو نمونہ بناؤ، اور میری صفات کاملے سے مشابہت پیدا کرو (تخلقوا بأخلاق اللہ) اور کج مسلمان ہیں کہ انسانوں کو اپنا اسوۂ حسنہ بناتے ہیں کہ (تخلقوا بأخلاق الاخری)

در اگر کوئی اُن کی نقالی بناتی ہے تو "انلا فرنج" کا نعرہ لگا کر اس قدر
 اڑاں ہوتے ہیں، کہ حسین بن منصور کو "انالحق" پر بھی انا ناز نہ ہوگا!!
 كَذَلِكَ يَجْصَلُ اللَّهُ الرَّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ.

اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان جس قدر اصلاح کی طرف قدم بڑھاتے ہیں، اتنی
 ہی ضلالت اُن سے قریب تر رہتی جاتی ہے۔ وہ جس قدر ترقی کرتی، ترقی پہنچتا
 ہیں، اتنی ہی تنزل، تنزل، تنزل، کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ گویا دلدل میں پھنس
 گئے ہیں، جس قدر زور کرتے ہیں، اتنا ہی پاؤں اور دھنسا جاتا ہے یا ان
 کے رشتہ فلاح میں بدبختی کی گرہ بڑھتی ہے، جس قدر پہنچتے ہیں، اتنی ہی وہ اور
 زیادہ گئی جاتی ہے۔ اَوْ كُطِلْتُمْ فِي نَجْدٍ تَجِيءُ يَحْشَاهُ مَوْجٌ، مِّنْ فَوْقِهِ
 مَوْجٌ، مِّنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ، طَلْتُمْ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ، اِذَا الْخُرُجُ
 يَدُهُ لَمْ يَكُنْ يُرَاكَهَا - وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نَافِئًا لِّمِنْ تُؤَدُّ (۳۶:۳۷)

جو قوم خدا سے اپنا رشتہ کوٹ دیتی ہے اور اس کے فرمان و احکام
 سے روگردانی کرتی ہے، اس کے اعمال نور الہی سے خالی ہو جاتے ہیں۔ اس
 پر ضلالت و گمراہی کا ایک شیطان مسلط ہو جاتا ہے اور وہ اس کو اپنا مرکب
 بنا کر اس کے گلے میں اپنی اطاعت کی زنجیریں ڈال دیتا ہے۔

وَمَنْ يَعْشَ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ يَقِصْ
 لَمَشَيطَانًا فَهُوَ لِقَرِينٍ (۳۶:۳۷) ہے ہم اس پر ضلالت کا ایک شیطان

متعین کر دیتے ہیں جو اس کے ساتھ رہتا ہے۔

پھر وہ یکسر گمراہی اور ضلالت ہو جاتی ہے، اس کی زندگی ناکامی و

نامرادی کی تصویر بن جاتی ہے۔ وہ طلب مقصود میں آوارہ گردی کرتی ہے مگر چونکہ مقصود تک پہنچنے والے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہیں ہوتا، اس لئے کبھی مقصود تک نہیں پہنچتی۔ مسلمانوں کے تمام ترقی کے دلوں اور اصلاح کی کوششوں کا بھی یہی حال ہو رہا ہے۔ نامرادی کے سوا انھیں کچھ حاصل نہیں۔ ان کے لیڈر بانی کو ڈھونڈتے ہیں مگر دوڑتے ہیں ریگ زار کی طرف :

ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے
اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ لِّقَيْعَةٍ يَّجْتَبِي
چٹیل میدان میں چلنا عواریت ہونا
الظِّلَانِ مَاءٍ حَتَّىٰ اِذَا جَاءَهُ
ہے کہ پیاسا دور سے اس کو پانی سمجھ کر
لَحْمُ خَيْلٍ مِّنْ اَشْيَا (۲۴: ۳۹)

جلا، گریب پاس آیا تو کچھ بھی نہ تھا۔

عود الی المقصود

پس اگر مسلمان زندگی حاصل کر سکتے ہیں تو مسلمان بن کر، منہ دیا سچی بن کر نہیں۔ آپ کے ہاں اگر شمع کا فوری جل رہی ہے تو آپ کو کسی فقیر کے جھڑپ سے اس کا ٹٹاٹا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے ؟ پھر یہ بھی ہے کہ فرض کیجئے کل ہندوؤں کو اپنی پالیسی بدل دینی پڑی تھی راہیں انسانی داغ کی پیدا کردہ ہیں ان میں تغیر و تبدل ہر وقت ممکن ہے، البتہ خدا کی تعلیم میں ممکن نہیں کہ لَا تَبْدِلُ اِلَّا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ پھر کیا اس حالت میں مسلمان بھی اپنے امانوں کے ساتھ اپنی نمازیں توڑ دیں گے ؟ ذرا غور سے کام لیجئے کہ گہری اور ناسکری طلب باتیں میں ہم مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ کسی اصول پر مبنی ہو، لیکن وہ ایک ایسی راہ پیدا کر لیں جو ان کی مستقل اور

مخصوص راہ ہو جس میں کبھی تغیر کی ضرورت نہ ہو، تمام خارجی اثرات تغیر سے محفوظ ہوں نیز کہا جاسکے کہ وہ مسلمانوں کی راہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ محض خارجی حالات کے تابع ہو کر آپ اپنے تئیں بالکل بھول جائیں۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی پالیسی صرف گورنمنٹ کے انداز نظر کا نام ہو۔ لطف و مہر کی بہار اُسے تو آپ کی پالیسی دوسری ہو۔ اغماض و اعراض کی باد خزاں چلے تو آپ کا آسٹھیا نہ دوسری جگہ بن جائے تقسیم بنگال کی تقسیم و ترکیب اور یونیورسٹی کا الحاق و عدم الحاق آپ کی پالیسی کو تیار نہ کرے۔ بلکہ آپ کے منقسم اقلیم و ملکا اتصال اور آپ کے شکستہ رشتہ الہی کا الحاق، آپ کے لئے ایک داکمی اور ناممکن التبدیل پالیسی چھپا کر دے۔

(۲)

مسلمانوں کا نصب العین کیا ہونا چاہیے؟

پالیٹکس جس کی طرف اب مدتوں کی غفلت کے بعد مسلمانوں نے شیفٹی کی نظر اٹھائی ہے، قومی زندگی کے اعمال کا ایک سب سے بڑا شعبہ ہے لیکن ہم اسے مسلمانوں کے لئے کوئی اصلی مقصود اور بنیادی شے نہیں سمجھتے۔ اور قوموں کے لئے اگر سیاست اُن کے تمام اعمال کی بنیاد ہے، تو اس لئے کہ زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے لئے وہ سیاسی بنیاد سے ایک گرم آگنیٹھی کا کام لیتے ہیں، لیکن جس قوم کے پاس ایک شعلہ فشاں آتش کدہ موجود ہو، اُسے آگنیٹھی کی کیا ضرورت ہے۔

جب تنور گرم ہو جاتا ہے تو بہت سی انگٹیاں اس سے گرم کر لی جاسکتی ہیں لیکن انگٹیاں تنور کا کام نہیں دے سکتی۔

اس وقت برسوں کے جمود نے کر دٹی ہے اور گویا انقلاب و تغیر کا ایک اچھا موسم مسلمانوں پر گزر رہا ہے۔ اس وقت جس چیز کی تخم ریزی کر دی جائے گی، اُس کے چل کر اُسی کے پھل کو اپنے دامن میں دیکھ سکیں گے۔ پس اس بلے میں میری دعوت کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان محض پالیٹکس ہی کو اپنا مقصود حقیقی نہ بنائیں اور اس طرح ایک عمدہ موسم کو، جس میں وہ شاید ایک پورا باغ لگا سکتے ہیں، صرف ایک درخت ہی کے بونے میں ضائع نہ کر دیں۔ دوسری قوموں کی نظیروں پر نظر رکھنا اُن کے لئے کچھ سودمند نہیں ہو سکتا۔ ان کو صرف اپنے اوپر نظر رکھنی چاہئے، کیونکہ ان کے پاس ایک شے ہے، جو ادوروں کے پاس نہیں ہے اور جس کو اپنا مقصود بنا کر وہ ان تمام چیزوں کو بھی بوجہ احسن و اکمل لے سکتے ہیں، جو ادور قومیں حاصل کر رہی ہیں۔ ان کو چاہئے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس شے کو اپنا اصل مقصود اور نصب العین بنائیں، جس کی تلاش میں انھیں گھر سے نکلنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہمیشہ سے وہ خود ان کے گھر کے اندر موجود ہے۔ یعنی صرف انبعاث دینِ حسین اور اعتصام بجلالِ الدالین ان کے لئے اُن کے خدا کی طرف سے ایک دائمی مقرر کردہ نصب العین ہے، اور ایک مسلم ہستی کے لئے اس کے سوا کوئی مقصود حقیقی نہیں ہو سکتا۔ نہ پالیٹکس، نہ تعلیم، نہ اخلاق، اور نہ معاشرت، کیونکہ زمین پر جس قدر کمال اور جمال ہے، وہ سب اس سے ہے، یہ کسی چیز سے نہیں۔ دنیا میں جس قدر خوبیاں

اور محاسن ہیں، سب اس کے نیچے ہیں، کیونکہ اس کے اوپر الوہیت کے درجے کے سوا اور کوئی درجہ نہیں۔ دنیا میں جس وقت سے انسانی ہدایت و شقاوت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، صرف یہی ایک ضراطِ مستقیم اور ملتِ قریم تمام انسانی فلاح و صلاح کا وعدہ لاشریک وسیلہ رہی ہے۔

رَقَالُوا كُذِّبُوا هُوَذَا اَوْفَادُ
عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ يُلْقُونَ
حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
فَوَلَّوْا اٰمَنًا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ
اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَى الْاِبْرٰهِيْمَ
وَالِصَّمْعِیْلَ وَالْحُثُیِّ وَیَعْقُوبَ
وَالْكَاسِبَاتِ، وَمَا اَوْحٰی مُوسٰی وَ
عِیْسٰی، وَمَا اَوْحٰی النَّبِیُّوْنَ مِنْ
رَبِّهِمْ لَا تَفْرِقْ بَيْنَ اٰحَدٍ مِنْهُمْ
وَمَنْ لَّهُ مُسْلِمُوْنَ

اور یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہودی یا
عیسائی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے (یعنی
اسلام کے سوا اور طریقے اختیار کرو)
اے پیغمبر کہہ دے کہ کبھی نہیں! ہمارے
لئے تو صرف براہیم کی کاہنسیقہ طریق ہدایت
ہے۔ اور اے مسلمان تم بھی کہہ دو کہ ہمارے
طریق ہی ہے کہ اللہ پر ایمان لائے ہیں
اور قرآن پر، جو ہم پر امتزاج اور اس
تعلیم پر جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق،
یعقوب اور اولاد یعقوب پر امتزی

اور موسیٰ اور عیسیٰ کو جو تعلیم دی گئی۔ اور انہیں پر موقوف نہیں، بلکہ دراصل اور
تمام پیغمبروں اور رسولوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو تعلیم دی گئی، ان سب
کی تعلیم ایک ہی طریق اسلام کی تھی۔ پس ہم ان میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے
کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔

تَرَجُّوا النِّجَاتِ وَلَكُمْ تَسْلُكٌ مَّا لَكُمْهَا اِنَّ السَّفِيْنَۃَ لَا تَجْرِيْ عَلٰی الْيَبَسِ
 اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولیٹیکل پالیسی تیار کر لی ،
 کانگریس سے بھی بہتر ایک پروگرام اُن کے ہاتھ میں ہوا ، اُنٹریٹڈ کے حکومت
 طلبوں سے بھی بڑھ کر جوش اور سرگرمی پیدا کر لی ، پالیٹکس میں وہ از سر پائے
 غرق ہو گئے ، ان کا ہر فرد گلیڈ اسٹون اور مارے ہو گیا ، لیکن ساتھ ہی گرائفلز
 نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلام کی عملی روح پیدا نہ کی ، اپنے
 تیس دین الہی کی سلطنت کے ماتحت داخل نہ کیا ، اور خشیت الہی اور نزاد و نفی
 سے محروم رہے ، تو میں اُس یقین کی لازوال طاقت کے ساتھ جس کے لئے کبھی
 موت اور شکست نہیں ، اس بصیرت الہی کے ساتھ جس میں کبھی تزلزل اور تذبذب
 نہیں ، از سر پائے صدائے ربانی بن کر کہتا ہوں کہ اگر آگ جلاتی ہے ، اور پانی ڈباتا
 ہے ، اگر آفتاب مشرق سے نمودار ہوتا ، مگر مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے
 اگر مچھلی خشکی میں ، اور پرند دریا میں زندہ نہیں رہ سکتا ، اگر قوانین فطریہ
 اور نوا میں طبعیہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ، اور اگر یہ سچ ہے کہ دو اور دو پانچ
 نہیں ، بلکہ ہمیشہ چار ہوتے ہیں ، تو یہ بھی کبھی نہ ٹٹنے والی صداقت ، اور صفحہ
 کائنات پر نقش سنگی ہے کہ مسلمانوں کو یہ تمام نرمی سیاسی ہنگامہ آرمیاں تعلیم و
 تربیت کا غوغائے مٹھر خیز ، اور پولیٹیکل پالیسی کے تغیر و تبدل کا ہیجان طوفان
 آور ، ایک لمحہ ، ایک دقیقہ ، ایک عشر و دقیقہ تک کے لئے بھی کچھ نفع نہیں پہنچا سکے
 گا۔ ان کی نام جدوجہد بے کار ہو جائے گی۔ تغیر کا ابران پر سے بغیر ایک قطرہ
 بارش کے گزر جائے گا۔ ان کی امیدوں کی خشک سالی بدستور ربانی ہے گی۔

وہ جس قدر سعی رہائی کریں گے، اتنا ہی چاروں طرف کی پٹی ہوئی زنجیروں کی بندش سخت تر ہونی جائے گی، مگر اسی وضالت کا شیطاں کہی ان سے الگ نہ ہوگا۔ ان کے گلوں میں جو طوق مذلت، اور پاؤں میں جو زنجیر اور بار و تسفل پڑی ہوئی ہو وہ قیامت تک نہ ٹوٹے گی۔ جہالت و ضلالت، اُسرو غلامی، ذلت و خواری کی صفوں میں ہمیشہ محصور رہیں گے، اور دنیا میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو قوی عزت کا چہرہ دکھنا نصیب نہ ہوگا: **خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ذِيْلِكَ هُوَ الْخَيْرُ الْمُبِينُ**۔

اِنَّ الدِّينَ كَذَبُوْا يَا نِسَاءَ
اَسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا، لَا تَقْنَعُوْا لَهَا الْوَلَدُ
السَّامِیَّ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
حَتّٰی یَلْجِ الْجَحْمُ فِی سَمِّ
النَّحِیْطِ، وَكَذٰلِكَ نَجْزِی
الْمُجْرِمِیْنَ (۱)۔

جن لوگوں نے ہماری آبیوں کو جھٹلایا
اور جھکنے کی جگہ غرور سے اڑا بیٹھے تو یاد
رکھو کہ ان کے لئے نہ تو آسانی برکت
کا دروازہ کبھی کھلے گا اور نہ تو بہشت
کی زندگی انہیں نصیب ہوگی۔ ہاں
اگر ایسا ہو سکتا ہے کہ سوئی کے ناکے

میں سے اہٹ گذر جائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہماری آیات کو جھٹلا کر پھر فلاح و برکت بھی حاصل کر سکیں۔

میں نے کہا کہ ”اگر آگ جلاتی اور پانی ڈبانا ہے“ نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ تو ممکن ہے کہ آگ نہ جلانے اور پانی نہ ڈبانے، مگر یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ خدا کا وہ قانون شقاوت و ہدایت بدل جائے، جس کے لئے ابد اسے خلقت بنی آدم سے آج تک تاریخ میں کوئی متغیٰ شہادت موجود

نہیں۔ یہ میں لکھ رہا ہوں، اور میرے اندر یقین اور اعتقاد کی ایک آواز ہے۔
 مضطرب ہے، مگر افسوس کہ اس کی ترجمانی کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ حیران
 ہوں کہ کیوں کر، اور کن لفظوں میں اپنا دلی یقین آپ کے دلوں میں بھی پیدا
 کر دوں؟ تاہم میں یہ کہنے سے کبھی نہ ٹھکوں گا، کہ جن احکام اسلام کو آپ نہایت
 بے پردائی سے ایک مذہبی بندش کہہ کر گزر جاتے ہیں، وہ بندش تو ضرور ہے
 مگر ایک ایسے قانون کی بندش ہے، جس کی سلطنت تمام قوانین مادیہ کے نظام
 حکومت سے بالاتر اور ورار اور ہے، اور نظم کائنات کے تمام اجزاء کا
 بندش سے بندھ کر مرتب اور منظم ہوتے ہیں۔ یہی بندش ہے کہ لسان الہی نے اس
 کو کہیں ”حدود اللہ“ کے لفظ سے یاد کیا ہے، کہیں ”سنۃ اللہ“ کے لفظ سے تعبیر
 کیا ہے، کہیں ”فطرۃ اللہ“ اس کا نام رکھا ہے، کہیں ”صراطِ مستقیم“ کہا ہے، اور
 کبھی ”دینِ قریم“ کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت ایک بانی حکومت
 کا انتظام ہے، اور جب کوئی فرد یا قوم اس کے تحت و تسلط سے نکل جاتی ہے
 تو وہ گویا خدا کے ساتھ اعلان جنگ کر دیتی ہے۔ پھر اس کی زندگی اور زندگی
 کے تمام اعمال یکسر بغاوت اور سرکشی ہو جاتے ہیں، اور وہ رجحانی سلطنت کو
 نکل کر شیطانی حکومت میں داخل ہو جاتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: مَا تَعْبُدُونَ
 خدا کہتا ہے کہ اے انسان حنفیہ!
 بِرَبِّكَ الْكَوْبَرِ (۱۸۲: ۶) بتلا کہ کس چیز نے تجھ کو اس پر

آادہ کر دیا کہ اپنے رب کریم سے بغاوت کر دے۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک باغی انسان کو کوئی گورنمنٹ پناہ نہیں دے سکتی۔

اسی طرح رب السموات والارض کی بغاوت اور قانون شکنی کے بعد بھی کائنات کا ہر دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔ کسی سعی میں وہ کامیاب نہیں ہوتا، اور کوئی کوشش اس کی فلاح یاب نہیں ہوتی۔

وَمَنْ يَكْتُمِبْ عَنِ الْإِسْلَامِ
جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسری تعلیم
دینا، فلن يقبل منه وهو في
کو تلاش کرے گا، اس کی سعی تلاش
الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۳-۲۷)
کبھی مقبول نہ ہوگی۔ اور اس کے تمام

کاموں کا آخری نتیجہ ناکامی و نامرادی ہوگا۔

قرآن مجید نے اُم سابقہ اقوام پیشین کا تذکرہ بار بار کیا ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ اس "قانون ہدایت و شقاوت" کے نتائج پر انسان کو توجہ دلائی جائے۔ جا بجا ان اقوام متہذہ و عظیمہ کے طرف اشارہ کیا ہے جو اُنے والی اقوام سے زیادہ قوی اور مستحکم تمدن رکھتی تھیں۔ لیکن جب انھوں نے احکام الہیہ کو پس پشت ڈال دیا، اور خدا کی حکومت میں رہ کر اس سے بغاوت اور سرکشی شروع کر دی، تو کوئی انسانی سعی و تلاش فلاح ان کو ہلاکت و بربادی سے نہ بچا سکی۔ یہاں تک کہ آج اُن کے آثار و اطلال بھی دنیا میں باقی نہیں رہے۔

کیا یہ لوگ زمین پر چلتے پھرتے نہیں؟
اگر پھرتے تو دیکھتے کہ جو قومیں اُن سے
پہلے ہو گزری ہیں، ان کا کیا انجام ہوا؟
یہ وہ قومیں تھیں، جہاں سے تم آئے۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ
ثَوْرَةً وَآثَارُوا الْأَرْضَ مِنْ أَعْمَرُهَا

اَلْاَكْثَرُ مِمَّا عَمِلُوْهُمَا، وَجَاءَهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانَ
اَللّٰهُ بِظَهِيرِهِمْ وَلٰكِنْ كَانُوا اَللّٰفِسِمْ
يَظْلِمُوْنَ (۳۰-۸)

ترقیات اور فوسائے جہانی میں بڑھ کر
قوی تھیں، انھوں نے زمین پر اپنے
کاموں کے نشان چھوڑے، اور جس قدر
تم نے اس کو متمدن بنایا ہے اس سے

کہیں زیادہ انھوں نے تمدن پھیلایا۔ لیکن جب ہمارے رسول ان میں بھیجے گئے
اور ہماری نشانیاں ان کو دکھائی گئیں تو انھوں نے سرکشی اور بغاوت سے
جھٹلادیا، اور برباد و فساد برپا کر گئے۔ خدا ظلم کرنے والا نہ تھا، لیکن خود انھوں نے
اپنے اوپر ظلم کیا۔

یہی اسلام وہ قانون "حیات و ممات اقوام" ہے جس کی طرف قرآن
نے جا بجا اشارہ کیا ہے :

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِی الْاَرْضِ
وَلَا فِیْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ
مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرٰکَهَا۔ اِنَّ
ذٰلِکَ عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرٌ
(۵۸:۲۲)

یعنی مصیبتیں اقوام و مملکتوں پر نازل ہوتی
ہیں اور جو خود تم پر نازل ہوئیں وہ
سب ہم نے پہلے سے ایک کتاب میں
لکھ رکھی ہیں (یعنی پہلے سے وہ بصورت
ایک قانون متعین کے موجود ہے۔)

اور ایسا کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔

کائنات میں حیات و قیام صرف مسلم کے لئے۔

اور غور کیجئے تو یہ کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے، جس کا لئے زیادہ دلائل
آرائی مطلوب ہو، اور اگر مطلوب ہے تو اس لئے کہ دنیا میں آج اسلام

پروؤں ہی کے لئے سب سے زیادہ اسلام کی دعوت معاہور سی ہے ہلا کہ
 تو فی الحقیقت ان قوائے فطریہ کے صحیح استعمال کا نام ہے، جن کی حکومت سو
 دنیا کی کوئی شے خارج نہیں۔ مچھلی کے لئے پانی میں تیرنا، پرندوں کے لئے ہوا
 میں اڑنا، نباتات کا زمیں میں نشوونما پانا، اور انسان کا زمین کے اوپر
 رہنا، یہ سب چیزیں اسلام کے مفہوم حقیقی میں داخل ہیں کیونکہ اس کا
 دوسرا نام "سنت اللہ" اور "فطرۃ اللہ" ہے۔ پھر کیا مچھلی پانی کی جگہ ہوا
 میں، پرند ہوا کی جگہ پانی میں، اور انسان زمین کو چھوڑ کر سمندروں میں
 زندہ رہ سکتا ہے؟ اگر نہیں رہ سکتا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا میں
 کوئی شے غیر مسلم ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ حیات اور زندگی صرف مسلم کے
 لئے ہے۔ اور جو قومیں زندہ ہیں، گو ان کو معلوم نہ ہو۔ مگر ہم کو معلوم ہو
 کہ وہ اسلام ہی کے سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہیں۔ یہ اپنی بد بختی ہے کہ
 پاس رہ کر بھی ہم تشنہ لب ہیں :

کیا وہ لوگ دین الہی کو چھوڑ کر کسی
 اور تعلیم کو اپنا حاکم بنانا چاہتے ہیں؟
 حالانکہ اس آسمان اور زمین میں کوئی
 نہیں جو چارنا چار اسی دین اللہ کا

أَفَعِثَ دِينَ اللَّهِ يَتَّبِعُونَ
 وَلَئِنْ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ
 الْأَرْضِ مِنْ طَوْعًا وَكَرْهًا، وَإِلَيْكَ
 يُرْجَعُونَ (۳۱: ۲۴)

مسلم، یعنی حکم بردار نہ ہو۔
 اَوْحَلُوا فِي السَّلَامِ كَافَّةً

پس بار جو داس کے کہ ہم پولیٹکل زندگی کو حیات ملی کا ایک ضروری

شعبہ سمجھتے ہیں، باوجود اس کے کہ ہمارے نزدیک کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کے اندر سیاسی جذبات مشتعل نہ ہوں، اور باوجود اس کے کہ ہم رزادول سے مسلمانان ہند کی ایک بڑی بدبختی بہ قرار دے رہے ہیں کہ ان کے لیڈروں نے غلامی و خدشاہد کی دادرے بے ہوشی سے قوم کی قوم کو مرض النوم میں مبتلا کر دیا، ہم مسلمانوں کو کبھی یہ صلاح نہیں دیں گے کہ وہ صرف پولیٹیکل آزادی کے دعوے ہی کو پیدا کر کے اصلاح و تغیر کی طرف سے فارغ ابال ہو جائیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے پولیٹیکل پالیسی کے تغیر میں کوئی برکت نہیں ہو سکتی، اگر ان کے اندر مذہبی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ بخار کے مریض کے لئے ڈاکٹر کے آگے یہ سوال نہیں ہوتا کہ اس کا جسم گرم کیوں ہے؟ اور آنکھوں میں سُرخ کیوں ہے؟ بلکہ اس پر غور کرتا ہے کہ بخار کی تولید کی اصلی علت کیا ہے؟ اگر آپ صرف مریض کے جسم کی حرارت ہی کے شاکلی ہیں۔ تو زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں، ایک من برف منگو کر اُس کے ریزوں میں اسے بٹھا دیجئے، اُمید ہے کہ سارا جسم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ آپ کہتے ہیں کہ مسجد کا منارہ سیدھا نہیں، میں روتا ہوں کہ بنیاد ٹیڑھی ہے۔ آپ صرف بالٹکس کو کیوں ڈھونڈتے ہیں، جبکہ ایک ایسی مضبوط اور لازوال کرسی آپ کو ملتی ہے، جس پر نہ صرف بالٹکس، بلکہ قومی زندگی کی عمارت کے تمام ستون کھڑے ہو سکتے ہیں، اور ستون کے لئے کرسی ناگزیر ہے۔ مسلمانوں کے لئے اولین کام۔

پس موجودہ تغیر کے بعد اب مسلمانوں کو سفر اسی منزل سے

شروع کرنا چاہیے جو ان کے سفر کا قدرتی مبداء ہے، اور جہاں سے ان کو پچھلا سفر شروع کرنا تھا، مگر انھوں نے نہیں کیا۔ ان کو نہ تو پوچھ سچا پوچھ کی تلاش و جستجو میں وقت ضائع کرنا چاہیے، نہ اعلیٰ تعلیم کے افسانہ لافٹائی میں پڑنا چاہیے، نہ لیگ کے غلامانہ اور موت آور بالٹیکس پر توجہ کرنی چاہیے اور نہ کانگریس کی رپورٹوں میں اپنے لئے نسخہ فلاح ڈھونڈنا چاہیے۔ ان کو صرف ایک ہی کام کرنا چاہیے، یعنی بلا یہ سوچنے ہوئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں، اپنا ہاتھ دست الہی میں دیدینا چاہیے:

می بردہر جا کہ خاطر خواہ دوست

نہ وہ بالٹیکس کو سوچیں اور نہ تعلیم کو، نہ آزادی کی بیج کریں اور نہ غلامی کا طوق پہنیں یہ باتیں ان کے سوچنے یا فیصلہ کرنے کی نہیں ہیں۔ ان کا فیصلہ خدا کو کرنا تھا، اور اسے مکر کیا۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اتباع کلمات اسد جمیع "اجالہہ القرآن کے لئے تیار ہو جائیں اور اپنے نہیں نام انسانی تعلیموں اور اقوام کے اتباع و محاکات کے ذریعہ سے خالی کے صرف اُس ایک ہی معلم کی تعلیم پر چھوڑ دیں۔ اگر اسلام ان کو بالٹیکس میں بلانا چاہے تو لبیک کہہ کے دوڑ جائیں اگر وہ اس سے اجتناب کی تعلیم دے تو ہمارے ساتھ ہی معتصب ہو جائیں۔ اگر وہ کہے کہ غلامی اور خوشامد، دوسری چیزیں اصلی ذریعہ فوز و فلاح ہیں تو سرسے پاؤں تک غلامی کی تصویریں جائیں۔ اگر وہ کہے کہ آزادی اور حقوق طلبی ہی میں قومی زندگی اور عزت ہے تو ان کا وجود یکسر ہیکر حریت و جہد حریت ہو جائے۔ اخلاق، تعلیم، تمدن، شائستگی اصلاح معاشرت، غرض کہ ایک ستمدن زندگی کے جتنے اجزاء ہیں، ان میں وہ

جس طرف بلائے۔ اسی طرف جھک جائیں۔ خود ان کی کوئی خواہش، کوئی ارادہ کوئی تعلیم، کوئی پالیسی نہ ہو۔ اُن کی خواہش اور پالیسی صرف اتباعِ قرآن ہو وہ اس نکتے کی طرح جس کو کسی بحرِ طوفانِ خیز میں ڈال دیا گیا ہو، اپنے تئیں تعلیمِ الہی کے سمندر میں چھوڑ دیں۔ جس طرف نہ چاہے، لے جائے، اور جس کٹائے سر چاہے انھیں لگا دے۔ جب خدا ان کا تمام بوجھ اپنے سر لیتا ہے تو وہ خود اپنے کا ندھوں کو کیوں تھکاتے ہیں؟

اگر مسلمانوں نے ایسا کر لیا، (اور وعظہ الہی ہے کہ وَالَّذِينَ جَاهَلُوا فِينَا لِنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) تو وہ یاد رکھیں کہ آج جن چیزوں کے لئے بھٹک رہے ہیں، اور نہیں ملتیں، اگر ان کا مطلوب حقیقی یعنی اسلام ان کو مل گیا تو وہ خود بخود ان کے قدموں پر آکر گر جائیں گی۔ ان میں سے ایک ایک کی تلاشِ جستجو کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت گمراہ ہو چکے، جو سرعت کی سرینڈ کا کے لئے بنا تھا بہت ٹھکرایا جا چکا۔ اب بھی سنبھل جائیں کہ خدا کا ہاتھ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ وہ اُسے چھوڑ کر شیطان کے ہاتھ پر کیوں بیعت کرتے ہیں؟ ان کے نام اعضاءِ مردہ و غیر متحرک ہو رہے ہیں لیکن اس کے لئے سر میں تیل کی ماش یا تلے کا سہلانا اصلی علاج نہیں ہے۔ ان کو روح کی ضرورت ہے۔ جس دن، جس آن، جس لمحے، ان میں اسلام کی گم گشتہ حرارتِ عزیزی عود کر آئے گی، اسی وقت پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر سر کے بالوں کی جڑ تک، اُن کا تمام جسم زندہ ہو جائے گا۔ ان کا اخلاق، ان کا تمدن ان کی سوشل حالت، ان کی سوسائٹی کا نظام، اور سب سے آخر

مگر سب سے پہلے یہ کہ ان کی پولیٹیکل حالت، غریبہ حیات ملی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہوگا، جو باحسن شکل و باکمال حال اُن کے پاس موجود نہ ہو جائے :

وَمَنْ يُؤْمَرْ بِالْعَمَلِ إِلَى اللَّهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقَىٰ - وَرَأَى اللَّهُ عَاقِبَةَ الْأُمُورِ
اور جو شخص ہر طرف سے منہ موڑ کر
صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور
ساتھ ہی اعمالِ حسنہ اختیار کئے
تو اس یقین کرو کہ اس نے مضبوطی تمام لی اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں

ہے۔

(۳۶)

احرام عہد روز ازل، اکعبہ کوئے دوست

جز راہ عشق ہر کہ رود بر خطا رود

صحت کے لئے تندرست کو نہیں بلکہ مریض کو دیکھنا چاہیے۔

اگر مریض پچھلی بد پرہیزیوں اور بیماریوں سے تنگ آکر چاہتا ہو کہ آئندہ کے لئے ایک صحیح و تندرست کی زندگی حاصل کرے، تو اس کے لئے حفظِ صحت کی کسی کتاب کے پڑھنے سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ اپنی بیماریوں اور پچھلی بد پرہیزیوں کا مطالعہ کرے۔ مسلمان اگر آئندہ اپنی حیات ملی کو بیماریوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے پہلا کام یہ ہے کہ اپنے گزشتہ اور موجودہ امراض، علی الخصوص اپنی بد پرہیزیوں پر نظر ڈالیں، اور آئندہ ان سے بچنے کا سامان کریں۔

مسلمانوں کے نام موجودہ امراض کی اصلی علت جس نے مختلف عوارض کی شکلیں اختیار کر لی ہیں، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انھوں نے تعلیم الہی کے عرودۃ الدنئی کو چھوڑ دیا، اور اس کے ساتھ ہلک بد پرہیزی یہ ہے، کہ سعی اصلاح و ترقی کا جو قدم اٹھایا، وہ مذہب سے الگ رہ کر اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحت و تندرستی ہی سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں میں پرانی تحریک تعلیمی ہے اور نئی سیاسی، لیکن دونوں کا یہی حال ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ پہلی پوری کامیاب نہ ہوئی، اور دوسری اپنی عمر کے چھٹے سال ہی میں بستر نزع پر پائی گئی اب جو کچھ ہے اس کی تجہیز و تکفین کی دھوم ہے کہ کئی کڑ در مسلمانوں کی بچا ہ سالہ "متفقہ اور مسلمہ" پالیسی کے۔

عاشق کا جوازہ ہو ذرا دھوم نہ بکھلے

دین اور دنیا کی تفریق

ہم کو مسلمانوں کی گذشتہ جدوجہد ترقی پر بہت کچھ لکھا ہے، کیونکہ جب تک پچھلی غلطیاں سامنے نہ آئیں، آئندہ کے لئے اُن سے پرہیز ممکن نہیں۔ لیکن یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کل کانفرنسوں میں ہمارے قومی خطیبوں نے بزم آرا میوں کے لئے جو موضوع اختیار کر رکھے ہیں، ان میں ایک برسوں کا پامال مضمون دین اور دنیا کا باہمی تعلق بھی ہے۔ بار بار اس کو دہرایا گیا ہے، اور ہمیشہ زور دے دے کر کہا گیا ہے، کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق کا کوئی سوال نہیں۔ وہ دین کو دنیا سے الگ نہیں کرتا، بلکہ کہتا ہے کہ دین دنیا ہی کے

حسن عمل کا نام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مثل آج کل کے بہت سے اقوال کے یہ قول محض بھی صحیح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اعمال کا کیا حال ہے ؟ وہی دعویٰ اصلاح جو اس صداقت کو زبانی دہراتے ہیں، ان کی از سر تا پا زندگی، اور اُن کی تمام قومی تحریکوں کے اعمال میں بھی اس کا کچھ اثر ہے یا نہیں ؟

حالت یہ ہے کہ خود ہمارے نئے لیڈروں نے دین اور دنیا کے اندر تفریق کی ایک ایسی جھیل حاصل کر دی ہے، جو روز بروز دونوں کناروں کو دور تر کر رہی ہے، اور ان کو کسی طرح ملنے نہیں دیتی۔ انھوں نے قومی اصلاح و ترقی کی جس قدر تمکین شروع کیں، ان کو مذہب سے اس طرح الگ رکھا، گویا نہ تو پیر و انِ اسلام ان کے مخاطب ہیں، اور نہ مسلمانوں کی قوم سے خود انھیں کوئی واسطہ ہے۔ ان کی زندگی، اُن کے اعمال و ان کی آواز، ان کی نظیریں، ان کی مثالیں، ان کے پیش نظر نمونے، بلکہ اُن کے تمام افعال و کردار یکسر اسلام سے بیگانہ، اور از فرق تا بعد مذہب سے ناممکن رہے۔ انھوں نے ہمیشہ دنیا کو دین سے الگ دیکھا، اور جب بھی قدم اٹھایا تو دنیا کی طرف، حالانکہ اگر دین کے طرف بڑھتے، تو دنیا خود اُن کی طرف دوڑتی۔

یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا، وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ
هُمْ غَافِلُونَ (۱۶: ۳۰)

یہ لوگ صرف دنیا کی ظاہری دلفریب ہی کو جانتے ہیں اور آخرت کو بالکل بھولے ہوئے ہیں۔

مذہب سے برا لحاظ آئیں بیگانگی یہاں تک بڑھ گئی ہے، کہ آج اگر کوئی

صدائے قرآنی بند کی جاتی ہے ، تو ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے کہ یہ کیسی آواز ہے ؛ بہت سے اس خیال پر متعجب ہیں کہ مسلمانوں کی پوٹیکل پالیسی بھی تعلیم قرآنی پر مبنی ہو ، (رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا) بہتوں کو یہ کہنے سے نفرت اور غصے کا بخار چڑھ آتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو کچھ قرآن ہی میں ہے اور قرآن ہی سے ہے (قُلْ مَوْتُوا بِغَيْظِكُمْ) اور بہت سی ہیں جو فرعون کے جادو گروں کی طرح خوف زدہ ہو رہے ہیں کہ کہیں مذہب کا عصاے موسوی ثعبان میں بن کر ان کو نگل نہ جائے :

رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ جن لوگوں کے دل مرضِ حلات سے
يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشَى مریض ہو رہے ہیں ، تم ان کو دیکھو
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (۳۹ : ۳۷) گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے خوف
زده ہو کر دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بے ہوشی طاری ہو اور اس کی آنکھیں
بھٹی کی بھٹی رہ جائیں ۔

ہم کسی کی نیت کی نسبت زبان کھولنے کا حق نہیں رکھتے ، لیکن دفعاً اور نتائج بسا اوقات نیت کی پردا نہیں کرتے ، اور حکم نتائج ہی پر مرتب ہوتا ہے ۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ آج کل کے کارفرما طبقے میں بہت سے لوگ اعتقاداً محمد نہ ہوں ، لیکن اس اعتقاد کو لے کر کیا گنجے ، کہ عملاً سر سے پاؤں تک ان کی جس شے کو دیکھئے ، حن الحاد کی دلربائیوں کا یہ حال ہے کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا بس جاست

اور باتوں سے قطع نظر کیجئے، ہمارے اعتقاد میں سب سے بڑی یزدان
فرموشی اور اتحاد پرستی تو یہی ہے کہ ایک گروہ مسلمانوں کی اصلاح کا دعویٰ
کرے، اور پھر اپنے تمام کاموں کے لئے اسلام کو اور اس کے خدا کو چھوڑ
کر انسانی خیالات کے اصنام و طواغیت کو اپنا حکم بنائے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ
اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، يُمِرُّوْنَ اَنْ
يَتِمَّ اٰكُمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ
اُمِرُوْا اَنْ يَكْفُرُوْا بِوَيْدِ الشَّيْطٰنِ
اَنْ يَصْلَبُوْهُمْ صَلٰوٰةً بَعِيْدًا (۲۳:۲۴)

مے پیغمبران لوگوں کو نہیں دیکھتے، جو اس زعم
باطل میں پڑے ہیں کہ ہم مومن و مسلم ہیں حالانکہ
وہ کہہ کر مومن ہو سکتے ہیں جب کہ ان کا حال
یہ ہے کہ خدا کو چھوڑ کر چاہتے ہیں کہ
دوسروں کو اپنا حکم بنائیں۔ حالانکہ
انھیں حکم دیا گیا تھا کہ خدا کے سوا

دوسروں کی اطاعت سے انکار کر دیں۔ اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ انھیں
ہدایت سخت درجے کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔

جن باتوں کو ہمارے لیڈر اسلام سے نا آشنا رہ کر کہتے رہے، اگر
چاہتے، تو انہی باتوں کو وہ اسلام کی زبان سے ادا کر سکتے تھے۔ تعلیم اگر
ضروری تھی، علوم جدیدہ کی اگر دعوت دینا چاہتے تھے، معاشرت میں ضروری
تبدیلی کے خواہاں تھے یا اور عینی باتیں قوم کے آگے پیش کرنا چاہتے تھے، اُن
میں کون سی شے ایسی ہے، جس کے لئے قرآن کریم اور تعلیم الہی کو سامنے نہیں
رکھ سکتے تھے؟ پھر کسی دعوت کے لئے یہ طریقہ موثر تھا کہ انسانوں کی نظیر دی
جائے، یا یہ کہ خدا کا حکم ہے؟ غور کیجئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟

اگر واقعی یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی دین اور دنیا دونوں ایک ہیں، اگر یہ واقعہ ہے کہ وہ قرآن نامی ایک کتاب کے پیرو ہیں، اس میں کوئی دھوکا نہیں کہ خدا کا ایک برگزیدہ رسول تھا جس کے پیش کئے ہوئے احکام اُن کے لئے ذریعہ فوز و فلاح ہیں، تو ہمارے لیڈروں کی حالت اس سے بالکل متضاد ہوئی تھی، جو آج ہم بدبختی سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک ایسی جماعت ہوتی۔ جس کے دل اور زبان دونوں میں اسلام ہوتا، جن کا ہاتھ کسی حالت میں قرآن سے خالی نہ ہوتا، بلکہ قرآن کی گرفت سے اس طرح رُک جاتا، کہ کسی دوسری شے کو اٹھانے کی مہلت ہی نہیں پاتا، وہ از سر تا پا مذہب کی نصوٹ ہوتے، اور یکسر تعلیم الہی کا علمی نمونہ، ان کی ہر صدا مذہب میں ڈوبی ہوتی اور ہر قدم مذہب ہی کی جانب اٹھتا۔ اُن کی زبان کھلتی تو مذہب کے لئے اور قلم حرکت کرتا تو مذہب کے نام پر۔ وہ ہر بہتر سے بہتر خیال، اور ہر عمدہ سے عمدہ بات قوم کے آگے پیش کرتے، مگر جو کچھ کہتے۔ مذہب کے واسطے ہی اور جو کچھ لکھتے مصحف کی سیاسی سے۔

وہ جب ہمارے سامنے آتے، تو گوان کے سروں پر بیٹ ہوتا مگر زبان پر قرآن ہوتا۔ ہمیں اس کی چنڑاں پر واہ نہ تھی کہ ان کے سر پر کیا ہے؟ مگر اس سے کیوں کر غفلت کریں کہ اُن کی زبان پر کیا ہے؟ لیکن ایسا ہوتا تو کیوں کر ہوتا؟ دین و دنیا کی علی تفریق نے قوم کی اصلاح و ارشاد کی باگ ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں دیدی، جو اگر ایسا کرنا بھی چاہتی، تو نہیں کر سکتی۔ اتحاد ان کے دل میں چپے چپے کام کر رہا،

اور دماغ مذہب سے نا آشنا تھا، ان کو جس قرآن اور جس اسلام کی خبر ہی نہ تھی، اس کو قوم کے آگے پیش کرنے کو کیا کرنے؟
روح کی تلاش سے پہلے اٹھ بیٹھنے کی سعی

پہلے کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ جانتے ہیں، ایک سرد لاش اٹھ کر بیٹھ جائے، تو یہ کوشش لاعمل ہوگی کہ اس کے ہاتھ پر گرم گرم تیل کی مالش کریں، یا سر کو سینکا شروع کر دیں۔ بے شک ہاتھ ایک نہایت کارآمد اور ضروری عضو ہے، مگر صرف اس کو گرم کر دینے سے زندگی کی حرارت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اصلی شے روح ہے، جس وقت روح جسم میں عود کر آئے گی، خود بخود تمام اعضا کام دینے لگیں گے۔ جسم ملت کی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ سیاست، اخلاق، تمدن، تعلیم، صلاح، معاشرت یہ تمام چیزیں اس کے لئے نہایت ضروری اور کارآمد اعضاء ہیں، لیکن ان سب کی زندگی روح پر موقوف ہے۔ میں نے کبھی لکھا تھا کہ قومی زندگی کے لئے دنیا میں دو ہی چیزیں ہیں، پالیٹکس، اور مذہب۔ مگر یہ کہنا باقی ہے کہ اور قوموں کے لئے صرف پالیٹکس حیات بخش ہو تو ہو، مگر مسلمانوں کے لئے جن کا سارا کلبہ حیات مذہب ہی کے دم سے ہے، وہ روح مذہب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا! اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ
وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ
وَأَحْكُمُوا إِنَّ اللَّهَ يُحْكُمُ بَيْنَ الْاُمَمِ

مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول
کی پکار سنو!! وہ تم کو بلا تا ہے تاکہ
تمہارے اندر زندگی کی روح بھونکے

وَقَلْبِهِ وَآيَاتِهِ إِلَيْهِ مُخْتَصِرُونَ

مہر یقین کر دو کہ اللہ انسان اور اس

کے اعدادوں میں جب چاہتا ہے آٹھ

آٹھ ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ بالآخر ایک دن تم سب اُس کے آگے کھڑے
کئے جاؤ گے۔

ہمارے ملکی بھائی اپنے اندر صرف قومیت اور سیاست کی روح
پیدا کر کے زندگی کی حرارت پیدا کر سکتے ہیں، اسی طرح اور قومیں بھی۔
لیکن مسلمانوں کی تو کوئی عیسویہ قومیت نہیں، جو کسی خاص نسل و خاندان
بازمین کے جغرافیائی تقسیم سے تعلق رکھتی ہو۔ ان کی ہر چیز مذہب یا الفاظ
مناسبِ زمان کا تمام کاروبار صرف خدا سے ہے۔ پس جب تک وہ اپنے
تمام اعمال کی بنیاد مذہب کو نہیں قرار دیں گے، اس وقت تک نہ ان
میں قومیت کی روح پیدا ہوگی، اور نہ وہ اپنے بکھرے ہوئے شیرانے
کو جمع کر سکیں گے۔ آج دنیا "قوم" اور "وطن" کے نام میں اپنے لئے جو
تاثیر رکھتی ہے، مسلمانوں کے لئے وہ اثر صرف "اسلام" یا "خدا" کے لفظ
میں ہے۔ یورپ میں "نیشن" کا لفظ کہہ کر ایک شخص ہزاروں دلوں میں
حرکت پیدا کر سکتا ہے، لیکن آپ کے پاس اس کے مقابلے میں اگر کوئی لفظ
ہے تو خدا یا اسلام ہے

تخفیف کے بعد

اگر تخفیف کے بعد علاج آسان ہے، اگر گزشتہ امراض کی دریافت
کے بعد آئندہ کے لئے حصولِ صحت میں کوئی دشواری نہیں، اور اگر صحت

کی آرزو کے ساتھ مرض کے حصول کی خواہش کبھی جمع نہیں ہو سکتی، تو مسلمانوں کے لئے اُن کی آئندہ شاہراہ مقصود کا سوال بالکل صاف ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ آج تک اُن کی نام کو ششیں اس لئے بار آور نہ ہوئیں کہ ان کو آگ کی تلاش تھی، چاہے تھا کہ چنگاریوں کو بھونکنے ناکہ آگ بھڑکتی، اور تنور گرم ہو جانا، لیکن وہ ہمیشہ راہ کے ڈھیر کو بھونکنے رہے۔ اُن کی محنت میں کوئی شک نہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ راہ کو بھونکنے سے آگ پیدا نہیں ہو سکتی :

وَنَارُ لَوْ فَخَمْتَ بِهَا أَضَاءَاتِ

وَلٰكِنْ اَنْتَ تَفْخِمُ فِي الرَّمَادِ

ضلالت اعمال کی یہی مثال ہے جو قرآن حکیم نے دی ہے، اور فی الحقیقت قرآن کے سب سے زیادہ گہرے معارف اس کی مثالوں ہی میں ہیں:

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا ابْرَهِيمَ،
 عَمَّا لَهُمْ كِرْمًا اِشْتَدَّتْ
 بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ،
 لَوْ يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلٰی
 شَيْءٍ، ذٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ (۲۱۱/۱۳)

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی طاعت سے انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے گویا راہ کا ڈھیر ہیں، کہ آندھی کے دن اس کو ہوا اڑا لے گئی۔ اسی طرح جو کام ان لوگوں نے کئے ہیں، ان میں سے کچھ بھی اُن کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہی گمراہی پرے درجے کی گمراہی ہے۔

مسلمانوں میں تعلیمی رفتار اب تک مقابلہ کیوں سست ہے؟ پوچھ

آزادی کے دلوے کیوں اُن میں نہیں ابھرے ؟ ایشاد و قربانی کی مثالیں کیوں
 ناپید ہیں ؟ سحر نگار اہل قلم ، اور آتش بیان مقرر کیوں نہیں پیدا ہوتے ؟
 ان سب کا جواب یہی ہے کہ ایک مردہ لاش سانسے تھتی ، لیڈروں نے
 اس کے اعضاء تقسیم کر لیے ۔ کسی نے تلوار سہلایا ، اور کسی نے سر سینکنا
 شروع کر دیا ، مگر روح کی کسی کو فکر نہیں ہوئی ۔ پھونکنے کے لئے بہتوں
 نے اپنے چہروں کو چوڑھے سے ملا دیا ، مگر جتنی پھونکیں ماریں ، وہ سب یا
 تو چوڑھے کی باہر کی مٹی اوڑھتی رہیں ، یا اندر کی جمع شدہ رالھ کو بکھیرتی رہیں
 آگ بھڑکتی تو کیونکر بھڑکتی ؟ اور تمام اعضاء کام دیتے تو کیونکر دیتے ؟
 بدبختی ہے کہ اتنی صاف بات بھی کسی کے سمجھ میں نہیں آئی ؟

خلاصہ مطالب

ہم نے گذشتہ تین نمبروں میں جو خیالات ظاہر کئے ہیں ، بہتر ہوگا ، اگر
 ان کو بطور حاصل بیان کے یہاں عرض کر دیں ۔

۱۔ موجودہ تغیر خیالات ایک قیمتی فرصت ہے ، اگر ایک دیوار ٹیڑھی
 کھڑی کر دی گئی ہو اور آپ اُس کے نقص کو محسوس بھی کر لیں ، تاہم کسی بھی
 ہوئی چیز کا گرانا اور پھر از سر نو بنانا اس درجہ مشکل کام ہوتا ہے ، کہ ممکن
 ہے ، برسوں تک آپ کو نئی دیوار کھڑی کرنے کی تہمت نہ ملے ۔ لیکن اگر
 طوفان یا بارش کے ناگہانی حملے سے خود بخود وہ گر جائے ، تو پھر آپ کو نئی
 دیوار بہر صورت بنانی ہی پڑے گی ۔ یہی حال مسلمانوں کی قدیمی پالیسی کا
 ہے ، وہ خود بخود گر چکی ہے ۔ نئی پالیسی کی دیوار بنانے کے لئے اب کچھلی

دیوار کے گرانے کی ضرورت نہیں، صرف اس کی ضرورت ہے کہ اب جو بنیاد رکھی جائے، وہ درست ہو۔

(۲) مسلمانوں کے لئے ہر شے ان کے مذہب میں ہے، پس اگر وہ آج کل پولیٹیکل زندگی اپنے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اس کی جگہ اُس شے ہی کو کیوں نہ پیدا کر لیں، جو نہ صرف پالیٹکس، بلکہ قومی اعمال کی ہر شاخ کو زندہ کر دے؟

(۳) قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لئے نازل نہیں ہوا، بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل و اکمل قانونِ فلاح ہے، جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں۔ پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل، جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا، اُن کے لئے کبھی موجب فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔

(۴) مسلمانوں کا تمام کاروبار خدا سے ہے، اور خدا کے سوا جو کچھ ہے وہ ان کے لئے اصنام و طواغیت یعنی بتوں کا حکم رکھتا ہے۔ پس جب تک وہ خدا کے آگے نہیں جھکیں گے، دُنیا کی کوئی چیز اُن کے آگے نہیں جھکے گی۔

(۵) ان کو اپنا نصب العین صرف "اسلام" بنانا چاہئے۔ اور ساری طاقت اس میں صرف کرنی چاہئے، کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف احکامِ اسلام کے مطیع و منقاد ہو جائیں۔ "اسلام" ہی اُن کے لئے پالیٹکس کی راہ کھولے گا، تعلیم کا حکم دے گا۔ اخلاق و خصائل میں تبدیلی پیدا کرے گا، اور وہ تمام باتیں جن کو ترقی یافتہ قوموں میں دیکھ کر وہ پلچا رہے ہیں، نقصانوں

اور مفسرین سے صاف ہو کر ان میں پیدا ہو جائیں گی۔ هَذِهِ تِلْكَ كَيْسَةٌ
فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا۔

(۴)

ہاں رہ عشق ست کج گشتن ندارد بازشت
جرم را این جا عقوبت هست دستغفار نیست

اس تبدیلی کے نتائج

قدرتی طور پر سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر ایسی تبدیلی عمل میں آگئی
(وَمَا ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ) تو اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ آغاز مضمون
میں جن آئندہ خطرات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ کیا کیا ہیں؟

لیکن غور کیجئے تو دراصل ہماری دعوت انبیاء فرائد و نتائج سے مستغنی
ہے۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ ہر وہ انسانی عمل جو تعلیم الہی کی ہدایت بخشی سے خالی
ہے، کبھی فوز و فلاح نہیں پاسکتا۔ اگر ہم اپنی دعوت کی خوبیاں ثابت نہ کر سکیں
تو کچھ ہرج بہرج نہیں، کیونکہ اس کے لئے یہی ایک خوبی کافی ہے کہ ادوروں کی
دعوت انسانوں کی طرف ہے اور اس کی بکار تعلیم الہی کی طرف!

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا
إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ
إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

اور اس سے بہتر اور کس کی بکار ہو سکتی،
ہے، جس نے اللہ کی طرف بلا یا، اعمال
نیک انجام دئے، اور اپنے تئیں
کسی انسانی نسبت کی طرف نہیں، بلکہ خدا کی طرف منسوب کر کے کہا کہ میں موم

مسلم ہوں۔

انسانی اعمال و اقوال دوسرے انسان کے لئے محتاج تصدیق میں، مگر خدا کی آواز جب انسان کو مخاطب کرتی ہے، تو وہ خود حق اور صداقت ہے اور اپنی تصدیق کے لئے کسی استدلال کی محتاج نہیں۔ اگر سچ کوئی شخص وجود دھوتا، اور بولتا، تو کیا اس سے دلیل طلب کی جاتی کہ وہ سچ ہے؟ آفتاب اگر کہے کہ میں روشن ہوں، تو آپ اُس کے جواب میں کیا کہیں گے؟

ہم جلدی میں لکھ گئے کہ ”ہمارا اعتقاد ہے“ حالانکہ ”بر مومن قلب“ کا یہی اعتقاد ہونا چاہئے۔ مومن کی تعریف یہ ہے کہ وہ صبح الفطرت انسان جس کی فطرت اصلی کا ذوق خارجی اثرات ضلالت سے بگڑ نہ گیا ہو، کیونکہ انسان کی ”فطرت اصلی“ اور ”اسلام“ دو مراد لفظ ہیں۔ اور فطرت انسانی کا اگر کوئی مذہب ہے، تو وہ اسلام ہی ہے، اس کے خلاف انسان کے جس قدر اعمال ہیں، ان کو خارجی اثرات کی پیدا کی ہوئی ضلالت سمجھے۔ ہر ایسی ضلالت کو جو سرشت انسانی کے خلاف ہو، قرآن حکیم ”عمل الشیطان“ سے تعبیر کرتا ہے کہ عمل رحمانی نحوین فطرت اصلی و در لبت تمیز ہدایت و ضلالت ہے۔ کَمَا وَرَدَ فِي الْحَدِيثِ الْمَشْهُورِ: كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى فِطْرَتِهِ (او علی فطرۃ الاسلام) وابواہ یهودانہ وینصرانہ لائے احسن)

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ
فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ

پس صرف دین قیم فطری کے ہو جاؤ
وہ خدا کی قائم کی ہوئی فطرت ہے

عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ
جس پر انسان پیدا کیا گیا اور خدا کی
فطرت میں کسی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

پس ہر صحیح الفطرت انسان کے لئے یہ دعوت ایک ایسی صداقت بحث
ہے جو کسی بحث و استدلال کی محتاج نہیں۔ یہ اس کے لئے کوئی نئی دعوت
نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر کی اس صدائے فطرت کا اعادہ ہے، جو ہر
آن اور ہر لمحہ اس کے اعماق قلب سے اُٹھ رہی ہے، اور اس نقش
خلقت کا عکس ہے، جو نقاش قدرت نے اس کے صفحہ جبلت پر کھینچ دیا
ہے۔ اگر باہر کے غوغائے ضلالت نے اس کے سامعہ کو مشغول نہ کر دیا ہو
تو جب کان لگائے، اُس آواز کو سُن سکتا ہے۔ اور جب اُنکھ بند کرے
اس نقش کو دیکھ سکتا ہے :

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرًا لِّمَن
اور اس میں بہت بڑی بعیرت ہے
كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْفَى السَّمْعَ
اس کے لئے، جو اپنے پہلو میں سوچنے
وَهُوَ شَهِيدٌ (۵۰: ۳۷)
والادل رکھتا ہو، اور جس کے سر پر

سننے والا کان ہو۔

ابنہ یہ ضرور ہے کہ دسترخوان کے لداکنڈ کا اعتراف کرنے کے لئے
ایک ندرست شخص کی زبان چاہئے، نہ کہ ایک ایسے مرعس کی، جو رات بھر
تپ محرقہ میں مبتلا رہ کر بستر سے اُٹھا ہو۔ اگر آپ کے منہ کا مڑا بگڑا
ہوا ہے، تو آپ شہد کو خطل ثابت کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ اپنے کام و
زبان کے ذوق رفتہ کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

پس حقیقت اندیشی کی نظر ڈالئے، تو اتباع تعلیم الہی کے داعی کے سرکشت
 و استدلال کا کوئی بار نہیں ہے۔ اس نے جس وقت یہ کہا کہ تعالوا الی مآ
 نَزَّلَ عَلَی الْوَسُوْل (اس تعلیم کی طرف آؤ جو خدا نے اپنے رسول کریم پر
 اتاری) تو وہ اسی وقت سبک دوش ہو گیا، کیوں کہ اگر اس کی دعوت دلیل
 کی محتاج تھی، تو اس نے دعوے کے ساتھ دلیل بھی پیش کر دی۔ روشنی کے
 لئے یہی دلیل ہے کہ وہ روشنی ہے۔ اس کی صداقت کی اس سے بڑھ کر بہانہ
 میں کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انسانوں کی طرف نہیں بلانا بلکہ داعی الے
 اللہ و ما نزل علی رسولہ ہے۔

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنِنَا
 وَبَیْنَكُمْ اِلَّا تَقْبَلُوْا اِلَّا اللّٰہَ
 اس تعلیم کی طرف آؤ جو تم میں ادھر
 میں مشترک ہے۔ یعنی خدا کے سوا
 کسی کے آگے سر نہ جھکا دیں۔

تاہم کیا کجی کہ بد بختی سے زمانہ وہ ہو گیا ہے، جبکہ ایک مسلمان کے آگے
 اسلام کی خوبیوں کو ثابت کرنا بہ نسبت ایک مسیحی کے زیادہ ضروری ہے۔
 عین نصف النہار کی دھوپ میں کھڑا ہو کر ایک حریف آفتاب سے
 مقابلے کی آنکھیں لڑاتا ہے، اور پوچھتا ہے کہ اس کے روشن ہونے کا
 ثبوت کیا ہے؟ پیاس کسی کو نہیں ہے، مگر پانی سے پوچھتے ہیں کہ اسے
 کیوں تشنگی کے لئے مفید تسلیم کیا جاتا ہے؟
 حریف کا دوش مرگاہوں میں نشی نہا ہوا بدست اُدر گھٹانے دشمن را تماشا کن!

بہر حال ہم بوجھنے ہیں کہ اس دعوت کے نتائج پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں۔
 روشنی کی برکتیں کے معلوم نہیں۔ مگر پھر بھی آپ بار بار دہرا دہرا کر کے جاکے
 تو بہتر ہے، کیونکہ لوگوں نے تاریک غاروں اور تہہ خانوں کو اپنا شیمن
 بنا لیا ہے۔ کَذٰلِكَ نَقُصِّرُ فَاٰلِهَآءِ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّكُمْ لَآ تَدْرُوْنَ (اور
 اسی لئے ہم بار بار دہرا کر مغلط و تذکیر سے کام لیتے ہیں۔ تاکہ لوگ سوچیں
 اور غور کریں۔ ہماری دعوت دراصل دو حصوں پر مشتمل ہے :

۱) مسلمان اپنے تمام اعمال میں جب تک کوئی عملی مذہبی تبدیلی پیدا نہیں
 کریں گے، محض سیاسی یا تعلیمی تغیرات و ترقیات اُن کے لئے سودمند
 نہیں ہو سکتیں۔

۲) تعلیم، معاشرت اور سیاست میں ان کو بر بنائے اتباع اقوام
 کوئی راہ اختیار نہیں کرنی چاہئے، بلکہ بر بنائے مذہب۔
 پہلے حصہ کو ہم مؤخر، کھ کر سردست دوسرے ٹکڑے پر ایک مختصر بحث
 کرنی چاہتے ہیں۔

ہم نے گذشتہ نمبر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے تئیں
 تعلیم قرآنی کے ہاتھ پر چھوڑ دیں۔

مجاہد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

اب دیکھنا چاہئے کہ اگر ہم ایسا کریں، تو تعلیم، معاشرت اور پالیٹکس میں
 قرآن ہم کو کس طرف لے جائے گا؟ تعلیم میں ہم آج جو علوم و فنون جدیدہ
 حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور جو مقصد انتہائی ہمارے پیش نظر ہیں، مذہب کی

راہ سے بھی وہاں تک پہنچ سکیں گے یا نہیں؟ اور اگر پہنچیں گے، تو غالباً تعلیمی تحریک اور اس تحریک میں کیا فرق ہوگا؟ معاشرت میں اس کا ہاتھ نہیں کہاں لے جائے گا؟ اور جو زندگی ہماری ہوگی، وہ بیسویں صدی کی معاشرتی ضروریات سے مطابق ہو سکے گی یا نہیں؟ پالیٹکس میں اس کی تعلیم کیا ہوگی؟ وہ غلامانہ محکومی کو فضیلت انسانی قرار دے گا، جیسا کہ اب تک مسلمانوں کا حال رہا، یا آزادی و خود مختاری، جمہوریت و مساوات کا دلولہ پیدا کرے گا، جس کی طرف موجودہ تغیرات کا عام رجحان ہے؟ اور پھر بالفرض تعلیم قرآن و اسلام کی راہ سے ہم نے ایک آزادانہ پولیٹیکل پروگرام مرتب بھی کر لیا، تو اس میں فزیت و فضیلت کیا ہوئی، کیونکہ یہی شے ہم تنہا سے الگ رہ کر، یورپ کی موجودہ جمہوریت کے اتباع اور ہمایوں کی نظر سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ سوالات ہیں، جن کا جواب دینا اس حیتہ، بحث میں ضروری ہو لیکن تعلیم اور معاشرت سے پہلے ہم چلتے ہیں کہ پالیٹکس کی شاخ پر نظر ڈالیں کیونکہ گو آج تک مسلمانوں کی اصلاح پر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا، کہ تعلیم اور معاشرت کی اصلاح مذہب کی راہ سے شروع کی گئی ہو، مگر تاہم چونکہ نئے مصلحین کا سرمایہ اصلاح اب تک صرف تعلیم ہی رہا ہے۔ اس لئے گاہ گاہ ان کے ایوان تجدید میں بر بنائے مصالح چند در چند، مذہب کو باریابی کی عزت دیدی جاتی ہے۔ اور چنداں بے التفاتی پر اصرار بھی نہیں ہو مسلمانوں کی جیب پر اب تک مذہب کی حکومت کچھ نہ کچھ باقی ہے اور

اس صید کے لئے چند سہ کے جال میں سب سے زیادہ پرکشش مذہب ہی کا ہے۔

دو عظیم و مصممین حال میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر اسلام و قرآن کے استغراق و انہماک سے بالکل عظیم الفرست رہتے ہیں، اور قرآن کریم کے حامی تعلیم "دین فطری اور" "مصلح اخلاق و معاشرہ" ہونے کے بہت سے دلائل و اسباق اُن کے ذہن زبان میں۔ بعضوں پر تو کانفرنسوں کی خانقاہوں میں جب ایمان جذبہ قوی سے عالم تواجہ و ترقص لاری ہوتا ہے، تو فطرۃ "اور" اسلام کا پردہ بیگانگی و تعین بجلی مرتفع ہو جاتا ہے، اور عالم اتحاد کے مشاہدات سے بے خود ہو کر "الاسلام ہو الفطرۃ، و الفطرۃ ہی الاسلام" کا نراۃ و حدت گمانے لگتے ہیں۔

بارب زریں حادثہ طوفان رسیدہ باد

بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

اس میں شک نہیں کہ اسلام ایک دین فطری ہے الٰہی فطرۃ الناس علیہا اور نام عالم میں کوئی انسانی فطرت ایسی نہیں ہے جو اس کے ساتھ جمع نہ ہو سکے۔ لیکن اگر انسانی صفت کے بعض نمونے ایسے بھی ہو سکتے ہیں، جیسے اس دین فطری کے ان نئے مصممین و دو عظیمین کے ہیں، تو پھر تو اسلام کی فطرت کے مقابلے میں شک تسلیم کر لینا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض انسانوں کی فطرت اسلام سے اس درجہ متجانہ و متضاد واقع ہوئی ہے، کہ آج تک اُن کی فطرت اعمال کے ساتھ یہ

دین فطری ایک لمحہ کے لئے بھی جمع نہ ہو سکا۔ اور گودہ بورپ کے مقررین اسلام کو نماز کا فلسفہ، اور روزے کے دقائق فطریہ سمجھانے کے لئے پوسے مستعد ہیں، مگر سوء اتفاق سے اس فلسفہ و اسرار فطرت کو کبھی اُن کے ایوان اعمال میں باریا کی کی غرت نصیب نہیں ہوئی: بَلْ قُلُوبُهُمْ فِي غَمْرَةٍ مِنْ هَذَا، وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِنْ دُونِ ذَلِكَ هُمْ لَهَا عَامِلُونَ (ان لوگوں کے دل اس دین فطری سے غافل ہیں اور ان کے دوسرے اعمال ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں)

اب ہم صرف اس حصہ بحث نظر دیتے ہیں کہ اگر مسلمانوں نے آئندہ کے لئے اپنا پولیٹیکل پردہ گرام مذہب کی بنیاد پر قرار دیا، تو ایک خالص شہل تحریک کے مقابلے میں کیا نتائج مرتب ہوں گے؟
اتباع شک اور اتباع یقین

ادسین اور بنیادی شے تو یہ ہے کہ اگر ایک "راد یقین" کی دعوت آپ کو پہنچا رہی ہے، تو آپ "شک" اور "ظن" کی طرف کیوں دوڑتے ہیں؟ وہ پالیسی جو محض انسانی اتباع اور نظیر کی بنیاد پر قائم کی جائے گی شک اور گمان ہوگی، کیونکہ انسانی دماغ کا ہر خیال شک ہے، خواہ اس کا نام محصور علم ہو، یا محدود تجربہ، اور یقین کا سرچشمہ اگر کوئی ہے تو وہ اسلام یا مذہب حقیقی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر جگہ کفر و شکالت اور الحاد و بدعت کو "شک" اور "گمان" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کیونکہ انسانی دماغ کی نہایت

سرحد میں بھی اگر ڈھونڈھا جائے تو یقین کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ایک محمد فلسفی ہر چیز میں شک کر سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہے، لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ نہیں ہے، تو نفی کے لئے حکم یقینی کہاں ہے؟ تو اس کا جواب اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ مگر مذہب ایک یقین کی دعوت لے کر آتا ہے، وہ حقائق اور وجود میں شک نہیں پیدا کرتا، بلکہ حقائق کے لئے ایک یقین بننے ساتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ:

هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ
عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي
وَسُبْحَنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَنَا مِنَ
الْمُشْرِكِينَ . (۱۰۸:۱۲)

یہ میرا طریقہ کہ اللہ کی طرف بلانا
ہوں ۱۰ اس یقین پر، جو مجھ کو اور
میرے ماننے والوں کو طریق الہی
پر ہے۔

اس نے ہر جگہ منکرین تعلیم الہی کو سب سے بڑا الزام یہ دیا ہے :
مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ أَن
يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَأَلَّاتِ
الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ
شَيْئًا

ان کے پاس کوئی علم و یقین نہیں،
سوا اس کے کہ شک اور گمان میں
گمراہ ہو رہے ہیں، حالانکہ شک
یقین کے مقابلے میں کب ٹھہر

سکتا ہے؟

دوسری جگہ کہا :

هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ
لَنَا؟ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ

کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے، جو
ہمارے آگے پیش کر سکیں، حقیقت

کَانَ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُونَ یہ ہے کہ کوئی نہیں، صرف اپنے دماغوں

(۱۱۰:۶)

پر چلتے ہو۔

بلکہ اگر قرآن کریم پر تذبذب و تفکر کی نظر ڈالی جائے، تو ثابت ہوتا ہے کہ "کفر" اور "شک" اس کی اصطلاح میں ہم معنی الفاظ ہیں، اور وہ کفر کو ہر جگہ شک پرستی سے اور اسلام کو یقین و عمل سے تعبیر کرتا ہے۔ (لیکن یہ اس بحث کا موقع نہیں)

پھر سوال یہ ہے کہ اتباع و پیروی کی مسخنی وہ تعلیم ہے، جو یقین اور اعتقاد بخشتی ہو، یا وہ جس کا نام تو ماحصل شک اور ظن پر ہے؟

اَفَمَنْ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يَّتَّبَعَ، اَمْ مَنْ لَا يَهْدِيْ اِلَّا اَنْ يُّهْدِيَ؟ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ؟ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا، اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا، اِنْ اَنْتُمْ عَلَيَّمْ بِمَا يَفْعَلُوْنَ (۱۰:۳۵)

جو حق اور یقین کی راہ دکھلائے، وہ نبیادہ اس بات کا مسخنی ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، یا وہ انسان، جو خود کسی راہ دکھلانے والے کا محتاج ہے؟ تم لوگوں کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ کیسے حکم نکالتے ہو؟ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے دماغ پر قیاس کی انگوٹھیں پہنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ دماغ، یقین کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔

عدم تغیر و استقلال رائے

ہم نے کسی گذشتہ نمبر میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی ایک "بی پویشی"

پایسی تیار کرنی چاہئے، جو کبھی متغیر نہ ہو، اور جس کی بنیاد ایک محکم عقیدہ ہو نہ کہ بعض خارجی اسباب۔ لیکن مذہب کے سوا اور کون سا اعتقاد ہو سکتا ہے، جو تغیر و تبدل سے محفوظ ہو؟ انسانی ارادہ و قیاس میں تغیر لازمی ہے، کیونکہ وہ ظنون و ادہام ہیں، اور خارجی اسباب و علل کے تابع، لیکن احکام الہیہ کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ ایسی یقینات ہوں جن میں کبھی تغیر نہ ہو سکے۔ اگر کوئی مذہبی حکم متغیر ہو سکتا ہے تو وہ اس کا مستحق ہی کب ہے کہ اس کو مذہب کے لفظ سے تعبیر کیا جائے؟ وکن تَجِدَ لِنُسُتَةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔

پس اگر مسلمانوں کی پولیٹیکل پایسی اُن کے مذہبی اعتقاد پر مبنی ہوئی تو جب تک اُن کے دلوں میں اسلام کا اعتقاد باقی ہے، اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اُن کے ہمسایوں کی پایسی بدل جائے گی مگر اُن کی پایسی بدل نہ سکے گی؛ کیونکہ جس رہنما کے ہاتھ میں اُن کا ہاتھ ہوگا، اس کی راہ ایک ہی ہے۔ اگر گورنمنٹ کی پایسی میں تغیر ہو، تو اس کا بھی اُن پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ انسانی حکومتوں کے اصول حکمرانی ہی نہیں بلکہ سب سے حکومتیں بھی بدل جائیں تو بھی اسلام نہیں بدل سکتا۔ اور اسلام نہیں بدل سکتا، تو ہر اس سے ماخوذ اور اس پر مبنی اعتقاد بھی نہیں بدل سکتا۔

نقصادم اجزاب و تراجم آراء

اب تک مسلمان ملکی ترقی اور آزادی کی تمام تحریکوں سے فخر کیا

الگ رہے۔ اس لئے ان کو پولیٹیکل زندگی کے سفر کی کوئی منزل پیش ہی نہیں آئی
 یہ منزلیں ابتداء سے بے شدہ اور مقرر نہیں، اور ہر محکمہ قوم جو سیاسی
 زندگی حاصل کرنا چاہے گی، ضرور ہے کہ اُن سے ایک بار گزر جائے۔ منجملہ
 ان منازل کے ایک نہایت خطرناک منزل پولیٹیکل مطالبات کا اصولی اختلاف
 و نزاع، اور اس بنیاد پر مختلف پارٹیوں کا قیام ہے۔ بغیر اس منزل سے
 گزرے اس راہ کبھی گمراہی کے تجربے اور موجودہ واقعات کے
 مشاہدے کے لحاظ سے تقریباً محال ہے۔ ملکی آزادی کی خواہش کو
 جب بادلوں میں پیدا ہونے اور نشوونما پانے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا،
 تو پھر آپ کے پاس کوئی مقیاس حرارت نہیں ہے، جس سے ہمیشہ اس حرارت
 داغ سوز کی ڈگری کا خط دیکھنے میں آئے۔ پولیٹیکل زندگی مختلف طبائع میں
 مختلف قسم کی صلاحیت پا کر مختلف درجے کی حرارت پیدا کر دیتی ہے، اور
 اس لئے پولیٹیکل جدوجہد کے شروع ہوتے ہی مختلف جماعتیں قائم ہو جاتی
 ہیں۔ سب سے بڑا نزاع ملکی آزادی کی آخری منزل کی نسبت ہوتا
 ہے، کہ وہ کیا ہو؟ ایک جماعت خالص جمہوری اعتقاد پر قائم ہو جاتی
 ہے، دوسری جمہوریت کو شاہی اقتدار کے ساتھ قائم رکھنا چاہتی ہے
 ایک جماعت غیر ملکی حاکموں کے زیرِ سیادت خود مختار ملکی حکومت
 پر قناعت کر لیتی ہے، دوسری جماعت ملک کو عرفِ ملکیوں کے لئے دیکھنا چاہتی
 ہے، اور اس لئے اس کا نصب العین صرف حکومت خود اختیاری ہی
 نہیں بلکہ اعتبار و اجاب سے ملک کو خالی کرنا بھی ہوتا ہے اور اگر دور نہ جائیں

تو اپنے برادران ملک کی پولیٹیکل جدوجہد میں اس کی مثال آپ کیجئے ہیں۔ اس نزاع احزاب، اور اختلاف مقاصد کا سیاسی رنگ کی کے ساتھ ساتھ پیدا ہو جانا بالکل قدرتی ہے۔ یہ طبیعت انسانی کے طبعی جذبات دریں دناعت، اعتدال و سختی، اور شدت و نرمی کا پولیٹیکل ظہور ہوتا ہے، اس لئے بلا استثناء دنیا کے سیاسی جدوجہد کے عہد قریب میں کوئی قوم اس منزل سے گزرے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہ اختلاف و نزاع جس درجہ ناگزیر نظر آتا ہے اس سے زیادہ اس کی مضرتیں واضح ہیں۔ سب سے پہلا مضر نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ ملکی آزادی کے حلقے سے بچنے کے لئے یہ نزاع حکومت کے ہاتھ میں ایک مضبوط ڈھال بن جاتا ہے اور حملہ آور کا باہمی نفاق حریف کو فرصت دیدیتا ہے کہ جنگ کے نتیجے سے محفوظ ہو جائے۔ ہندوستان کا موجودہ پولیٹیکل سکون اسی کا نتیجہ ہے، اور مصر میں "حزب وطن" کی تحریک اسی لئے بار آور نہیں ہو سکتی کہ وہاں کی مائڈریٹ پارٹی (حزب ملت) کو انگلستان نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور آزادی کی ایک تلوار سے دوسری تلوار کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

مسلمان اگر پولیٹیکل جدوجہد کا سفر شروع کرنا چاہتے ہیں اور افسوس کہ اب شروع کرتے ہیں، تو ان کے لئے بھی اس منزل سے گزرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم کو یقین ہے کہ اگر وہ اپنی پولیٹیکل زندگی کو مذہب سے وابستہ کر دیں اور جس راہ کو اختیار کریں اُسے اپنا ایک مذہبی حکم سمجھ کر اختیار کریں تو اسلام کے خوارق سے بعید نہیں کہ وہ ان کو ان سوانح راہ سے بالکل محفوظ کر دے اور

وہ اس امن و سکون کے ساتھ راہ سے گزر جائیں کہ سیاسی جدوجہد کے کلمات میں ان کا وجود ایک مثال متنی ہو۔

ہم نے کہا کہ کچھ بعید نہیں، لیکن غور کیجئے تو ایسا ہونا یقینی اور لازمی ہے۔ جب مسلمان اپنی پولیٹیکل جدوجہد کو محض سیاسی دلوں سے نہیں، بلکہ اپنے اعمال دینی کی طرح شروع کریں گے، تو ان کی زندگی اور اعمال احکام دینی کے تحت میں آکر بالکل محدود و متعین ہو جائیں گے۔ خلاف نزاع و جھگڑا موجب انسانی دماغ کو اس میں دخل ہو۔ مذہبی احکام تعبد میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اُن کا پائیکس مذہب کی حکومت میں آجائے گا۔ وہ خود مختار نہ ہوگا کہ اپنے لئے مقاصد اور اس کے حاصل کرنے کے لئے وسائل ڈھونڈے، بلکہ جو ایک ہی مقصد، اور ایک ہی طریق حصول مقصد، اس کو مذہب بتلا دے گا، مجبور ہوگا کہ صرف اسی میں محدود رہے۔ جس طرح ایک مسلمان نماز پڑھتا، اور روز رکھتا ہے، بالکل اسی طرح ایک سیاسی مقصد کو حکم الہی سمجھ کر تلاش کرے گا۔

الجہاد فی سبیل الحرت

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا مِنِّي ۚ كُنتُمْ مَوْحِدِينَ ۚ (۱۳۷:۱)

کسی سے مت ڈرو۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو!

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وقت میرا
اک نعرہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

يٰۤاَيُّهَا حَبِيَّبِي السَّيِّدُ عَزَّ وَكَبَّرَ
مَتَفَرَّقُونَ خَيْرٌ اِمَّ اللّٰهُ الْوَلِيَّ
الْفَقَارُ مَا تَعْبُدُنَّ مِنْ دُونِ
اِلٰهٍ اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُمْ
وَ اَنَا وَاَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ
سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ

اے یارانِ مجلس! بہت سے مالک اندازانہ
اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے لگے
جھلنا؟ تم جو اللہ کو چھوڑ کر اور معبودوں کو
پوج رہے ہو تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ
چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے پیشرو
نے گھڑے ہیں؟ حالانکہ خدائے اُن کے

أَمْرًا لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ
 لئے کوئی سند بھی نہیں۔ اے مگر ہر یقین کر
 کہ تمام جہان میں حکومت صرف اس ایک خدا
 ہی کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کے آگے جھکو؛ یہی دین اسلام کا سیدھا
 راستہ ہے لیکن اے دے کہ اکثر لوگ ہیں جو نہیں جانتے۔

تاریخ آزادی ہند جو لکھی جائے گی

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی یقیناً
 ایک دن آئے گا، جبکہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔
 غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی
 کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا
 ہونا ضرور ہو فرض کیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ
 لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں
 کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بد بخت اور تہوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی
 ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لئے ایک بد قسمتی، راہِ آزادی میں
 سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچہ، تعب، ہندوستان
 کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی اُنگٹوں کو پامال
 کرنے کے لئے ایک پتھر بن کر رہی!

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسحور انسانوں کا گلد، جس
 کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے پھلنے والے

آفلکے ہاتھ میں اپنے گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت، اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی، نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی، اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتی تھی ایک معمول، جو مسما از رکے ارادہ پر زندہ ہو۔ ایک وجود شل، جو صرف زمین کے لئے بار ہو۔ ایک درخت، جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو۔ ایک پتھر، جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دے ہل نہ سکتا ہو، اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا دارغ، جو انسانیت کی بنیانی پر ہو۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ
أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَذَانٌ
لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ
بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْغَافِلُونَ ۝ (۸۴:۲۸)

اُن کے پاس دل ہیں۔ مگر سمجھتے نہیں۔
انکے میں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر
سننے نہیں۔ ان کی مثال چار پاؤں
کی سی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر۔ وہی
ہیں جن کو غفلت کی سرشاری نے نہایت

سے محروم کر دیا ہے۔

اسلام کی تذلیل کا ایک درد انگیز منظر

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی، جو آہِ نغم آہِ اکہ
مسلم تھی، جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی
جس کو دنیا کی درائش اور خلافت دی گئی تھی۔ جو دنیا میں اس لئے بھیجی گئی تھی
تاکہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الہی کو آزاد کرے۔

جو اس لئے بھی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے، نہ اس لئے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیا پہنے۔ جو اس لئے آئی تھی کہ تمام ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی (اور ہر وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے اسلام کی اصطلاح میں یہی نام رکھتا ہے) انسان کی گردنوں میں پڑی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے، نہ اس لئے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زبور بنائے۔ جو خدا کی نواب اور خلیفہ تھی، تاکہ دنیا کو اپنا محکم بنائے، نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے۔ جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا تاکہ وہ اٹھائے، نہ یہ کہ وہ خود خاکِ مذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اُس ملتِ حنیفی کی بیزدہنی، جو دنیا میں صرف اس لئے ہے کہ حاکم ہو، نہ اس لئے کہ غلام اور مملوک ہو۔ آہ! جو "مسلم" تھی۔ اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے، جو اس اللہ کے مُنہ سے نکلے ہوئے خطابِ محبوب و اقدس میں نہیں ہے؟ جو "مسلم" تھی، اور اس لئے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ کرتی، جو اوروں نے کیا اور جس کو اپنے وجودِ نبوی سے اُس نے روکا۔ جو "مسلم" تھی، پس چاہئے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں، کیونکہ اس کے پاس اسلام تھا اور اسلام آگے رہنے کے لئے بے پیچھے رہنے کے لئے نہیں۔ وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں، پر وہ کسی کے آگے جھکنے کا محتاج نہیں ہے۔

اور اسی طرح ہم نے مسلمانوں کو دنیائی
قوم بنایا تاکہ وہ تمام انسانوں کی ہدایت
کے شاہد ہوں اور ہم المرسلین اُن کے
لئے شاہد ہو۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا
لِتَشْكُرُوا شَهْدَاءَ عَلَى النَّاسِ
وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ
شَهِيدًا (۱۳: ۱۳۷)

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جو حق
جہاد کرنے کا ہے اُس نے تم کو تمام
دنیا کی قوموں میں سے برگزیدگی اور
امتیاز کے لئے چن لیا۔ پھر جو دین کہ تم
کو دیا گیا ہے وہ ایک ایسی شریعت فطری
ہے، جس میں تمہارے لئے کوئی رکاوٹ
نہیں۔ یہی ملت تمہارے مورث اعلیٰ
ابراہیم خلیل کی ہے۔ اور اس نے تمہارا
نام مسلمان رکھا ہے۔ گزشتہ زمانوں
میں بھی اور اب بھی تاکہ رسول تمہارے

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ
فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ أَبِيكُمْ
إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ
مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ
الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا
شَهِدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا
بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى
وَنِعْمَ النَّصِيرُ (۱۳: ۷۸)

لئے اور تم تمام عالم کی ہدایت اور نجات کے لئے شاہد ہو۔ پس اللہ کے رشتے کو مضبوط
پکڑو۔ جان اور مال دونوں کو اس کی عبادت میں لٹاؤ۔ وہی تمہارا ایک آقا اور
مالک ہے۔ پھر میں کا خدا مالک اور حاکم ہو، اس کا کیا اچھا مالک ہو اور کیسا قوی مددگار۔
دماغ سوچنے کے لئے ہے نہ کہ غفلت کے لئے۔ پس تمہارے پاس دماغ ہے

تو اے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدا را مجھ کو بتلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو کہ اس وقت جبکہ یہ سطر ہی لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے، میری روح بے چین ہے، میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹٹکے کھل گئے ہیں، اور میرے ہیجان افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آگیا ہے۔ یہ کیا ہے کہ میں ایک شے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں لیکن تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے، میں سن رہا ہوں پر تم نہیں سنو؟ آہ! اے لوگو کہ میں نہیں سمجھتا تم کو کیا کہوں۔ مجھ کو خدا را بتلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم دین قوم کے پیرو، خطا اسلام سے منصف، اور امانت الہی کے حامل ہو، یہ سچ ہے تو تم صرف اس لئے ہونا کہ ~~مرد~~ ہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو، خود مختار ہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو، بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بند استعباد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لئے ہو کہ تم جان فروش ہو، تاکہ راہ حق میں سرکھٹ ہو۔ پھر یہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں، لیکن اے بد بختو! تم ان سے محروم ہو۔ یہ کیا بولاجی اور کیا تا شائے عقل سوز ہے؟

پری نہفتہ رخ دیو در کرشمہ دناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ این بولاجیت؟

تاریخ ہند کا ایک خاص باب

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لئے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو، اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بے شک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترستی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لئے اپنے سردوں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پیکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر فضل چڑھا دئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکس تھا، ہندوؤں نے اُس کے لئے جہاد شروع کیا، پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ ہی، بلکہ مجنونانہ چیخ اُٹھی کہ تمام کام کئے دے باغی ہیں۔

افسانہ استبداد ہند

ملک کہ ایک خاص زرعی ملک تھا، اس کے کاشتکار تباہ و برباد ہوئے تھے، ملک کی دولت انگلستان کے معدے میں بھری جا رہی تھی، اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر ہل من مزید کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریویس کی توسیع کے انگلستان کو ٹھکے دئے جا رہے تھے تاکہ وہ دولت جلا کر لے، اگر آپاٹشی کے لئے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اگلے زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ تم دغا دار ہو، مگر اسلحہ کو چھونے کی اجازت نہ تھی کہ تم غدار ہو۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار (۷۰۰۰۰) سرخ زنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی تھی، مگر ملک کے فاقہ مست کا بے تعلیم اور

حفظ صحت کے انتظام سے محروم تھے۔ نمک بھی ملتا تھا تو محصول دے کر اور تعلیم بھی ملتی تھی تو گھر باریج کر۔ پھر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے ہوئے محبت کے لہجہ میں وعدہ کیا گیا کہ تمیز رنگ و زبان اور امتیاز حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں، اور جو راہ اپنے لئے باز ہے، وہی سب کی آمد کی منتظر، لیکن جب پاؤں اٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی، تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹی کا پتلا مخمور۔

یہ اور ایسے ہی حالات تھے، جن میں ملک مبتلا تھا۔ ہندو اٹھے اور انہوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لئے وقف کر دیا لیکن عین اُس وقت جبکہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے، بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سالولہ تنگڑا بنادیں۔ جبکہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لئے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں جادو کا ایک منتر بھونک دیا گیا تھا کہ ”وقت ہمیں آیا، اور یہ اُسی میں مسحور تھے۔ ایک الف لیلہ کا عفریت تھا جس نے جادو کے زور سے اُن کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا، پس یہ ملک کی ترقی کی رافہ میں روک کر پڑے تھے۔

مسلمانوں کے ملکی کارنامے

اس کے بعد وہ آنے والا مورخ، جو ہندوستان کا وقائع نگار ہو گا، لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہوتا تھا۔ بیسویں صدی میں کوئی ملک غلام نہیں رہ سکتا تھا اور نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانٹری بٹنٹل

گورنمنٹ تھی، چنگیز خاں کا تخت فہر نہ تھا۔ پس ملک آزاد ہوا، اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا۔ جو مسلم نہ تھی، پر جو مسلم "نئے انھوں نے ہمیشہ کُراچی کی جگہ غلامی کی اور سر بلندی کی جگہ سجدہ مذلت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی ملکی نجات یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہے، لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی، نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی، تعلیم چری اور عام ہوئی، فوجی مصارف میں تخفیف ہوئی اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت خود اختیاری ملی، تو صرف ہندوؤں قابلِ غت ہندوؤں، مسلمانوں کو تازیانہ غیر ہندوؤں کی وجہ سے، کیونکہ انھوں نے پائٹکس کو شروع کیا اور پھر پائٹکس اسی کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی، اور جب شروع بھی کیا تو شیطان نے یہ سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں، یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لئے رویں۔ اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں، چاندی سونا نہیں، اعلیٰ درجہ ہر نہیں، بلکہ تانبے کا ایک زنگ آؤدھیا یا سوہی روٹی کے چند ریزے اِذْلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيِنِنَا فَاصْصُرْ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۱۷۵:۷)

مِسلم لیگ

بے شک مدتوں کے بعد نیدرلینڈس، جس کو کفر کہا تھا اس کے ثواب و طاعت ہونے کا فتوے دینا پڑا، لیکن کیوں کر؟ اپنی قوت سے، اپنے

دامغ سے، اپنی ہمتی اور اپنی روح سے؟ نہیں بلکہ

اُن ہم بسی غمزہ مردم شکار دوست!

پہلے جن کے حکم سے گنہگاروں کے غاروں میں چھپے تھے، اب ابھین کے حکم سے
 باہر نکلے تاکہ مندر میں جا کر اُن کے آگے سر بسجود ہوں۔ بے شک شملہ ڈیوٹیشن
 کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیل گیا اور اس کا نام "لیگ" رکھا گیا
 لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتش کدہ رکھ دو گے تو کیا برف
 کی سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی؟ اگر تم ایک کھلونے کا ہتلاے کر اُس
 کے سینے کی پاس کی کل کو انگوٹھے سے دباؤ گے، تاکہ اپنے دونوں ہاتھ ہلا کر
 تالی جکے، تو کیا اس تماشے سے وہ انسان کا بچہ سمجھ لیا جائے گا؟ نادانوں
 چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو! شاید آج تک دنیا میں کسی قوم نے پالشیکر
 کی ایسی صریح تذلیل دتوین کی ہوگی، جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی۔ تم نے
 اے چاندی اور سونے کے پوجنے والو! تم نے کی۔ تمہارا وجود یکسر سیاست
 کی تحقیر اور تمہارے اعمال اس کی معزز پیشانی پر ایک کلنگ کا ٹیکہ ہیں۔
 تم نے غلامی کا ایک سبکدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔ تم نے
 سجدہ کا سر جھکا یا اور قوم کو دھوکا دیا کہ ہم عزت کا سر بلند کر رہے ہیں۔
 تم دلدل میں اپنے پاؤں ڈال کر کو در رہے تھے تاکہ اور خسف و غرق ہو،
 لیکن قوم کو کہتے تھے کہ ہم میدانوں میں دوڑ رہے ہیں۔ تم خود گمراہ تھے، پر
 اس پر بس نہ کی اور پوری قوم کو گمراہ کرنا چاہا کہ تُو اِنَّا صَلَّوْا فَوَيْلٌ
 لَهُمْ وَلَا تَجْبَعُهُمْ

مریفان رو دبر کروندگم قَوْنِ لَهْمُ ثَعْوَنِ لَهْمُ

باسمِ گفتہ ام دبار دگری گویم

کہ سوال چھت کا نہیں بلکہ اُن اینٹوں کا ہے جو بنیاد میں رکھی گئی ہیں۔ یہ بحث فضول ہے کہ دیوار کا کیا حال ہے، دیکھنا یہ ہے کہ بنیاد تو ٹوٹ رہی نہیں یا جھس ایک اُگ ہے جو خود بھڑکتی ہے اور پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ وہ برف کا گلاس نہیں ہے جو کسی سرد مہر سانی کی بخشش پر موقوف ہو۔ اولین گراہی یہ تھی کہ برسوں کی موت کے بعد زندگی کی کروٹ لی بھی تو اپنی اُٹنگ اپنے جوش، اور اپنی کسی قوت کے اعتماد پر نہیں، بلکہ محض کسی کے اشارہ چشم اور جنبش دستِ دعوت پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پالیٹکس غلامی کی ایک دوسری شکل بن گیا۔ اور راہ مقصود سے باز رہنے کے لئے ایک کھلونے کا کام لینے لگا۔ پھر اس کے بعد ساری قوت اس پر صرف کی جانے لگی کہ گورنمنٹ سے مراعات طلب کی جائیں اور جس طاقت کو گورنمنٹ کے مقابلے میں خراج ہونا تھا، اس کو ہندوؤں کے مقابلے میں صرف کیا جائے۔ یہ اس خمار کے لئے ترشی کا ایک پورا جرم ثابت ہوا۔ اصل شے قوم کا یہ محسوس کرنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہے نہ کہ کسی لکڑی کے سہارے، لیکن مراعات کی طلب جب پیدا ہوگی، خواہ اس کا کچھ ہی نام رکھا جائے، یقیناً اپنی قوت کی جگہ محض معطی کے احسان و کرم پر اعتماد ہوگا۔ بے شک مسلمانوں کو اپنے حقوق قومی کے تحفظ سے غافل نہیں ہونا چاہئے، لیکن ساتھ ہی اصلی سعی اس کی ہونی چاہئے کہ درخت اپنی جگہ پر مضبوط ہو۔ تم درختوں کے سائے

میں آرام و راحت لینے ہو لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تمہارے باورِ حیاؤں میں کون سی شے ملتی ہے ؟ وہ بھی درخت ہے ، لیکن جو درخت اپنی قوتِ نشترِ حیات سے محروم ہو جاتا ہے اس کو کاٹ کر چوڑے ہی کے سپرد کیا جاتا ہے ۔ پس زندگی صرف قوت میں ہے اور اعتماد کی جگہ دل ہے نہ کہ کسی کی چوکھٹ ۔
ملک کی غلامی کے لئے مسلمانوں کی قربانی

ہندو مسلمانوں کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناج رہے ہیں ۔ فوج میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور غنیمِ مطمئن ہے ۔ یہ خیال کہ تم نے انجی تعلیم میں ترقی نہیں کی ، اس لئے تمہارا پائلیکس یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنا غضب کردہ حقوق چھین لو ، غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت کی چال تھی ؟

وہ رہزن اور بھرا لے کیس سے

سات کروڑ انسانوں کی قوت کا نشانہ وہ خود کیوں بنے ، جبکہ تم اس قوت کو کسی دوسری جگہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو ؟ یاد ہو گا کہ ہم نے ایک بار اس کی طرف اشارہ کیا تھا ۔ ہندوستان میں قدرتی طور پر برٹش گورنمنٹ کو اپنے فوائد کے استحکام کے لئے ایک بڑی قربانی کی ضرورت تھی ، کہ کوئی ایک قوم ملک کو چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جائے اور اپنے ملک کی اُمیدوں کی قربانی کے خون سے اس کے اغراض کے درختوں کو سینچے مسلمانوں نے خود اپنے تئیں اس قربانی کے لئے پیش کر دیا ، اور جس بوجھ کے اُٹھانے سے ہندوستان کا تمام بوموں نے انکار کر دیا تھا ، اس کے لئے اول روز خود ہی اپنی گردن پیش

کر دی کہ :

بنشیں دردِ دل ویرانہ ام لے گنج مراد !
کہ سن ایں خانہ بسودائے تو دیراں کرم

الَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ، فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ

اگر مسلمانوں کی آنکھوں کو لیڈروں کے عملِ اسحر نے بند نہ کر دیا ہوتا، تو وہ اس منظر کو دیکھنے اور خون کے آنسو روکنے۔ وہ دیکھتے کہ یہ کیا بد بختی ہے کہ ملک کی ترقی و فلاح کا مسئلہ ہی سرے سے "ہندو مسئلہ" ہو گیا ہے، اور مسلمانوں کو مین حیثیت انھیں اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہاؤس آف کانس میں بحث آئے یا کانگریس کے اسٹیج پر "مسئلہ ہند" کے معنی "ہندو مسئلہ" کے ہیں۔ حالانکہ ملک کی ترقی و آزادی کی ذمہ داری اگر ہندوؤں پر ملک کی طرف سے تھی، تو اسے اپنے تئیں بھولنے والو! تمھارے سر تو خدا کے ذوالجلال کی طرف سے تھی! دنیا میں صداقت کے لئے جہاد، اور انسانوں کی انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے۔ پس تم تھے کہ تم کو خدا آگے کرنا چاہتا تھا، لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو، اور پھر اپنے آپ کو بھلایا، نتیجہ یہ نکلا کہ پیچھے کی صفوں میں بھی تمھارے لئے جگہ نہیں، قیاً حشرنا! ویأویلنا!

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ
فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْكَاسِيُونَ (۱۹:۵۹)

امدان لوگوں کی طرح مت بنو جنھوں نے خدا
کو بھلا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے ہی کو بھول
گئے۔ وہ یقیناً فاسقوں میں سے تھے۔

جمود حرکت نما

مکن ہے کہ آپ فرمائیں، یہ قصہ طویل اب انسان بے وقت ہو کیوں کہ دراصل تمام بھلی باتیں بھلائی جا چکی ہیں، غلطیوں کا اعتراف کیا جا رہا ہے، تقسیم جنگال کی تیغ کی ضرب محکم نے دکھائی الحقیقت آغاز عہد برطانیہ سے لے کر اس وقت تک ایک سب سے بڑی انسانی خدمت ہے جو اس نے انجام دی ہے ان باتوں کو بھی جو شل ہو گئے تھے پیٹھ تک پہنچا دیا ہے کہ چوٹ سخت لگی ہے۔ خود اب لیگ بھلی غلطیوں کی تلافی اور آئندہ کی اصلاح پر ملتفت ہے۔ ہٹانے اس کا سر برسوں بادہ غرور و کبر سے سرشار رہا، مگر اس عجز خمار کو بھی ٹوٹ گئے کہ اب قومی خواہشوں کے آگے

سر تسلیم خم ہے جو مزاج پار میں آئے

آپ نے کہا کہ اولین شے لیگ کے نظام کی تبدیلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہت بہتر۔ آپ نے شکایت کی کہ اگر ہلال احمد فٹ کی فکر نہ کی تو لیگ پھر کس مرض کی دوا ہے؟ ارشاد ہوا کہ اب کے یہ بھی لیجئے۔ آپ کا بڑا رونا یہ تھا کہ سفر بے منزل، اور سعی بے مقصود ہے، انھوں نے کہا کہ اس سے بھی انکار نہیں اب کے نصب العین کی جستجو میں بھی نکلیں گے۔ ابھی سامنے کی بات ہے کہ لیگ کے التواء پر آپ کو بہت غصہ آیا تھا، تجویزیں تھیں کہ ایک علیحدہ کانفرنس کا انعقاد ہو، انھوں نے معاً کہا کہ اور طرف کیوں جلتے ہیں کہ یہاں ایک صحبت خاص اس لئے بھی تیار ہے۔ پھر جب حالت یہاں تک رو باصلاح ہو چکی ہے تو اب پچھلے گلے شکوے کا کون موقع

ہے؟ اب تو پرانی باتوں کو تہہ کیجئے اور اُمیدوں کا دروازہ کھولئے کہ مدتوں کے
دبے دیبائے ارمانوں کے نکلنے کا دقت آگیا۔

دیدار شد میسر و بوس و کنار ہم
از بخت شکر دارم داز روزگار ہم
لیکن میں عرض کروں گا کہ ذرا صبر کیجئے اور زبانون کو نہ روکئے کہ دراصل
شکوے شکایت کا دقت پہلے نہ تھا، دقت تو اب آیا ہے۔ ہم بھی اسی روز
آزمائش کے منتظر تھے۔

کچھ ہوئے گا عشق دیہوں میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج نرا امتحان پر
لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ :

حکم اخیر کی بھی توقع بروزِ شہر
بانیِ ربانہ دن ہی جب اٹھا رہو چکا
ہائے اُس زرد پشیمان کا پشیمان ہونا !

اول تو :-

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سرتوبہ

اور پھر یہ جو کچھ ہے صرف الفاظ ہیں جن میں مائی کا نزدل باقی ہے۔ محض جستجو کے
امادے سے منزل نہیں مل سکتی، آپ سرخس اور چونا دہیا بھی کر لیں، پھر بھی
مکان نہیں بن سکتا جب تک کہ معمار نہ ہوں۔ شاید لیگ کی یہ نئی ادائیں توبہ
شکن ضرور ہیں، لیکن ابھی ایسی نہیں ہیں کہ واپس لیا ہو ادل پھر اس کے

حوالے کر دیں۔

کھلے کیا دل در در دیوار کے آثار باقی ہیں
ہوا ہر چند گھڑویران صحرا، پھر بھی صحرا ہی
البتہ بعض خام کاران ہوس پیشہ سے کھٹکا ضرور لگا ہے کہ کہیں ان
صبر آزما اداؤں پر لوٹ نہ ہو جائیں۔

وہ حلقہ ہلے زلف کیوں میں میں لے خدا
کچھ بھیمو مرے دعوئے وارستگی کی شرم
نظام نرکبی کی صلاح اور نصب العین کی جستجو یقیناً ازالہ مرض کے لئے
اصلی علاج کی تلاش ہے۔ مگر تلاش کا ہونا ہی صحیح تشخیص اور مفید نسخے کے
مہیا ہو جانے کے لئے کافی نہیں، ضرورت ہے کہ تشخیص کی جستجو صحیح راہ پر ہو
اور نسخہ جو تجویز کیا جائے وہ دفع مرض کا اصلی علاج ہو۔ لیگ اگر یہاں تک
کے لئے راضی ہو گئی ہے تو زبے نصیب! لیکن ابھی یہ پوچھنا باقی ہے کہ
کہنے کچھ بڑھکے بھی ہمت ہوگی؟

راضی نامہ

اصل یہ ہے کہ لیگ کی طرف سے پوری مایوسی مٹتی اور ہے، جب تک کہ
وہ اپنے تئیں اب امید کا سختی ثابت نہ کر دے۔ قوم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے
کہ نہ صرف اہم امورِ سیاسیہ کے لئے، بلکہ ادنیٰ درجے کی سیاسی ضروریات کے
لئے بھی لیگ بے کار ہے اور اس لحاظ سے سخت مُضر، کہ قوم کا آئندہ راستہ
روک کر کھڑی ہے۔ پس عین اس وقت جبکہ صاف صاف یہ ہے کہ ہم لیگ کو

کا عدم یقین کر کے اپنی راہ ڈھونڈ رہے ہیں اور دل کے ایک نئے ٹھکانے کی فکر میں (الحمد للہ) کہ پہلے سے اچھی حالت میں ہیں، لیگ بکر سامنے آئی ہے اور کہتی ہے کہ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ، اور اب پھر مجھی کو دیکھو اچھی بات ہے۔ پہلی پہر خواہ کیسی ہی بے مرہ گذری ہو، لیکن رات کا آخری حصہ تو ابھی باقی ہے، اور گو مرغ سحر کی چٹخیں چاروں طرف سے سُنائی مے رہی ہیں، مگر ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ جو کچھ گذر چکا ہے دن تھا اور دراصل شب وصال اب سے شروع ہوئی ہے۔

وصال پر بے جو وصل، ممتسان کر دیکھو

اسیر یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو

اگر لیگ پھر ہمارے دلوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو بہتر ہے کہ ہم میں اور اس میں ایک راضی نامہ ہو جائے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نے اُسے طلاق دے دی تھی لیکن اب پھر وہ آنا چاہتی ہے تو عقد رجعت سے بھلار نہیں۔ البتہ اس کو تو اپنی غیرت کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ "حلالہ" کو منظور کر لیں۔

ہمہ غیری دمی گوئی بیا عرتی تو ہم

لطف فرمودی برو، کیس پئے راز فتنیت

یہ راضی نامہ بالکل ایک منصفانہ معاہدہ ہوگا اور شرائط میں کوئی سچ و خم نہیں۔ لیگ پچھلی باتوں کو بھلا دے، اپنے گھر کو صحبتِ اغیار سے خالی کرے۔ اور ہم سے لگاؤ رکھنا ہے تو غیروں سے لگاؤٹ چھوڑ دے

پھر ہم بھی دوسرے ٹھکانوں کی فکر چھوڑ کر اُسی کے ہو رہے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ معاہدہ آخری ہوگا، اگر پھر کبھی اختیار کی پرچھائیں بھی نظر آئی تو بس لیجے سلام، اپنا بھی وعدہ ہو کسی سے

اس کو بھی کھول کر کہہ دیں کہ صحبت غیر سے کیا مطلب ہے؟ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ سے غیرت عشق کے انتہائی مطالبات کئے جائیں۔ ہیں اس سے کوئی چڑھ نہیں کہ گورنمنٹ سے پورے تعلقات رکھے، کانگریس کی موجودہ حالت کی نظر آپ کے سامنے ہے، اب تو گورنمنٹ خود اُمید کی جرات افزائی کر رہی ہے۔ لیکن تعلقات کے یہ معنی سمجھے کہ اچھے وقتوں میں اپنے دقار اور متانت کے تحفظ کے ساتھ درچار گھڑی ہنس بول لیا، یہ نہیں کہ

ہم شب شراب خوردن، ہم روز خواب کمر دن
شرائط صلح، نصب العین

سب مقدم نہ مسئلہ پولیٹیکل جدوجہد کے لئے ایک نصب العین کی جستجو ہے، اور اگر آپ کو زندہ رہنا ہے تو کسی مقصد بلند کی نگینھی سدا گئے جو ہر وقت آپ کے دل کو گرم رکھے۔ یہ بار بار کہا جا چکا ہے۔ کوئی قوم اپنی جدوجہد میں اصلی سرگرمی اور جذبات و قوی کا ایثار نہیں کر سکتی، جب تک اس کے سامنے ایک جاں طلب نصب العین نہ ہو، اور اب آپ کو کیا سمجھائیں کہ آزادی تو وہ مقصود ہے جس کا تصور بھی دل کی زندگی کے لئے کافی ہے۔ رہے پہلو میں وہ یا اس کا خنجر غرض دل ٹھہرتا ہے ہم نشیں سے۔

لیگ تلاش میں نکلی ہے تو اس کو بھٹکانا نہیں چاہیے۔ ہندوستان میں سیاسی
نصب العین کا سوال ایک ہی ہے۔ گو اس بارے میں ہماری راہ عام شاہراہ
سے الگ ہے، اور ہم اس چیز کو دوسری طرف سے آکر لینا چاہتے ہیں، لیکن
لیگ سے اس کی توقع لا حاصل ہوگی، پس اس کو چاہئے کہ اس ایک ہی
نصب العین کا اعلان کر دے، کہ ”انگلستان کے ماتحت ہندوستان
کی حکومت خود اختیاری“:

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یاد رکھو کہ یہ نصب العین جو ہم نے تجویز کیا، تو کوئی بہت اونچے درجے
کی بات نہیں کہی ہماری ہمت کا آئینہ اس شاخ سے بھی بلند تر جگہ ڈھونڈنا
ہے، تاہم یہی بہتر ہے کہ آپ سلف گورنمنٹ کو اپنا نصب العین سیاسی قرار
دیں اور آج کے دن سے سفر شروع کر دیں۔ اگر ایک دلکش منزل آپ کے
سامنے ہوگی تو پھر سفر کی تکلیفیں بھی بھول جائیے گا۔!

رہرواں راستگی راہ نیست

عشق ہم راہ ست ہم خود منزل است

تیس برس سے جو سچ اس مسئلے کی نسبت پڑے ہوئے ہیں ان پر
ادھر بار بار نگھا جا چکا ہے۔ ہندوؤں کی مجاری، مختلف عناصر کی باہمی
رقیبانہ کشاکش، ہندو مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ کے اثرات، ملک کی
عدم تیاری، مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں باہر کی حکومت کی بہتری
اور اسی طرح کے وہ تمام دساوس و ذراعات نفسانیہ، جو مسلمانوں کے دلوں

میں جاگزیں کئے گئے تھے، ہمیں حسن ظن ہے کہ اب بھلائے جا چکے ہیں۔ سلف گورنمنٹ اسی لمحے نہیں مانگی جانی کہ ملک کی استعداد اور عدم استعداد کا افسانہ دہرایا جائے۔ مقصود ایک نصب العین کو سامنے رکھنا، اور بتدریج اس تک پہنچنا ہے۔ ہندو مجارٹی کے عفریت کا خوف بھی اب خدا کے لئے دل سے نکال دیکجئے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی دوسوہ تھا جو مسلمانوں کے قلب میں افکار کیا گیا۔ طاقت محض تعداد پر نہیں بلکہ اور باتوں پر موقوف ہے۔ اصل شے قوموں کی معنوی قوت ہے، جو اس کے اخلاق اس کے کیرکٹر، اس کے اتحاد اور دراصل ہماری اصطلاح میں خشیت الہی، اور اعمالِ حسنہ سے پیدا ہوتی ہے۔ **وَكَمْ مِنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَتُكَ يَوْمَئِذٍ بِالَّذِي اللَّهُ** اسلام کی طاقت کبھی بھی دبستہ دام قلت و کثرت نہیں رہی ہو اور اب بھی جن دنوں میں اسلام ہو، وہاں اکثریت بالکل بے اثر ہے **لَا يَهْتَوُونَكَ** **هَٰذَا كَوْمًا وَاكْثَمُ إِلَّا هَلَكُونَ** اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ یہ تمام دسادس اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ملک کے سامنے کوئی مشترک اور بلند نصب العین نہیں ہے۔ اگر روزِ اول سے یہی ہو گیا ہوتا کہ سب مل کر ایک ہی نصب العین علی کی طرف دیکھنے لگتے تو اور کسی طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں ملتی، اور وہ تمام قوتیں جو آج باہمی جدال و قتال میں صرف ہو رہی ہیں، اسی کے پیچھے صرف ہوتیں۔

بے توجہی سے نہ سنے کہ ایک بہت بڑا حکمتِ عمل کہہ رہا ہوں، اور اپنے طرزِ بیان کا شکی ہوں کہ اسرارِ درموز کی باتیں بھی حسن و عشق کی

کی کہانی بن جانی ہے۔ اپنے سامنے ایک جان ساں جلوہ گاہ حسن پیدا کر لیجئے پھر اگر آپ دوسری طرف دیکھنا چاہیں گے بھی تو نہیں دیکھ سکیں گے۔ آپ کی تمام بے راہ روی، نفس پرستی، اغراض پسندی، باہمی جنگ و جدال، ابتلا و فرویت فراموشی، اور ہر قسم کے اشغال و ضلالت صرف اس لئے ہیں کہ سامنے کوئی کشش نہیں، اور جس بلائے عقل و ہوش کو ہم دیکھ رہے ہیں، آپ نے ابھی دیکھا ہی نہیں جس دن ایک اچلتی ہوئی نظر بھی "آزادی" کے حسن پر پڑ گئی، پھر آپ خود بخود تمام قصے بھول جائیں گے

وَيَسْمَعُونَ كَمَا يَمِغْتِ كَلَامُهَا كَحُورِ الْعَرَةِ تُجَوِّدُ اسْرَتَهَا

اسی طرح سنی ہوتی جیسی کہ میں سن رہا ہوں تو معاً اس کے آگے بجدے میں گر پڑتے۔

مشکلاتِ راہ

بہت سے لوگ ہیں جو یہاں تک ہمارے ساتھ آگئے ہیں کہ مسلمانوں کو بھی یہی نصیب العین اپنے لئے تجویز کرنا چاہئے۔ مگر مشکلاتِ راہ سے گھبراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شراب کڑوی ہے، نشہ و سرور کے انتظار میں حلق و دہانہ کو کون بد مزہ کرے؟ لیکن اب ہم ان سے کیا کہیں کہ کوئی گھونٹ حلق سے نیچے اترا ہی نہیں۔ کسی طرح منہ بنا کر ایک جرعه اتار لیجئے پھر پوچھیں گے کہ کڑوی ہے یا میٹھی؟

حریف صافی و دردی نئی، خطا میں سب تیز ناخوش و خوش میکنی، بلا میں جاسب

اے اخوان غفلت شعار، نہیں معلوم اب تک آپ کس دم میں پڑے ہیں؟ یہ نقل سیاست ہے، یہ مشہد آزادی و حریت ہے، آپ کا سی سالہ میدان ہو و لعب نہیں ہے۔ اگر آپ مشکلوں سے گھبراتے ہیں تو آپ کے لئے بہتر جگہ بھولوں کی سیج ہے۔ یہ آپ سے کس کجخت نے کہا ہے کہ اس خارزار میں قدم رکھئے؟ یہاں آئیے گا تو قدم قدم پر کانٹے ملیں گے ہر لمحے مصائب کا نزول ہوگا۔ آپ مشغلات سے گھبرا رہے ہیں حالانکہ یہاں تو جانوں اور زندگیوں کی قربانی کا سوال درپیش ہے یہاں ہوس پرستوں کا گذر نہیں۔ اس میدان کے مرد وہ جان فروشان الہی اور مجاہدین حق پرست ہیں، جن کے سرگردنوں پر نہیں بلکہ ہتیلیوں پر پر رہتے ہیں۔

در مدرسہ کس را نرسد دعویٰ توحید

منزل گہ مروان موجد سردارست

سیاست کی جنس اتنی سستی نہیں ہے کہ چند تجویزیں گھڑ کر اور شکریہ کے سجدے کر کے اپنے عیش کدوں میں چھپ جائے گا، اور وہ آسمان سے دھونڈتی ہوئی آپ کے سامنے آ موجود ہوگی! آپ سے کوئی نہیں کہتا کہ آئیے، لیکن آنے کا ارادہ ہی تو اپنے دل و جگر کی طاقت کو ٹٹول لیجئے کہ اس طریق عشق کی شرطیں آپ کو معلوم نہیں۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر

در طریق عشق ادل منزل است

غلامی کے تیلے اور سیاست کی روح کا دعوے

آپ مجھے گزشتہ اعمال سیاست سامنے آجاتے ہیں، تو ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ آپ نے برسوں سیاست کے ساتھ جو تفسیر کیا ہے، اس کی نظیر شاید ہی کسی قوم کی ضلالت و گمراہی میں ملے۔ ہر خوشامد و غلامی کی غلامیت کا کیرا جس کا وجود اغراض پرستی کی کثافت سے متعفن ہوتا تھا نکلتا تھا اور دعوے کرتا تھا کہ میں مرد میدان سیاست ہوں اور قوم کے پولیٹیکل اعمال کا مصلح! جن عیش پرستوں کو کسی آزمائش میں پڑنے کی ہمت ایک طرف، اتنے کی بھی برداشت نہ تھی کہ گورنمنٹ کے چشم و ابرو کی ذرا سی بے مہر می بھی گوارا ہو، اس کا دعوئی ہوتا تھا کہ ہم قوم کے پولیٹیکل کارزار و اعمال کے سپہ سالار ہیں، اور نکلے ہیں تاکہ اس معرکے میں اپنی تلوار کے کاٹ دکھلائیں! ارباب نظر ان ہوس پرستوں کو دیکھتے تھے، ہنستے بھی تھے اور زمانے کی بولچھی پر روتے بھی تھے

ہر بولچھی نے حسن پرستی شعار کی

اب ابروئے شیوہ اہل نظر گئی

اللہ اللہ! جس متاع یوسفی کے لئے زلیخا آباد حریت میں تڑپتی ہوئی لاشیں اور کٹی ہوئی گردنیں بھی طلب کی جائیں تو اپنے اوج طالع پر ناز کریں کہ مفت ہاتھ آئی، اس کی قافلہ لیگ میں یہ ارزانی، کہ چند کھوٹے درہم ہاتھوں میں لے کر بولیاں بولی جاتی ہیں! وَشَوْءٌ يَّمْنَنُ
بِحُسْنِ دَرَاهِمٍ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ

لے جائے دکھلانے اُسے مصر کا بازار

خواہاں نہیں پر کوئی دہاں جنس گراں کا

لے بے خبرو! یاد رکھو کہ زندگی کی خواہش ہے نو مشکلات سے گھبرانا
لا حاصل ہے۔ کیونکہ مشکلیں زندہ اور متحرک انسانوں ہی کے لئے ہیں، ایک
بے معر لاش کے لئے نہیں ہیں۔ آرام کی خواہش ہے تو اس کی سب سے
بہتر مہ بقرہ، بیٹھے رہو گے تو یقیناً ٹھوکر نہیں لگے گی پر جب چلو گے
تو ٹھوکریں کھانا ضرور ہے۔

اصلاح و تغیر نظام

آخر میں ہم جذبات لایگ کے نظام کی تبدیلی کی نسبت بھی کہہ دینا
چاہتے ہیں۔ نہیں معلوم کار فرمایان لایگ نے اس کا کیا مطلب سمجھا ہے،
مگر ہم نے مدتوں سے جو کچھ سمجھا ہے اس کے سوا چارہ کار نہیں۔ یاد رہے
کہ لایگ کی اصلی بنیادی گراہی اسی مسئلے میں پوشیدہ ہے۔ دنیا میں تمام کاموں
کے لئے تقسیم عمل کا اصول ہے، اور پھر ہر گروہ کے حالات مختلف، اور
اس لئے ایک ہی کام کے لئے سب موزوں نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں نے
اصولی غلطی یہ کی کہ پولیٹیکل کاموں کے لئے بھی طبقہ و خاصہ امر کی رہنمائی میں
ہاتھ دیا جو سر سے کر پادل تک ہزاروں زنجیروں میں پٹا ہوا ہے اور
آپ سے بھی ملے گا تو انھیں زنجیروں میں جکڑ بند کر کے چھوڑے گا۔ اس کے
پاس یا دولت ہے یا زنجیریں۔ تیسری شے نہیں ہے۔

پس اصول عمل یہ ہے کہ آزادی کے کام کرنے والے صرف آزاد

ہوں، اور پھر ان میں جو دولت کے ساتھ دماغ بھی رکھتے ہیں، وہ صرف اپنی دولت اور دماغ سے الگ رہ کر فائدہ پہنچائیں۔ امریکہ میں کارنکی اور راک فیلر کے پاس بہت خزانہ ہے لیکن پھر یہ نہیں ہے کہ وہی امریکہ کے پرینڈنٹ بھی ہوں۔

در اصل ان بزرگانِ خواص کا بھی اتنا تصور نہیں، جس قدر کہ آپ کا تصور ہے۔ آپ ان کو اپنے میں کھینچتے ہیں تو ان کو آنا پڑتا ہے، حالانکہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ ہم بھی ان کی جگہ ہوتے تو وہی کرتے جو وہ کر رہے ہیں۔ پس لیگ کی زندگی کے لئے ایک قدم کام بہ بھی ہے کہ وہ اس امر کا قطعی فیصلہ کر دے، اور اپنے پالیٹکس کی باگ دولت کے ہاتھ سے نکال کر دماغ کے سپرد کر دے جس شخص کو اپنی دولت اور جائداد کی حفاظت کی فکر سے رات کو نیند نہیں آتی اس کی صبح کو زبان کیا کھلے گی؟

اسی اصل کی ایک شلخ یہ غلطی بھی ہے کہ لیگ نے پالیٹکس کا دخت علی گڑھ کی سرزمین میں بویا، حالانکہ وہاں پیشتر ہی سے جو درخت موجود تھا، اسی کی جڑ میں گھن لگ چکا تھا

قید کی بقبر میعاد

وقت آگیا ہے کہ اشخاص کی جگہ قوم کے ہاتھ میں لیگ دے دی جائے اور طبقہ خواص کے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا جائے کہ اب اُنیدہ کے لئے معاف کیجئے اور ہمارے تصوروں کو بخش دیجئے۔ ہمارے تصور واقعی بڑے سنگین ہیں، ہم نے آپ کی گاڑیاں کھینچیں، پھولوں کے ہار پہنائے، خود جانور بنے۔

اور انہی رسی آپ کے ہاتھ میں دیدی بالیقیناً اس کی سزا بھگتنی تھی اور اچھی طرح بھگت لی۔ اب اگر آپ کے دفتر تفریرات میں چند سال سزا کے اور باقی رہ گئے ہیں ہماری قید کے پچھلے سالوں کے چال چلن پر نظر ڈالئے اور گورنمنٹ کا قانون ہے کہ قیدی اطاعت شعار ہو تو آخر کے چند مہینے معاف کرنے جاتے ہیں، پس آپ بھی رحم کیجئے۔ ہم کو چھوڑ دیجئے اور ہم کیجئے کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں محض لیگ کے قواعد و ضوابط کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس مسئلے کا فیصلہ نہ ہو۔

مسلم پولیٹیکل فنڈ

ایک علی سوال یہ ہے کہ اگر لیگ چند دولت تدارک شاخص کے بند غلامی سے آزاد کر دی جائے، تو اس کے کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے لے گا؟ اب تک تو ایک قائم دفت کی بنیادی تھی، جس کی دریا دلی سے تمام خشک کھیتیاں سرسبز تھیں، لیکن اگر آزادانہ اسپرٹ پیدا کی گئی، نصب العین کا اعلان کیا گیا، اور اصلی کاموں پر ملتفت ہوئے تو وہ تمام لوگ جو کلکٹر صاحب کے حکم کے بغیر پانی پینا گناہ سمجھتے ہیں، یا جن کے نزدیک ڈپٹی کمشنر کی اجازت کے بغیر کسی جگہ کی ریسپنشن کمیٹی کا صدر مباحرام ہے، قطعاً الگ ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَدَبُّكَ اور پھر اس دست کرم کی بخشش بھی موقوف ہو جائے گی جس کی خاطر اب تک سجدے کئے ہیں اور موت کو زندگی پر ترجیح دی ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں یہ مسئلہ ایک لمحہ کے لئے بھی مانع کار نہیں

ہو سکتا۔ ہم نے جیسا کہ کلکتہ میں اپنے مکرم دوست جناب سید وزیر حسن صاحب سے زبانی بھی کہا تھا، اگر آج لیگ کی نسبت قوم کو یقین ہو جائے کہ وہ سرآغا خاں کی ہنہیں بلکہ قوم کی ہے، تو جس قدر روپیہ آپ کو مطلوب ہے ایک لمحہ کے اندر جمع کر لیجئے۔ آپ قوم کے جذبات سے جب کام ہی نہیں لیتے تو قوتوں کا ظہور کیونکر ہو؟

ہمارا خیال ہے کہ اگر لیگ اصلی راہ کی طرف متوجہ ہو تو اس کو فوراً ایک قومی سیاسی فنڈ کے قیام کا اعلان کر دینا چاہئے، جس کا مقصد یہ ہو کہ پولیٹیکل کاموں کے لئے روپے کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔ لیگ کی نمبر ۱ کی رقم بھی موجودہ تعداد سے المضاعف ہو سکتی ہیں اور چند دنوں کے اندر بغیر کسی دقت کے ایک ایسا مستقل مالی انتظام ہو جاسکتا ہے، جو سرآغا خاں کے موجودہ وظیفہ سے دو گنے تک پہنچ جائے۔ ہم کامل یقین اور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ ایک حقیقی پولیٹیکل مجلس کی اعانت کے لئے تمام قوم تیار ہے بشرطیکہ قوم محسوس کرے کہ یہ ہماری چیز ہے نہ کہ غیروں کی۔

فالجہاد فی سبیل الحریۃ

مضمون بہت بڑھ گیا ہے لیکن اس بارے میں ہم اپنے خیالات کے ہجوم کے آگے مجبور محض ہیں۔ بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں، لیکن جو باقی ہے اس کی ترجمانی کو اپنی زبان کی جلد آپ کے دل کے سپرد کرنا ہوں، اور صرف چند لفظوں کے عرض کرنے کی اور اجازت چاہتا ہوں۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راہیں بسر ہو چکیں اب خدا کے لئے
 بسر نہ ہونشی سے سر اٹھا کر دیکھئے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے
 ہم سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولئے کہ آپ اور کوئی
 نہیں بلکہ ”مسلم“ ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات
 رکھتی ہے۔ کب تک اس دین الہی کو اپنے اعمال سے شرمندہ عالم کیجے گا؟ کب
 تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسائے گا؟ اور خود نہ روئے گا؟ اور کب تک ہندوستان
 میں اسلام کی قوت کا خاتمہ خالی رہے گا؟ اگر مصائب کا نازیبا نہ غفلت کی
 ہش باری کا ذریعہ ہے تو کون سے مصائب ہیں جن کا آپ پر نازل نہیں
 ہو چکا ہے؟ وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ هَارُونَ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَغَاثُوا إِلَيْنَا فَيَجِيئُ
 وَمَا يَنْصُرُهُمْ عُنُونٌ

یاد رکھئے کہ سب دلوں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا
 داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی، اور داخل جہاد
 فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے
 معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی سب
 استبداد و غلامی کے توڑنے کے لئے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی
 فلاح اور آزادی کے لئے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں، یقین کیجئے
 بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف، جس کے لئے دراصل سب
 سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔ پس اُٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اٹھانا چاہتا
 ہے اور اس کی بھی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں، بیدار ہوں، اور

اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔ ہندوستان میں تم نے کچھ نہیں کیا حالانکہ اب تمہارا خدا چاہتا ہے کہ یہاں بھی وہ سب کچھ کرو جو تم کو ہر جگہ کرنا ہے۔

جَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ۚ إِنَّ بُشْرًا لِلَّذِينَ ابْتَدَأُوا ۚ عِنْدَ اللَّهِ الْقَتْلُ الَّذِي لَا يَعْقِلُونَ ۚ

پس اللہ کی طرف سے بشارت ہے
اللہ کے ان بندوں کے لئے جو کلام حق
کو کان لگا کر سنتے ہیں اور اس کی

اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ یہی وہ
اولوالالباب

لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے ہدایت کے لئے کھول دیا ہے اور یہی عقل سلیم رکھنے والے ہیں۔

ادب

خط و کرب
اکاذیب و شرمناک
مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام
الہلال، ۱ ستمبر، یکم اکتوبر ۱۳۱۵ء
الہلال، ۲۲ اکتوبر ۱۳۱۵ء
الہلال، ۱۷ جون ۱۳۱۵ء

خط و کرب

یا
لذت و الم

(۱)

مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ، إِنَّ يَتَّبِعُونَ
إِلَّا الظَّنَّ، وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي
مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔

اس بارے میں اُن کے پاس کوئی علم اور
ذریعہ تحقیق و بصیرت نہیں۔ محض اپنے گمان پر
چل رہے ہیں، اور راہِ حق و حقیقتِ علم کے سامنے
کایہ حال ہے کہ وہ حقیقتِ علم کے سامنے
کچھ بکا رہ آ رہے ہیں!

جمع اضداد کی لوگوں نے عجیب عجیب مثالیں دی ہیں ایک زمانے
میں مسیح رکنا کاشی کے اس مصرعہ پر تمام اساتذہ عجم نے طبع آزمائیوں
کی تھیں۔

روئے در بابل و قعدیا آتش است !

یہ تو خباستان شعر کے افسانے تھے، مگر میں واقعی مثالیں دے سکتا ہوں۔ میرے سامنے مسلمانوں کا نیا تعلیم یافتہ فرقہ ہے۔

یورپ کی ترقیات نے عجائب و غرائب کو واقعات بنا دیا ہے۔ ضرور تھا کہ اس خصوصیت عجیبہ کا اثر اس کے پیروں میں بھی کرشمہ ساز عجائب ہوتا کہ یہ بھی اسی آفتاب تابندہ فضل و علو کے ذریعے، اور اسی شجر کمال درفعت کے برگ و بار ہیں۔

گرچہ خوردیم، نسبتی ست بزرگ

ذریعہ آفتاب تا بانسیم !

ایک مرتبہ میں نے انھیں صفحات پر اس فرقے کے "جہل و علم" کے اجتماع نقیض پر مرثیہ خوانی کی کھئی۔ احباب کرام کو باد ہوگا۔ آج "تقلید و اجتہاد" کے اجتماع ضدین پر متحیر ہوں کہ ان ہذا الشیء عجیب!

ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجیب حال ہے۔ ان کے پاؤں کو دکھئے تو یورپ کی نا فہمانہ و کورانہ تقلید و عبودیت فکر کی زنجیروں پٹی نظر آتی ہیں مگر چہرے کی طرف نظر اٹھائیے تو زبان کو ادعا، اجتہاد سے فرصت نہیں! اس سے بڑھ کر دنیا میں جح اصدا کا اور کونسا تماشا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے، اور عین اس وقت جبکہ اُس کے پاؤں میں تقلید و استعباد کی زنجیروں بازرب کی طرح صدا دے رہی ہوں، اجتہاد فکر اور حریت رائے پر بے تکان کچر دینا شروع کر دے !!

ہمارے دوستوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان کا سراپہ علم و دانش یورپ کی اسی وسطی تقلید سے زیادہ اور کچھ نہیں، تاہم جن چیزوں میں وہ اپنے ائمہ ہنگام کی تقلید کرنا چاہتے ہیں، انھی میں اپنی شے اجتہاد تھی اور ضرور تھا کہ اس تقلید مجتہدانہ کا سفر اسی منزل سے شروع ہوتا۔ فنیجی ہاتھ میں ہو تو غرہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے کہ کسی چیز کو تراشے۔ اس اجتہاد کی فنیجی ہمارے چابک دست دوستوں کے ہاتھ آگئی تو بے کار بیٹھانہ گیا۔ یورپ کے علم و عمل کے سر رشتوں پر نوکیا جلتی کہ وہیک کارخانے کی بنی ہوئی تھی، بس اپنے یہاں کی جو چیز سامنے آگئی وہی ملا تامل آلامش بنی۔ پھر اس کی روانی بے پناہ، اور اس کی کاٹ بے روک تھی۔

سب سے پہلے مشرقی علوم و فنون، تہذیب و تمدن، اور اخلاق و آداب قومی سے اس کی آزمائش شروع ہوئی، اور تھوڑے ہی دیر میں سیکڑوں برسوں کے صفحات و اوراق قدیمہ پرزے پرزے نئے ! پھر غریب مذہب کی باری آئی۔ یہ کپڑا دبیر تھا، اس لئے مقرض اجتہاد کی روانی بھی زیادہ تیز و شدید تھی۔ پھر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی آزمائش کا ہو چکا تھا۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے، انہیں معلوم اور کتنی گھڑیوں کا جہان ہے ؟

کچھ دنوں سے یہ فنیجی زنگ آووسی ہو گئی تھی، مگر میں ڈرنا ہوں کہ اب ایک نئی آزمائش شاید شروع ہونے والی ہے، اور مذہب و علم کے بعد زبان کا میدان جو لا نگاہ اجتہاد بننے والا ہے۔

ایک نیافتہ لغویہ !

تہذیب کی ان چند سطروں میں جو اشارات کئے گئے ہیں، یہ حالت عام تعلیم یافتہ فرقے اور ان کے بعض صنائد و دائمہ طریقت کی ہے، لیکن آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص یقیناً ایسے بھی ہیں، جن کو اس عام حالت میں حتیٰ امتیاز و استثناء حاصل ہے۔ اور ہماری عام مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نمایاں نشان اُمید رکھتے ہیں۔

میں اُن کی وقعت کرتا ہوں اور میری بہترین خواہش یہ ہے کہ ان کے ذریعے قوم کی وہ نامراد اُمیدیں زندہ ہو سکیں، جو ۴۰ سال سے نئی تعلیم کے ساتھ وابستہ رہی ہیں اور مایوسی کے سوا انہیں کچھ نصیب نہیں ہوا ہے۔ اس طبقے کی اس تعجب انگیز خصوصیت سے بھی جو میرے لئے "جہل علم" کے اجتماع نقیضین کی صورت میں ہمیشہ درد انگیز رہی ہے الحمد صد کہ یہ نفوس معدودہ و قلیلہ منشی ہیں۔ اور مطالعہ علوم و ذوق تصنیف و تالیف سے نا آشنا ہیں۔

انہی چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبد الماجد "بی بی" بھی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کے انشاء و حدیث فائدہ پہنچائے گا۔ اور علوم حدیث کے تراجم میں ان سے بہت مفید مدد ملے گی۔ جو اب تک اردو زبان میں گویا مفقود محض ہیں۔

لیکن مجھ کو نہایت افسوس اور رنج ہے کہ "خط و کرب" کے معاملے میں وہ ایک نہایت سخت غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اور بجائے اس کے کہ

جو مشورہ ان کو دیا گیا تھا، اس کو تسلیم کر لینے، محض لامحل بحث، منافیہ میں پڑ گئے ہیں حالانکہ یہ معاملہ ان کے بس کا نہ تھا۔ نہ تو ان کو اس بارے میں معلوم حاصل تھا اور نہ ان کے مذاق و مطالعہ کی یہ چیز ہے۔ ان کو انگریزی سے ترجمہ کرنا چاہئے اور بس اصطلاحات کے باب میں واقف کاروں کے مشورہ کو قبول کر لینا ہی بہتر ہے۔ انھوں نے زبان کے متعلق ایک عجیب و غریب اجتہاد کیا ہے۔ یہ اجتہاد جس قدر غلط ہے، اتنا ہی متعدی ہونے کی صورت میں زبان اردو اور ادبیاتِ علم کے لئے مضر بھی ہے۔ ان کی دوسری تحریر میں نے کلکتہ آکر پڑھی اور میں ان کو یقین دلانا ہوں کہ یہ ایک فتنہ لغو یہ ہے، جس کی ابتداء کا بار وہ اپنے سرے رہے ہیں اور خدانہ کئے کہ وہ زیادہ متعدی ہو۔

علم و اخلاق میں اجتہادات ہو چکے ہیں۔ مذہب اسی خیر اجتہاد کا قتل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے مشق اجتہاد کے لئے یہ میدان کافی تھے غریب زبان کو تو اب جھوڑی دیکھئے۔ پچھلے اشغال اجتہاد یہ ہیں اب بھی مصروفیت کی اور گنجائش نکل سکتی ہے۔ اگر اس نئے مرحلے کو اردو ترجمہ متعدی کر دیا گیا تو کچھ آپ لوگ بے کار نہ ہو جائیں گے۔

مسئلہ وضع اصطلاحات اور حفظ و کرب

ایک وقت میں انسان کس کس چیز کو لکھے؟ مجھے اس بارے میں دفتر کے دفتر لکھنے ہیں مگر مجبور ہوں۔ میں آج پھر اپنے گزشتہ جملے کو دہراتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اس مسئلے کو لوگوں نے اپنی نادانیت و عدم بصیرت

سائین کی وجہ سے جیسا کچھ مشکل سمجھ رکھا ہے وہ سب نہیں ہے۔ جو مشکل ضرور ہو مگر اشکال سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں ہوتا۔

سر دست خط و کرب اور PLEASURE اور PAIN ہی کو ایک مثال قرار دیجئے اور کچھ دقت عنایت فرمائیے۔

میں نے اپنے دوسرے نوٹ میں حسب ذیل امور پر توجہ دلائی تھی۔

۱۱، عربی میں لذت دالم بعینہ انہی معنوں میں بولا جاتا ہے جن کی گھنٹی تلاش ہے۔

۲۱، خط کا لفظ لذت کے معنی میں بالکل غلط ہے۔ لغت میں بھی اور اصطلاح میں بھی، نیز اس کے معنی کو مفہوم ماسخن فیہ سے کوئی قرب و تعلق بھی نہیں۔ پھر کون سی مجبوری ہے کہ لذت دالم کو جمع پڑ کر خط و کرب اختیار کیا جائے؟

۳۱، عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جو فارسی میں آکر اپنے اردو معانی لغویہ سے الگ ہو گئے۔ لیکن خط فارسی میں بھی بسنی لذت نہیں بولا جاتا۔ چنانچہ اشعار اساتذہ سے متحقق ہو کر نصیب ہی کے معنی میں مستعمل ہے۔ وہ اردو فارسی کی طرح اپنے علمی ادبیات میں اب تک عربی کے تحت ہے اس کا کوئی خاص علمی اثر پھر نہیں۔ اپنی اصطلاحات نہیں۔ جتنی علمی اصطلاحات ہماری زبانوں پر ہیں، سب کی سب عربی ہیں۔ پس اردو کے تراجم علوم میں الفاظ عربیہ کا استعمال ناگزیر، اور اس لئے سند کے لئے اردو بول چال

نہیں عربی لغت و اصطلاح علوم کا حوالہ مطلوب۔ اگر لوگ غلط معنی لذت بولتے ہیں، تو بولیں۔ شعر میں ہم بھی کہہ دیں گے لیکن علم انفس کے مترجم کو اس سے کیا تعلق؟

(۵) فرہنگ آصفیہ کے حوالے پر افسوس ہے۔

(۶) لوگوں نے اپنی نادانفہیت سے مسئلہ اصطلاحات کو کچھ سے کچھ بنادیا۔ فلسفہ میں ہر طرح کی عربی اصطلاحات مل سکتی ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ان تمام امور میں سے کسی ایک پر بھی توجہ نہیں کی، اور جب کہ آپ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی فکر میں سرگرم جواب ہوئے تو ان دفعات میں سے ہر دفعہ کے متعلق غلط فہمیوں ہی سے اپنے استقبال کا کام بھی لیا!

آپ نے اپنے جواب میں میری معروضات کی جس قدر تشریح کی ہے، وہی غلط ہے تا بااصل بحث چہ رسد؟
امراول کی نسبت آپ لکھتے ہیں:

”سوال یہ ہے اور صرف یہ ہے کہ PAIN اور PLEASURE کا صحیح تر مفہوم اردو میں کون سے الفاظ ادا کرتے ہیں؟ جناب کا ارشاد ہے کہ لذت دالم اور میرا خیال ہے کہ خط و کرب۔ آپ اپنے پر دعویٰ عربی لغت سے حجت لاتے ہیں، میں اپنی تائید میں معادہ لغت کو پیش کرتا ہوں؟“

لیکن گزارش یہ ہے۔ ”اور صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی اس کے بعد

گزارشیں ہوں گی، کہ آپ نے دعویٰ، حجت، لغت، اور استشہاد کے لفظ کا خواہ مخواہ اصراف کیے جا کیا۔ یہاں نہ توجیح و براہیں پیش کئے گئے ہیں اور نہ کسی استشہاد و استدلال کی ضرورت

ان چیزوں کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں کسی بحث میں کسی اختلاف کی گنجائش ہو۔ خط کے لفظ کے لئے نہ تو میں نے عربی لغت کا حوالہ دیا اور نہ کوئی شہادت پیش کی۔ خط کے معنی اس آسان کے نیچے صرف ایک ہی ہیں یعنی قسمت و نصیب اور پس۔ قطبوی اور درایۃ الادب کا طالب العلم بھی اس کو جانتا ہے۔ ایک ایسی کھلی اور عام بات کے لئے مجھے کیا پڑی تھی کہ جو بہری اور فیروز آبادی کی شہادت میں پیش کرتا ہوں؟ پس نہ میں "حجت لایا ہوں" اور نہ دعویٰ کی کوئی اصطلاحی شکل درپیش ہے۔ میں قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آپ کو جو عقلی اصل مسئلہ میں ہوئی ہے وہ زیادہ سخت ہے یا جو متواتر مسلسل غلط فہمیاں میری تحریر کے سمجھنے میں ہوئی ہیں، وہ زیادہ سنگین ہیں! تاہم میرے لئے تو دوسری صورت اب پہلی صورت سے زیادہ درد انگیز ہو گئی ہے۔

میں نے لکھا تھا کہ فرہنگ مصنف کے واسطے پر افسوس ہے اور کیا کہوں؟ اور اس طرح بلا ضرورت کسی کتاب کے متعلق جرح و تنقیض کو بہتر نہ سمجھ کر ٹال دیا تھا۔ مگر آپ نے اس کا یہ مطلب قرار دیا کہ مجھ کو اردو لغت کے واسطے پر تعجب اور افسوس ہے!

سخن شناسی نہ دل برا خطا دین جاست!

اب مجھ کو کھول کر کہنا پڑا۔ اصل یہ ہے کہ میں فرہنگ آصفیہ کو اردو کے لغت کے اعتبار سے بھی قابلِ سند کتاب نہیں سمجھتا، اور بالکل پسند نہیں کرتا کہ آپ کسی حوالہ و سند کے لئے اس کی درج گردانی کریں۔ افسوس اس پر نہ تھا کہ اردو لغت سے کیوں استشہاد کیا گیا۔ افسوس آپ کی نادانیت پر تھا کہ فرہنگ آصفیہ کو اردو زبان کا معتبر لغت سمجھتے ہیں، اور اس طرح بے فکر ہو کر اس کا حوالہ دیتے ہیں گو یادہ ایک مسلم و معروف کتاب ہے!

اگے چل کر آپ نے "خط" بمعنی مفروضہ لذت کو اردو قرار دیا ہے، اور غیر زبان کے "سند و متغیر الفاظ" و "المعانی" کے اردو ہونے کو ایک ایسا محترمہ نادر و بدیع، تحقیق غریب و عجیب سمجھا ہے کہ میں اسے سن کر بے اختیار چمک اٹھوں گا، اور حیران و پریشان ہو کر شور مچانے لگوں گا۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"آپ حیرت سے فرمائیں گے کہ خط تو عربی لفظ ہے اسے اردو کہہ کیوں کر جائز ہے؟"

یا اللعجب! آپ کبھی تو مجھے غلط فہمیوں میں مبتلا دیکھ کر دستِ تحقیق و رہنمائی بڑھاتے ہیں، کبھی خود ہی اپنی طرف سے مجھے "حیران" فرض کر لیتے ہیں۔ الحمد للہ نہ تو میں غلط فہمیوں میں مبتلا ہوں اور نہ اُن حقائق و حقائق اور نکاتِ عجیبہ و غریبہ پر متعجب ہوں۔ بنیادی "حیرانی" کے ہر شخص جانتا ہے کہ ہر زبان میں باہر کے الفاظ اگر بہ تغیر و تخریج و معانی میں زبان میں

شامل ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہی تغیر نئی زبانوں کو پیدا کرتا ہے اور اردو تو مختلف زبانوں کے الفاظ کے مجموعے ہی کا نام ہے جو الفاظ عربی و فارسی یا انگریزی، بادی تغیر رائج ہو گئے ہیں وہ یقیناً اردو ہیں۔ بہ کوئی حیرانی دسرگردانی کی بات نہیں۔ میں مدت سے اس نکتہ نادر کو جاننا ہوں اور باوجود جاننے کے اب تک میں نے کوئی حیرانی اپنے اندر نہیں پائی ہے۔ البتہ مبری نئی جوانی یہ ہے کہ آپ حرف مقصد سے خواہ مخواہ اعراض کرتے ہیں اور دقت نظر سے کام نہیں لیتے اس اصول سے ماسخن فیما کو کوئی تعلق نہیں۔ اور تحقیق و معارف کے سفر میں بڑی چیز یہی ہے کہ مختلف راہوں کے حدود کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے اور ہر اصول کو اس کی اصلی جگہ ملے۔

یہی سبب ہے کہ میں نے علم الفہم اور زہر عشق کا سوال پیش کیا تھا۔ اگر اپنی ناراضگی عرض مد اوپر مناسب ہوں کہ شرف استماع و فہم و محروم رہا۔ آپ صرف اس پر زور دیتے ہیں کہ میں علم النفس کو عربی میں نہیں بلکہ اردو میں لکھ رہا ہوں اور اردو میں خط لذت کے معنوں میں بولا جاتا ہے، پس میں لذت کو کہ عربی ہے اپنی افہم قبولیت سے خارج البلد کرنا ہوں اور اس کی جگہ "حظ" کو کہ اردو ہے، خلعت قبولیت سے سرفرازی بخشنا ہوں۔ اور اس اردو قبول تمنا راہ اور غزل و لہجہ مجتہدانہ پر کو اعتراض ہے تو دعوائے اجتہاد عام بول چال اور فرہنگ آصفیہ کی عداوت کئی جگہ ہے !

داد رگہ ہے بنا فرمودہ دور سے ہر را
منصف و صدر امین و صدر اعلیٰ کردہ است !

اس مقدمے کا عجلانہ ترتیب اور فیصلے کی جلدی تو قابلِ داد سے
 شاید عدالت کے کاروبار میں ایک شے انصاف نامی کو بھی ضروری سمجھا گیا ہو۔
 آپ نے غلطیوں کا ایک الجھا ہوا مجموعہ سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ مہول بالکل
 صحیح ہے کہ اردو میں جو الفاظ و غلبہ موجود ہیں، وہ تغیر معانی یا تغیر حروف و
 حرکات و صوت کے بعد اردو ہو گئے۔ یہ بھی مسلم سہی کہ بول چال میں خلل و
 کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ تاہم آپ کی قائم کردہ عدالت میں جلنے کی کوئی
 ضرورت پھر بھی پیش نہیں آئی۔ کیونکہ میرا سوال یہ نہیں تھا کہ الفاظ عربیہ متغیر
 اردو کو ان کے اصلی معانی لغویہ ہی میں استعمال کرنا چاہئے اور ہماری بول
 چال کوئی چیز نہیں بلکہ یہ تھا "اور صرف یہ تھا" کہ اردو میں جب کسی فن کو
 لکھیں گے تو چونکہ اردو اپنی علمی ادبیات میں عربی کے زیر اثر اور بالکل محنت
 ہے، اس لئے لامحالہ ہمیں عربی اصطلاحات کو مقدم رکھنا پڑے گا اور جب
 اصطلاحات عربیہ سے کام لیں گے تو اس کے وہی معنی معتبر ہوں گے
 جو عربی میں لئے جلتے ہیں۔ اصطلاحات دوسری چیز ہیں اور شعر و ادب
 دوسری شے۔ اگر عربی میں ہم کو اصطلاحات نہ ملیں (لیکن نہ ملنے کا حق ادعا
 علم و تلاش کے بعد ہے نہ کہ پہلے) مثلاً بعض علوم حدیثہ و طبعیات جدیدہ
 کی شاخوں میں تو اس صورت میں ہم کو نئے الفاظ وضع کرنا پڑیں لیکن ان
 کی بھی دو صورتیں ہیں۔ یا تو اصل انگریزی اصطلاحات لے لیں یا ان کی جگہ
 خود نئے الفاظ بنائیں۔ آخری صورت میں اگر عربی الفاظ سے مدد لی گئی، تو
 اس میں بھی عربی زبان و لغت کا لحاظ رکھنا ضرور ہوگا کیونکہ ہم اردو میں

علوم و فنون مرتب کر رہے ہیں۔ "شعوی زہر عشق نہیں لکھ رہے ہیں۔"
 ذرا نامل کو کام میں لائے۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں بالکل مختلف
 حکم و حالت رکھتی ہیں۔ ایک مسئلہ تو عام طبع پر اردو زبان میں الفاظ کے استعمال
 اور اُن کے معانی کے قرار دیے کا ہے۔ دوسرا علمی اصطلاحات کا۔ خدا را
 میرے مطلب کے سمجھنے سے اب زیادہ اعراض نہ فرمائیے گا۔ میں نے یہ
 کہا تھا کہ دوسری صورت میں اردو اب تک تابعِ عربی ہے۔ اور عربی الفاظ
 کو عربی ہی کے متعارف معانی میں استعمال کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے "عام
 بول چال" کی سند بالکل بے معنی و بے اثر ہے۔

جس اصول پر آپ نے ازراہِ فوارش میری مفروضہ "عیرانی" دور
 کرنی چاہی ہے وہ پہلی صورت کے تعلق ہے، اور ہماری موجودہ صحبت
 صورت ثانی سے تعلق رکھتی ہے۔

اگر آپ بحثِ صاف کرنا چاہتے ہیں تو اس پر غور فرمائیے۔ یہ بہت صاف
 بات ہے اور اصل راہِ فیصلہ و تحقیق۔ فرنگ آصفیہ اور غیاث اللغات
 کی درق گردانی میں بے کار وقت ضائع نہ کیجئے۔

(۲)

اس کے بعد آپ لکھتے ہیں:

"اگر آپ کے اصول کو وسعت دی جائے کہ ہر اردو لفظ کی تحقیق
 اس زبان کے تحت سے کرنی چاہئے جس سے وہ آیا ہے تو اردو کے پاس بانی
 کیا رہ جاتا ہے؟"

آپ نے تحقیق کا لفظ لکھا ہے۔ اور گو میں نے اس اصول کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا مگر واقعی ہر لفظ کی تحقیق تو اسی زبان کی لغت سے کرنی پڑے گی جس سے وہ آیا ہے۔ یہ تو ایک قدرتی اور ناگزیر امر ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالباً یہاں آپ کا مقصود تحقیق نہیں بلکہ صحت استعمال اور جو از استعمال ہے۔ جلدی میں آپ تحقیق کا لفظ لکھ گئے ہیں۔

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آپ عام الفاظ اور مخصوص اصطلاحات علمیہ میں فرق کرنے سے اپنے تئیں معذور ظاہر کر رہے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ چاہیں تو اس فرق کو محسوس کرنا کچھ مشکل نہیں۔ میں ابتداء سے کہہ رہا ہوں کہ اردو کے عام الفاظ کا سوال نہیں بلکہ اصطلاحات علمیہ کا ہے۔ میں نے کہیں یہ اصول پیش نہیں کیا کہ ہر مہند لفظ کا استعمال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے اصلی زبان کی لغت سے بھی ان معانی میں صحیح ثابت ہو جائے۔ میری گزارش تو صرف اصطلاحات علمیہ تک محدود ہے اور اسی لئے ”تنویر زہر عشق اور علم النفس“ کا سوال آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ آپ سنتے ہیں، میرے سوال کو دہراتے ہیں، اس کو ایک ناقابل انکار حقیقت قرار دیتے ہیں مگر پھر جواب نہیں دیتے! فیصلہ ہو تو کیونکر؟

آپ نے جس نکتہ علم اللسان کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر خود بخود میری

خیرانی کی علاج فرمائی پر متوجہ ہوئے ہیں، میں اس کو دوسرے خود وکیل میں لکھ چکا ہوں جبکہ چند الفاظ عربی و انگریزی کی بحث چھڑ گئی تھی۔
ان دلائل و براہین واضحہ و بینہ کے بعد آپ نے اس بحث کا خاتمہ کر دیا ہر اہل عدالت بر خاست ہو گئی۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں:
"اصل مسئلہ ختم ہو گیا۔"

گریوں ہی تو قاعدہ اچھا ٹھہر گیا
اگر کسی مسئلہ کے ختم کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اصلی فیصلہ طلب امور کو نذر تجاہل و تغافل کر کے اختتام بحث کا اعلان کر دیا جائے تو پھر بحث میں صرف وقت کرنے سے کہیں بہتر خاموشی اور اعراض ہے۔ ہم کو کوئی شخص مجبور نہیں کرتا کہ ہم بولیں لیکن اگر بولیں گے تو پھر بات کرنے والوں ہی کی طرح بات کرنی پڑے گی۔

میں نے اس بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کو گزشتہ نمبر میں چھ دفعات کے اندر عرض کر چکا ہوں مسئلے کے خاتمے کا یہ حال ہے کہ ان میں سے کسی ایک امر کے متعلق بھی آپ نے غور نہیں کیا اور جتنا کچھ کیا، اس کا بھی یہی حال ہے کہ وہ گویائی پر خاموشی کی ترجیح و تقدم کی ایک مثال تازہ سے زیادہ نہیں!

اس بحث سے فارغ البال ہو کر آپ نے "خط" کو بمعنی مفرد ضمیر لذت قاری سے ثابت کرنا چاہا ہے، حالانکہ پہلی بحث کی طرح یہ موضوع بھی

آپ کے بس کا نہ تھا اور آپ کے لئے اور تیز ہر اس شخص کے لئے جو آپ کی سی حالت رکھتا ہو، یہی بہتر ہے کہ وہ ان امور میں دخل نہ دے جن سے ناواقف ہے۔

میں ہمیشہ اپنی معروضات میں بحث کے ان پہلوؤں سے نہایت احتراز کرتا ہوں، جن سے مخاطب کی واقفیت یا علم کے متعلق کوئی مخالف خیال پیدا ہونا ہو کہ یہ طبائع کو رنجیدہ اور بحث کو مقصد سے دور کر دینے والی باتیں ہیں۔ اور اسی بنا پر ”خط و کرب“ کے بارے میں بھی میں نے باوجود ضرورت کے اس سے احتراز کیا، لیکن آپ کا لا حاصل اصرار بڑھنا جانا ہے اور اس سے ضمناً زبان اور فارسی لغات کے متعلق نہایت سخت غلط فہمیاں اور بے لگے پیدا ہو جانے کا خوف ہے۔ اس لئے اب مجبوراً عرض کرتا ہوں کہ آپ ان کاموں میں کیوں بڑے ہیں جن کی نسبت نہ تو آپ کو علم ہے اور نہ واقفیت؛ میں نے خط کے متعلق غالب کا ایک شعر لکھ دیا تھا اور صرف اس لئے کہ اتفاقاً اس وقت یاد آگیا۔ کوئی لفظ سن دیا استدلال کا زبان نہ تھا۔ اس پر آپ متعجب ہو کر لکھتے ہیں :

”اور اس کے ثبوت میں غالب کا ایک شعر پیش کرنا آپ کافی سمجھتے ہیں جس میں خط کو جھٹے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے ؟“

میں نے بطور سند کے تو نہیں لکھا تھا کیونکہ ایک ایسی بات لکھ رہا تھا جس سے آپ کو مستفی کر دینے کے بعد ہر فارسی داں واقف ہے۔ لیکن اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کے اس ”ایک“ پر زور دینے کا مطلب بالکل سمجھ

میں نہیں آتا۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر دو چار سو شعروں کی ضرورت تھی؟ اگر غالب کا شعر پیش نہ کروں تو کیا ٹیک چند بہار، محمد حسین دکنی اور مولوی غیاث الدین رامپوری کی سند دوں؟

اس کے بعد آپ ”واقعات“ کو ”دلائل“ کے معنی میں استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں :

”افسوس ہے کہ بہارِ عجم وغیرہ اس وقت سامنے موجود نہیں در نہ غالباً ”بقید صفحہ دسطر“ میں بتا سکتا کہ فارسی کے متعدد لغت نویسوں نے خط کو لذت و مسرت کے معنی میں استعمال کرنے کی ”افسوس ناک غلطی“ کی ہے۔“

”عظیم الشان بہارِ عجم“ کے نام لے کر آپ کو جو افسوس ہے اس میں مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ مگر ساتھ ہی خود غرضانہ اسی کی خوشی بھی ہو کہ اگر خدا نخواستہ دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کی یہ تیغ بے امان آپ کے ہاتھ آجاتی تو ہمیں معلوم میری معروضات کی مسکین ہستی کا کیا حال ہوتا؟

پھر لطف یہ ہے کہ آپ ”بقید صفحہ دسطر“ بتلا دیتے، اور اس کے بعد غالباً قرون اور صدیوں تک کے لئے ”خط بمعنی لذت“ کا علم ثبوت سرزمین لغات فارسیہ و اصطلاحات علمیہ میں نصب ہو جاتا !! وَذَلِكَ جَبَلُكُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔

اس کے بعد دلائل و اسناد کی ایک عظیم الشان صف رونا ہوتی ہو جس کے سرخیل حلقہ حضرت ”غیاث اللغات“ ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے علامہ پر مولانا دینکس، محقق اسین گاس، فارسی لغات کی موت و حیات کا

سرسشتہ سیتھلے ہوئے نشہ لار ہے ہیں اور سب کے آخر میں خود جتا ہیں جو فن لغت کی اس مہیب تلاش کے بعد مجھے دعوت غور و فکر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

”غور فرمائیے کہ یہ ”اہل لغت“ نہ صرف خط کو لغت کے معنی میں استعمال کرتے ہیں بلکہ اس سے جتنی تو الکیب پیدا کرتے ہیں ان سب میں بھی خط کے معنی لغت اور ”صرف لغت“ کے پتے ہیں!“

جب آپ کی حقیقت کا یہ حال ہے تو ارباب علم انصاف کریں کہ اب میں کیا کہوں؟ آپ کو کون سمجھائے کہ کسی فارسی لغت کا نوکثوری پریس میں چھپنا ہی دلیل وقار نہیں ہے، اور نہ اس میں آپ کے حسب مطلب خط کے لفظ کامل جانا مستند ہونے کا کوئی ثبوت۔ آپ غالب کے ”ایک“ شعر پر معترض ہیں جس نے (قاطع برہان) لکھ کر ہمیشہ کے لئے ہندوستانی لغت نویسوں کی آبرو مٹا دی۔ مگر مسکین ٹیک چتر کے نہ ملنے پر آپ کو افسوس ہے، اور پورا یقین ہے کہ اگر (بہارِ عجم) کسی طرح میسر آجائی تو ”بقید صفحہ و سطر“ بتلا کر آپ اس بحث کا خاتمہ کر دیتے۔ حالانکہ جہاں (محمد حسن دکنی) کو کوئی نہیں پوچھتا، وہاں (ٹیک چتر) کا نام لینا ایک ایسی بات ہے جو صرف آپ ہی سے ممکن تھی۔

”بہارِ عجم“ کے نہ ملنے کے افسوس کے بعد خوش قسمتی سے عیاض اللغات آپ کی ”میز“ پر نکل آتی ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں۔

”خوش قسمتی سے عیاض اللغات البتہ میز پر موجود ہے اور اس کی

میں اس سے زیادہ افسوس ناک غلطی کی ہے، جو موضوع بحث میں آپ کر چکے ہیں۔
اغلاط استدلال

ایک نئے ہے دعویٰ اور ایک چیز ہے استدلال۔ آپ نے دونوں میں غلطیاں کیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ خط بمعنی لذت اصطلاحاتِ علمیہ میں صحیح ہے اور پھر دلائل پیش کرتے ہیں۔ ایک دعویٰ کی نسبت عرض کر چکا ہوں لیکن اس سے زیادہ غلطیاں آپ کے طریق استدلال نے پیدا کر دیں۔

(۱) آپ نے یہ غلط اصول قائم کر دیا کہ اردو کی عام بول چال اصطلاحاتِ علمیہ میں مستند ہے۔

(۲) آپ نے ضمناً فرہنگِ آسفیہ کو اردو لغات کی بحث میں قابلِ استناد قرار دیا، حالانکہ (مصنف فرہنگ معاف رکھیں) اسے یہ حیثیت حاصل نہیں۔

(۳) پھر اس غلط فہمی کا دردازہ کھول دیا کہ لغاتِ فارسی کی بحث میں غیاث اللغات کی سند معتبر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکالے گا کہ لوگ بلا تکلف غیاث کا حوالہ دینا شروع کر دیں گے۔ اور پھر دوبارہ اس لغوی کچی مٹن کا اربابِ فن کو مقابلہ کرنا پڑے گا جو مرحوم غالب نے (قاطع برہان) لکھ کر اپنے سامنے آمادہٴ پیکار پایا تھا

(۴) اس سے بھی بڑھ کر ظلم اکبر یہ کیا کہ فارسی لغات کی بحث میں انگریزی کی فارسی لغات کو مستند قرار دینے کی بدعت سیئہ کبیرہ کی بنیاد رکھی

جو فی الحقیقت ایک اشد مذہب تھے "نہیہ" ہے اور جو اگر مل نکلا تو اوردو اور فارسی زبان کا بھی مذہب و مطلق کی طرح خدا حافظ!

پس مجھ کو جو اس تفصیلی تحریر کی ضرورت ہوئی تو صرف اہل بحث ہی کے متعلق ازالہ اغلاط کا خیال محرک نہ تھا، بلکہ زیادہ تر یہ خیال کہ آپ کے طریق استدلال کے اغلاط نے اہل عقلی سے بڑھ کر چند غلطیاں اور پیدا کر دی ہیں۔ اعداء ایسی ہیں اگر ان کو نظر نہ کیا جائے تو لغات و زبان کے متعلق ایک اصولی غلط فہمی میں لوگ گرفتار ہو جائیں گے۔ اگرچہ واقف کاروں کے لئے ان کی غلطیاں بالکل واضح و غیر محتاج انکشاف ہیں۔

پس ضرور ہے کہ اس حصہ بحث کے متعلق میں یہ ظاہر کر دوں کہ:
(۱) غیبات اللغات کوئی مستند لغت نہیں، اس کا حوالہ فارسی لغات

کے مباحث میں بے کار ہے۔

(۲) اتنا ہی نہیں بلکہ بہارِ علم وغیرہ لغات جو آج کل عجیب کر شائع ہو گئے ہیں، قطعاً غیر معتبر، تسخیر انگیز، اغلاط سے مملو، اور ناقابل استناد ہیں جن حضرات کی ان کتابوں پر نظر ہے اور جنہوں نے وہ مباحث دیکھے ہیں جو "برہان قاطع" کی اشاعت کے بعد تحریر میں آئے، نیز ان رسائل پر بھی نظر ڈالی ہے جو ان لغات کی حمایت میں مثل مؤید الیرمان، ساطع برہان، تیغ نیز تر، قاطع قاطع، وغیرہ لکھے گئے، اور پھر قاطع برہان کے اس دوسرے ایڈیشن کو بھی دیکھا ہے جو درفش کاویانی کے نام سے شائع ہوا تھا؛ ان سے یہ امر پوشیدہ نہیں۔

(۳) یورپ کے بعض مستشرقین نے جو لغات لکھی ہیں ان کا حوالہ ہمیشہ لغت کے بالکل غیر معتبر ہے۔ عام طور پر مستشرقین فرنگ کا یہ حال ہے کہ وہ مشرقی علوم و اسناد کے متعلق بعض اپنے مخصوص مباحث علیہ میں نہایت مفید و نادر مطلب پیدا کر رہتے ہیں جن پر خود اس زبان کے بولنے والوں کو دسترس نہیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ لغات و ادب کی بحث میں ان کی سند معتبر ہو۔

اکاذیب اور شرمناک

(بہت حفظ و کرب)

”مارتمبر کے الہلال میں صفحہ ۲۲۱ سے لے کر صفحہ ۲۲۳ تک انشاء پر دازی و خطابت کے پردے میں جن سیم مغالطات کا طواریج کر دیا گیا ہے، ان کی نادر ”منطق“ کے طلباء دیں گے میں اگر ان کی پردہ درمی کرنا چاہوں بھی، تو شاید اپنے دوسرے مشاغل کو کافی صدمہ پہنچائے بغیر نہیں کر سکتا۔ البتہ ان متعدد ”مباحثہ اکاذیب“ میں سے جو اس مضمون کی زیب و زینت کا باعث ہو رہے ہیں، ایک بات کا صاف کر دینا میں ہر حال میں ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ قطعاً غلط ہے، کہ میں اس معاملے میں واقف کاروں سے مشورہ طلب کر لینے، یا ان کے مشوروں کے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ میں خود بلا الہلال کے دربار سے کوئی ہدایت پاتے ہوئے ملک کے ان متعدد تعلیم یافتہ حضرات سے مشورہ طلب کر چکا ہوں، جو میرے نزدیک

مشورہ دینے کے اہل، یا بہ قول آپ کے، دافع کار ہیں۔ میں نے اس مسئلہ میں مشورہ حاصل کیا ہے مسٹر سید کرامت حسین (سابق جج ہائی کورٹ) سے جو علوم عربیہ میں کمال رکھنے کے علاوہ فلسفہ جدید (خصوصاً فلسفہ اسپنسر) کے بھی عالم ہیں۔ میں نے استفادہ کیا ہے، مولانا حمید الدین بی اے (پروفیسر میویر کالج الہ آباد) سے جن کی جامعیت علوم مغربیہ و مشرقیہ سے شاید آپ کو بھی انکار کی جرأت نہ ہو۔ میں نے استشارہ کیا ہے مولوی عبدالحق بی اے (صدر مہتمم تعلیمات حیدرآباد) سے، جو علاوہ علوم مغربی سے واقفیت کے عربی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ میں نے مشورہ حاصل کیا ہے، خان بہادر میر اکبر حسین (الہ آبادی) سے، جو علاوہ اردو زبان میں سند ہونے کے فلسفہ جدید کا خاصہ مذاق رکھتے ہیں۔ اور میں نے مشورہ طلب کیا ہے اپنے شہر کے پروفیسر مرزا محمد ادا بی اے (اگر سچن کالج) سے جو علوم قدیمہ و جدیدہ دونوں میں مشہور قابلیت رکھتے ہیں۔ حضرات موصوف کے علاوہ میں نے اور بھی ان متعدد تعلیم یافتہ لوگوں سے استصواب رائے کیا ہے، جن کی علمی و ادبی قابلیت کی شہرت ابھی غالباً اس فضا میں نہیں پہنچی ہے، جس میں الہلال کا نشوونما ہو رہا ہے۔

اور پھر میں نے جن ان سنجیدہ اصحاب سے بھی تبادلہ خیالات میں کبھی نال نہیں کیا، جو چند دنوں سے آپ کے ایشاف میں ہیں۔ بعض حضرات سے ان مسائل پر کئی کئی گھنٹے گفتگو رہی ہے۔ میرے لائق دوست مولوی سید سلیمان نے جس محنت سے وضع اصطلاحات علمیہ پر ایک تحریر فرمائی ہے، نیز میرے ایک دوسرے دوست (”خدا بندہ“ از جوئی پور) نے اسی مسئلہ لذت و الم پر مضمون تحریر فرمایا تھا

میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

ہاں یہ جرم مجھ سے بلاشبہ سرزد ہوا ہو (اور شاید آپ کے ضابطہ تعزیرات میں یہ جرم ناقابل معافی ہو) کہ میں نے اس شخص سے دستگیری کی التجا نہیں کی جس نے گواہی خطیبانہ سحر بیانیوں سے ایک بہت بڑی جماعت کو مرعوب و مسحور کر رکھا ہے مگر جس کے "خالص کمالات علمی" کا ثبوت مجھے اب تک باوجود سعی و تلاش کے نہیں مل سکا ہے۔

رہا آپ کا یہ دعویٰ کہ عربی میں فلسفہ کی بہتر سے بہتر اصطلاحات موجود ہیں بشرطیکہ تلاش کی جائیں، تو اس کے متعلق میں نے اپنے کچھ خط میں جو سوال کیا تھا، وہ بدستور قائم ہے۔ مجھے بتلایئے کہ میں ساریکا لوجی، اسپیشیالوجی، آئیٹھکس (اپنے جدید معنی میں) اور منطق استقرار کی مصطلحات کس کتب خانے میں تلاش کروں؟ کس کتاب میں ڈھونڈ لوں؟ مصر کے نامور فضلا، مشہور منشرین یورپ اور خود ہندوستان کے مستند ترین فضلا (مثلاً شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی) تو اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن الہلال کو اپنے دعوے پر اصرار ہے، اور چونکہ یہ دعویٰ الہلال نے کیلئے، اس لئے کسی دلیل کی بھی حاجت نہیں، محض اس کا اعادہ و تکرار کافی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ یہ خطیبانہ حربے، عوام فریب تقریروں و تحریروں میں خواہ کتنے ہی کارگر ہونے ہوں، لیکن علمی مباحث میں ان کا استعمال قطعاً بے محل و غیر موثر ہونے کے ساتھ بے حد شرمناک، ہیرو سیاست اور مذہب مدت سے آپ کی تیخ خطابیات کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں، اب مہربانی کر کے علمی مسائل کی جان پر تورجم فرمائیے۔“

(عبدالمجید وریا آبادی)

سخت شراٹے وہ، اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں

جھپٹنا تھا تو کوئی شکوہ بے جا کرتا!

اب تک تو صرف حظ و کر ب کے متعلق بحث تھی، لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی لغات و مصطلحات جدیدہ و مخترعہ میں اور چند الفاظ و اصطلاحات کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر وضع و اختراع کی رفتار ایسی ہی تیز رہی تو مجھے ہمت ہار دینے کا علانیہ اعتراف ہے:-

بیا کہ ماہر انداختیم اگر جنگ است

اب تک تو صرف یہی مصیبت تھی کہ آپ حظ و کر ب کا مطلب وہ نہیں سمجھتے جو سمجھنا چاہیے، لیکن یہ تو بڑی مصیبت ہو گئی کہ اب مخالطات، منطق، پروردہ درسی، بے باکانہ اکاذیب، کمالات علمیہ، اور بے حد شرمناک کے متعلق بھی مجھے خوف پیدا ہو گیا ہے کہ آپ ان کے معانی سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ان الفاظ کو کن موقعوں پر بولنا چاہیے؟ میں نے اسی لئے آپ کی تحریر میں اس طرح کے الفاظ کو ان ورد کا ماسے متناکر دیا ہے۔

اگر میں جا ہوں تو بغیر اپنے مشاغل کو مقدمہ پہنچائے "ان الفاظ کے معانی بھی عرض کر سکتا ہوں، جو ان فوس ہے کہ مثل "حظ و کر ب" کے آپ کو معلوم نہیں لیکن چونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ غصہ میں آگئے ہیں، اور آدمی غصہ میں اگر گالیوں پر اتر ہی آتا ہے۔ اس لئے آپ کو معذور سمجھتا ہوں اور آپ کے غصہ پر ہنستا ہوں کاش آپ کو یاد رہا ہوتا کہ مسائل علمیہ کا فیصلہ گالیوں اور محض ادعائی الزام سے نہیں ہوتا۔ (اکاذیب، اور شرمناک) کے استعمال کے لئے محض ان دو لفظوں کو

مثل حظ و کرب کے سن لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کے مواقع استعمال کو بھی مثل حظ و کرب کے معلوم کرنا چاہیئے۔

غصے میں ان کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اٹھانے عتاب میں
اب آپ اور بگڑیں گے اور کہیں گے کہ مسائل علیہ میں ایسے عاشقانہ شعور
کا پڑھنا اکاذیب ہے بہتان ہے "بے حد شرمناک" ہے۔ لیکن خبر، نجد شرمناک
اقدامات تو پہلے ہی کر چکا ہوں، اب کیا ہے کہ دو گھڑی کے لئے آپ کے عشوہ طرازانہ
غیظ و غضب سے جی بھی نہ بہلاؤں؟

گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق

جو تیری خوش تھی وہ ہی مراد عسا ہوا

البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو تحریر و تالیف کا شوق ہے، آپ علمی مباحث
میں مشغول رہنا چاہتے ہیں، بہتر ہے کہ طبیعت میں صبر و سکون پیدا کیجئے اور نکتہ چینی
سے گھبرانہ اٹھئے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اصلاح و مذہب کے کاموں میں جس قدر
سخنی ضروری اور بعض حالتوں میں سخت سے سخت الفاظ کا استعمال تک بھی صبر و تحمل
و انصاف ہو، اتنا ہی علمی مباحث میں اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اپنی رائے پر نہایت
سخنی سے قائم رہیئے، مخالف کا سخت سے سخت پیرایہ نقد میں جواب دیجئے، مگر
دشنام آمیز الفاظ کا استعمال اور غلط الزام دہی کسی طرح جائز نہیں۔ مذہبی بات
پر بگڑاٹھنا، اور مخاطب پر بغیر کسی ثبوت کے کذب و افتراء اور اعمالِ خیرہ کا الزام
لگانا، لوگوں کی نظر میں آپ کے وقار کو کھودے گا، اور جن کاموں میں آپ رہنا

چاہتے ہیں ان کے لئے نہایت مضر ہوگا۔ سب سے زیادہ یہ کہ اس طرح کی مصلحتانہ ہجہ آپ کی اس حیثیت کو مدد پہنچانے کی جس کے آپ خواہش مند ہیں، یعنی علمی زندگی کے اختیار کرنے میں مارج ہوگی۔ اور پھر دیے بھی آپ جانتے ہیں کہ کسی راہ چلتے چلتے بملہ آدمی کو گالی دے دینا اس خیال سے، کہ شریف آدمی ہے مارے گا نہیں، کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اگر میں آپ سے بوجھ بیٹھوں کہ "اکاذیب، بہتان، بوجد شرمناک اور مصلحتانہ میری تحریرات میں سے نکالنے تو آپ کے لئے کیسی مشکل ہو؟

"بہتان" اور "شرمناک" کا یہ حال ہے کہ میں نے چند سطروں میں آپ کو ابتداً توجہ دلائی اور مجبوراً، کیونکہ مضمون کے عنوان میں تبدیلی نہیں کر سکتا تھا، اپنے اپنے وجہ لکھے، میں نے اس کے متعلق پھر چند سطر ہی لکھے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ اب پر غور کرتے اور سمجھ کر کچھ کہتے، لیکن آپ نے فرہنگ اصیفہ، حیث اللغات، ہمارا وکیس، اور امین گاس کی سندات کا پشتارا اٹھایا اور بلا تامل ٹپک دیا۔ اس پر میں نے دیکھا کہ اصل موضوع کے علاوہ چند در چند غلطیاں ایسی پیدا ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے زبان اور وضع اصطلاحات و استناد و استشہاد کتب کی نسبت لوگوں کو سخت غلط فہمیاں ہوں گی اور ایک فتنہ نغویہ کا دروازہ کھل جائے گا جس میں نے تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کئے۔ تاہم بحث سے پہلے آپ کے شوق علمی کی تعریف کی۔ آپ کو عام تعلیم یا فتنہ طبقہ کی چل سالہ خیرہ و دنی سے الگ پایا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ اس کا اظہار کیا، اور پورے مضمون میں کہیں بھی کوئی سخت لفظ یا "شرمناک" الزام آپ پر نہ لگایا کہ ایسے مباحث میں ان باتوں کا

موقع ہی کیا تھا۔

میں نے اول سے آخر تک اصولاً بحث کی اور پھر آخر میں دفعہ دار نتائج بحث پیش کر دیئے ان تمام دفعات میں سے ایک دفعہ کی نسبت بھی آپ نے کچھ نہیں لکھا اور نہ کوئی جواب دیا۔ آپ "کو اپنے اشغال" کے مضروب و مجروح ہونے کا خوف ہے، لیکن انہوں نے کہ آپ کو ایک کالم سے زیادہ لا حاصل و نفع دہی اور ادعائی الزام کی فرصت مل گئی، مگر میرے سوالوں کا جواب دینے کا موقع نہ ملا؟ میں نے استعمال مصطلحات عام بول چال اور اصطلاحات علمیہ کے اختلاف، الفاظ مبہمہ و دخیل کی حقیقت، غیاث اللغات اور فرہنگ آصفیہ کے حوالے، انگریزی لغات سے استشہاد اور متعدد امور کی نسبت جو کچھ لکھا، اس کا کیا علاج ہے کہ آپ کو اس میں صرف "اتہام" "بسی شرمناک" "مخالطات" اور "کاذب" ہی نظر آیا؟ اور اس پرستم جانکاہ یہ کہ اپنے اشغال عظیمہ اور اعمال علمیہ کو ٹھیس لگنے کے خوف سے ثبوت و دلیل کی فرصت بھی نہیں!

کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں

"انتظار داری اور خطابت" جس سے کام لینے کی آپ نے اس تحریر میں نہایت غیر منفی سہی کی ہے، بار بار آپ کی زبان پر آتا ہے۔ خطابت فن تقریر کہتے ہیں۔ غالباً خطابت کو آپ خطابیات کے معنوں میں بول گئے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو اس کے لئے بھی آپ کو صبر و انتظار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر آپ یا آپ کے ساتھ اور لوگ بھی اس نادانی میں مبتلا ہوں کہ مباحث علمیہ کے لئے ضروری ہے کہ ان کا طرز تحریر قصداً نہایت روکھا جھیکا، اور غیر انتظار داری نہ رکھا جائے۔

اگر ایسا نہیں ہو تو وہ کوئی علمی بحث بھی نہیں، تو یہ نہایت محنت فطری، بے ضرورت ہے کہ علمی مباحث کو عام ادبیات سے مختلف ہونا چاہیے، لیکن اس اختلاف کی بنا پر تحریر نہیں بلکہ مطالب کا اختلاف ہو۔

یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن خط و کرب کے متعلق میری تحریر کوئی علم و فن کا مقابلہ نہ تھا بلکہ آپ کے مضمون پر ایک سرسری نقد تھا۔ اگر انشا پر دوازی سے آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی عبارت اچھی اور اس کے الفاظ اور جملے بیگانہ نہ تھے تو کوئی شخص آپ کی اس تعریف کا مطلب نہ سمجھ سکے گا کہ کسی مضمون کا خوش عبارت و بیخ الفاظ ہونا اس کے پیش کردہ مطالب کے غلط ہونے کے لئے کیونکر مستلزم ہے؟ اگر ایک شخص اپنے ہر طرح کے مطالب کو اچھی عبارت میں لکھ سکتا ہے تو یہ اللہ کا ایک فضل ہے اور یقیناً خوشی کی بات ہو۔ پھر آپ اس کے لئے غمگین کیوں ہیں؟ کیا آپ کے جواب دینے کے لئے یہ بھی ایک شرط ہے کہ مضمون "غیر انشا پر دوازانہ ہو؟"

آپ نے تمام مضمون میں صرف ایک ہی بات موضوع بحث کے متعلق لکھی ہے یعنی یہ کہ آپ نے اس بارے میں ارباب علم سے مشورہ کیا ہے۔ لیکن آپ نے کچھ نہیں بتلایا کہ کس بارے میں مشورہ کیا ہے؟ لذت و اہم کے غیر کافی ہونے میں یا حظ و کرب کی صحت میں؟ تاہم اگر یہ سچ ہے کہ ان حضرات نے حظ و کرب کو صحیح بتلایا ہے تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا کہ ان سب نے غلطی کی ہے، جس طرح میں خود بھی اپنے خیال میں غلطی پر ہو سکتا ہوں۔ آپ کم از کم اس امر کو صاف کر دیں کہ آپ کا یہ استفسار کس سوال پر مشتمل تھا؟ تاکہ اس سے جواب کا تعلق و مفہوم متعین ہو سکے۔

آپ نے بے فائدہ یہ فکد کر اپنی طبیعت کو خوش کرنا چاہا کہ میرے علمی کمالات کا کوئی ثبوت نہیں۔ بھائی معلوم نہیں کہ علم سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ کہیں حظ و کرب اور اہتمام و شرمناک کی طرح اس بارے میں بھی کوئی اختراع خاص نہ ہو۔ کیونکہ اب آپ کے ہر لفظ کے متعلق شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خیر، کچھ بھی مقصود ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اپنے زکش طنز و تشنیع کا سب سے زیادہ قیمتی ثمر ایک ایسے نشانے کی فکر میں ضائع کیا، جہاں اس کے صرف کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ میں نے آج تک کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ علم و فن کا میں ماہر ہوں البتہ ان لوگوں کو شرماء چاہیے جو آج چالیس سال سے علمی نوغات کا مرکز ہیں، جنہوں نے یورپ کی علمی زبان کی تحصیل کی ہے، اور جو فی الحقیقت خدمت علم انجام دینے کے لئے تمام ملک میں صرف ایک ہی گروہ ہے۔ وہ اگر اپنے علمی کمالات کا ثبوت دینے میں مقصر رہے ہیں تو ان کے لئے افسوسناک ہے، نہ کہ میرے لئے۔

آپ نے اپنے ”تلاش“ کا بھی لفظ لکھا ہے کہ باوجود سعی و تلاش علمی کمالات کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ لیکن یہ تلاش ویسی ہی تلاش تو نہ تھی جیسی آپ نے ”حظ“ کی تحقیق و جستجو میں حضرت عیث اللغات اور علامہ بامر کی رہنمائی میں کی تھی؟ اگر ایسا ہے تو پھر صورت حال دوسری ہی ہو جاتی ہے۔

آخر میں آپ سے پھر کہوں گا کہ محض دوسرے کو ادعائی الزام دے دینے، قصہ میں آکر روٹھ جانے، مخاطب کو جاہل کہہ دینے اور کالیوں کے دینے سے کسی بحث کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ آپ بکھنے بڑھنے کا کام کرنا چاہتے ہیں تو اپنی طبیعت کو بدل لیں۔ اس مضمون کو آپ نے غیظ و غضب کے عالم میں لکھا ہو

اس لئے قابل معافی ہے۔ لیکن ایک علمی مذاق رکھنے والے شخص کو اس درجہ غصہ زیب نہیں دیتا۔ آپ نے میری تحریر کے متعلق نہایت انوسناک طریقہ سے بلا قصد غلط بیانیال کی ہیں۔ اگر میں چاہوں تو زیادہ سخت الفاظ لغت میں مل سکتے ہیں، لیکن پھر اس سے کیا حاصل؟ بحث و مباحثے سے مقصود کسی لفظ کی تحقیق و وسعت و صحت کا کشف ہے نہ کہ اور کچھ۔ میں نے اپنی تمام تحریر میں کوئی لفظ سخت نہیں لکھا اور بہتر تھا کہ آپ اس کا جواب دیتے۔ جواب کی جگہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ میرے لئے بہت مایوسی پیدا کرتا ہے۔ تاہم میں ہنستا ہوں، اور ایسی نادانیوں کو ہنس کر ٹال دینا ہی بہتر ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ گو آپ نے اپنا مضمون بازار کے کسی چوڑے پر سے شروع کیا، لیکن خاتمہ نامحمانہ انداز میں ہوا ہے۔ آپ نے محبت علم و شرف فن سے بیقرار ہو کر نصیحت کی ہے کہ ”مذہب اور سیاست تو تیغ خطا بہات سے زخمی ہو چکے ہیں اب علم پر رحم کیجئے۔“

اللہ اللہ آپ کو بھی مذہب کے زخمی ہونے کا درد ہے!

اینکہ نبی مہم، بہ بیداریت یا رب یا بخواب؟

یہ ایک نہایت مسرت انگیز خبر ہے۔ تاہم مذہب و سیاست کی تو آپ چنداں فکر کریں نہیں۔ اس کی تو آپ حضرات کی خدمات حیات افزا سے تلافی ہو ہی گئی جو اور ہو رہے گی۔ رہا علم، تو اللہ اس کے زخموں کو آپ کے دست میحانی سے مرہم پٹی مبارک کرے۔ البتہ اس تقیم سے غریب زبان ”رہ گئی تو کوئی مضائقہ نہیں خوش قسمتی“ سے فرہنگ آصفیہ اور غیاث اللغات آپ کی ”مز“ پر موجود ہی ہیں۔ خدا اس خوش قسمتی سے ہمیشہ علم و ملت کو بہرہ ور اور شاد کام فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد
 حیران ہوں کہ "مذہب دیاست" کا لفظ کس آسانی سے آپ لوگ
 بول سکتے ہیں!

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
 اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

مرزا غالب مرحوم

کا
غیر مطبوعہ کلام

مصائبِ غدر - قلعہ معلیٰ کی تباہی - دفاذاری و بغاوت کی ایک
قدیمی حکایت !

مرزا غالب مرحوم کا سال وفات ”آہ غالب برادر“ ہے یعنی
۱۲۸۵ھ -

اس کاٹ سے فی الحقیقت ان کا شمار موجودہ عصرِ جدید کے عہد
میں ہونا چاہئے۔ ہندوستان میں پریس سترھویں صدی عیسوی کے اوائل
میں رائج ہو چکا تھا اور غدر سے پہلے خود دہلی میں حاجی قطب الدین غبر
تجار کتب کے بغضِ پریس قائم کر دئے تھے۔ پس ان کو اپنی تصنیف و
تالیف کے لئے ابتدا ہی سے پریس موجود ملا، اور اپنے حاصلِ عمر کو
اشاعت و طباعت کے لئے غیروں پر چھوڑ کر دنیا سے چلے جانے کی

سببت سے دوچار ہونا نہ پڑا، جو فی الحقیقت کسی صاحب کمال کے لئے زمانہ گزشتہ کی نسبت بڑی نصیبت اور سب سے بڑا جاکماہ صدمہ ہے۔ ان کی کلیات نظم و نثر اور مکاتیب و رسائل اردو فارسی کی تمام کتابیں باشتنائے اردوئے معلیٰ درجوان کے انتقال کے بعد مرتب ہوئی۔ ان کی زندگی میں خود انھیں کی زیر نگرانی شائع ہو چکی تھیں۔ دیوان فارسی غالباً سب سے پہلے مطبع اودھ اخبار کلھو (نولکشور پرنس) میں خود چھپوایا۔ اسی طرح پہلے نہر نیمروز، پھر مع دستنود مکاتیب فارسیہ باسم بیج انگ شائع کی۔ قاطع برہان، درفش کاویانی، نامہ غالب، تیغ تیز وغیرہ دہلی میں چھپوائیں۔ دیوان اردو بھی غالباً پہلے مطبع اودھ اخبار میں اور پھر مکرر سرکردہ دہلی و کلھو میں چھپو کر شائع کیا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں جس قدر اردو کلام کہا گیا، وہ نئے ایڈیشنوں میں داخل نہیں ہوا۔ جو پہلا ایڈیشن غدر سے پہلے دہلی میں چھپتا تھا، اسی کی نقلیں چھپی رہیں۔ خلاف کلیات نظم فارسی کے جس کا پہلا ایڈیشن اور موجودہ ایڈیشن، دونوں میرے پاس موجود ہیں مگر دونوں کے قصائد و غزلیات و قطعات وغیرہ کی تعداد میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلے ایڈیشن میں ملکہ دکھوریا کی مع کا قصیدہ:

دور روزگار ہاں نتواند شمار یافت

خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

اور ۳۳ وال قصیدہ سرا کلینڈ کالون والا:

بہر کس شیوہ خاصی درایتارست اوزانی
 زمن مدح وزلارڈ ایلن براگنچینہ افشانی
 اور لارڈ کیننگ کے دربار آگرہ اور عطلے خطابات کی تبریک :-
 زسال نو دگر ابے بردے کار آمد
 وغیرہ تھانڈ ہیں۔ اسی طرح سر سالار جنگ اعظم کی مدح کا مشہور قصیدہ :-
 شرطت کہ درستان نہ گویم
 بھی نہیں ہے کہ یہ غدر کے بعد لکھا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کلیات نظم کے ہر ایڈیشن میں
 نیا کلام شامل کر دیا جاتا تھا۔

مگر افسوس کہ اردو دیوان کی قسمت اس بارے میں نارسا رہی
 اور نیا کلام اس میں شامل ہوتا نہ رہا۔ اس کا ثبوت وہ متعدد غزلیں
 قطعات، رباعیاں، اور بعض اردو قصائد ہیں جو بعض حضرات کے
 پاس قلمی موجود ہیں اور مطبوعہ دیوان میں ان کا بیہ نہیں۔

اس قسم کے غیر مطبوعہ کلام میں سے دو اردو رباعیاں میں نے اس
 مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ پر خود میرزا صاحب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی دیکھی ہیں
 جو انھوں نے خواجہ فخر الدین حسین دہلوی مصنف سرودش سخن کو دیا تھا۔
 اور دو قصیدے، دو قطعے، ایک قطعہ تاریخ، تین غزلیں دیوان اردو
 کے اس قلمی نسخہ میں ہیں جو اب سعید الدین احمد خاں صاحب طالب میں
 دہلی کے پاس موجود ہے۔ اس مرتبہ دہلی میں وہ نسخہ چند دنوں تک

میرے پاس رہا اور میں نے تمام غیر مطبوعہ کلام کی نقل لے لی۔ اس کے لئے میں نواب صاحب موصوف کا شکر گزار ہوں۔

ان نظموں میں اردو کا ایک مختصر قصیدہ ہے جسے آج بہ سلسلہ ادبیات شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل نئی چیز ہے اور علاوہ غیر مطبوعہ ہونے کے اس سے مرزا مرحوم کے حالات و سوانح پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔

قصیدہ

اس قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کوئی سرکاری دربار ۱۳ جنوری کو منعقد ہوا تھا جس میں حسبِ معمول مرزا صاحب کو بھی مدعو کیا گیا لیکن جب وہاں پہنچے تو ان کی عزتِ قیام کے مطابق نشست و ترتیب کا کوئی انتظام نہ تھا جتنی کہ انھیں نہایت سی ادنیٰ صاف میں کرسی ملی۔ یہ دیکھ کر سخت شامف ہوئے کہ قدیمی ہیں خوابِ خیال ہو گئی ہیں۔

اُس بزم پر فردغ میں اس تیرہ بخت کو
نمبرِ ملا نشست میں از روئے اہتمام

”از روئے اہتمام“ یعنی از روئے قاعدہ و ترتیب دربار جس میں یہ بہت پیچھے اور عام صفوں میں بٹھائے گئے ہوں گے۔

اس حالت کو دوسروں نے بھی محسوس کیا اور اشارے ہونے (۱) یہ قصیدہ صفحہ ۱۴۴ پر ملاحظہ فرمائے

دربار میں جو مجھ پہ چلی چٹمک عوام!
 دربار کے بعد انھوں نے چاہا کہ لفٹنگ گورنر پنجاب سے
 ملیں اور عرض حال کریں لیکن ریل کا وقت کم رہ گیا تھا اور دربار کا
 کاجھوم بھی بہت تھا، ملاقات کا موقع نہ ملا:

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
 تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اثر و حام
 اس کشمکش میں ”آپ کا“ مداح نامور
 ”آقائے نامور“ سے نہ کچھ کر سکا کلام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دربار دہلی کے علاوہ کسی دوسری
 جگہ ہوا ہوگا کیونکہ ریل کے وقت کا ذکر کرتے ہیں ”آپ کا مداح نامور“
 میں پنجاب کے لفٹنگ گورنر سے خطاب ہے۔ معلوم نہیں ”آقائے نامور“
 سے بھی خود وہی مراد ہیں یا کوئی اور، تنخاطب کے بعد اس طرح کے
 ضمیر ناماد صاف سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا شخص ہوگا۔
 اُس زمانے میں لدھیانہ سے کوئی اخبار نکلتا تھا اس نے دربار
 کی روئداد چھاپتے ہوئے یہ تمام باتیں لکھ دیں۔ اس پر مزید ستم یہ کیا کہ
 ان کا نام اور لقب کھننے میں کچھ ایسی غلطیاں کر دیں جسے دیکھ کر ان کا
 رنج اور دنگنا ہو گیا:

اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
 تحریر ایک جس سے ہوا بندہ مبلغ نام

ٹکڑے ہوا ہے دیکھ کے تحسیر کو جگر
 کاتب کی آستیں ہے مگر تیغ بے نیام
 وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
 جب یاد آگئی ہے کھینچا لیا ہے تھام !
 معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں انھیں معمولی خلعت بھی نہیں دیا
 گیا اور نہ نذر دینے والوں میں شمار کیے گئے :
 سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
 نمبر رہا ، نہ نذر ، نہ خلعت کا انتظام
 لیکن قصیدے سے ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ کس زمانے کا یہ واقعہ
 ہے اور کس دربار کا ذکر کر رہے ہیں ؟ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے
 کہ نذر کے بعد کا دربار ہے۔ کیونکہ لفٹنٹ گورنر پنجاب کی طرح کی ہے
 نیز اس وقت ان کی عمر ستر برس کی تھی ۔
 میں نے اس وقت مولانا حالی کی یادگار غالب دیکھنا چاہی
 مگر کتابوں میں ملی نہیں ۔ غالباً اس واقعہ کے متعلق اس میں کوئی ذکر
 نہیں ہے ۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید یہ قصیدہ نذر کے بعد کے اُس سالہ
 عہد سے تعلق رکھتا ہے ، جبکہ قیام دہلی ، تعلق قلعہ ، اور فتح کے بعد
 عدم حاضری کی وجہ سے ان کا سرکاری وظیفہ بند ہو گیا تھا ۔ ان
 کی وفاداری مشتبہ سمجھی گئی تھی اور بڑی ہی تکلیف و شدائد کی زد
 بسر کرتے تھے

مصائبِ غدر اور مرزا غالب

غدر میں مرزا گھر سے باہر نہیں نکلے اور آخر تک بند رہے۔ ہمارا پیالہ کی سرکار سے سپاہی متعین ہو گئے تھے جو غفران آباد حکیم محمود خان مرحوم اور مرزا غالب دونوں کے مکانوں کی حفاظت کرتے تھے۔

غدر کی تمام بربادیاں اور اس قلعہ دہلی کی تمام خونریزیاں ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے گزریں جو ہندوستان میں مش صد سالہ حکومتِ اسلامی کا آخری نقشِ قدم تھا، اور گو بہادر شاہ (رح) خود کچھ نہ تھا لیکن اس کے بقا سے عظمت و جبروتِ اسلامی کی ایک بہت بڑی رنج زندہ تھی۔ اُس کے ٹٹنے سے اکبر و شاہجہاں کا گھر بے چراغ ہو گیا! اس کا ٹٹنا درحقیقت سلالہٴ تیمور و آلِ بابر کا ٹٹنا تھا۔ مقتسم عباسی خود کچھ نہ تھا لیکن جب فتنہٴ تار میں بغداد کے محل لوٹے گئے تو مقتسم کی جگہ ہارون و مامون کی عظمت لٹ رہی تھی!

(۱) بلیاؤں میں حکیم صاحب کے مکان کے سامنے مسجد ہے۔ بالکل اس متصل مرزا مرحوم کا کوٹھا تھا، جہاں غدر سے پیشتر آرہے تھے۔ آج کل ہندوستانی دواخانہ جس مکان میں ہے ٹھیک اس کے مقابل مرزا صاحب رہتے تھے میں جب کبھی وہاں سے گزرتا ہوں تو شوق و عقیدت کی ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ اسی مسجد کے قریب کی نسبت کہا تھا:

مسجد کے زیرِ سائے ایک گھر بنالیا ہے یہ بندہ کینہ ہمایہ خدا ہے!

وما کان قديماً هلك هلك واحداً
ولكنه بنيان قوم مهدماً!

مرزا غالب نے عمر بھر بہادر شاہ کی لاکھل مداحی کی تھی، اور وہ قصیدے جو عرفی اور نظیری کے قصائد سے مقابلے کا دم رکھتے تھے اور ایک ایسے مخاطب کے سامنے ضائع کیے تھے جس کے سر جہانگیر و شاہجہاں کا تاج تو ضرور تھا، پر نہ تو عرفی و نظیری کی قدر شناسی کا بائٹھا تھا اور نہ کلیم کو زرخالص سے تلو اکبر بخش کرنے والا خزانہ۔ تاہم وہ جو کچھ لکھتا تھا، اس کا مخاطب خود بہادر شاہ سے نہ ہوتا تھا بلکہ اُس تختِ اعظم کی روحِ صولت و عظمت اس کے سامنے ہوتی تھی جس پر بھی بیٹھ کر اکبر نے فیضی سے جہانگیر نے عرفی و طالب سے اور اور شاہجہاں نے کلیم سے مدحیہ قصائد سنے تھے، اور جواب بھی جشنِ نور و زو عید کے دن اُس زرد زرد دھوپ کی طرح جو غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے اونچی دیواروں اور محرابوں پر دکھائی دیتی ہے، دیوانِ عام و خاص کے طلائی ستونوں کے نیچے چند لمحوں کے لئے نظر آ جاتی تھی!

کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست!
خیانچہ اُن کے اکثر قصائد مدحیہ کی تشبیہوں میں اور علی الخصوص اس مدحیہ نثر میں جو ہر خیر و زکے دیباچہ میں حضرت بہادر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے لکھی ہے، اس سوز درونی اور اُس آتشِ نہانی

کی گرمی صاف محسوس ہوتی ہے جس کا شعلہ کا رو ان عظمت کے آخری مسافر کو دیکھ کر بے اختیار ان کے دل میں بھر مک اٹھتا تھا۔ اور جس کو وقت کی نزاکت اور انگریزی حکومت کے ذریعہ ظہیر حاصل کرنے کے تعلق، نیز ایک حد تک طبیعت کی شاعرانہ طماعی دار سنگی نے غالب آکر بظاہر پوشیدہ و افسردہ کر دیا تھا!

فتح دہلی کے بعد جو عالمگیر اور عظیم النظیر مصیبت اشرف و اعیان شہر بر نازل ہوئی، اور جس طبع شایجاں آباد کی ان سڑکوں پر جاں بھی صاحبقران اعظم کی سواری کے لئے جہنا کے پانی کا پھڑکا کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظر خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سنا جو عرصے تک دار الخلافہ کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں:

فلو تسعلن عما جرى يوم حصرهم

وذلك مما ليس يدخل في حصرهم

علی انخصوص قلعة معلی کی بربادیاں جن کے لئے اگر تمام حیوانات ارضی کی آنکھیں اشکار ہو جائیں، اور جن کے غم میں اگر آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی ان کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجساد محترمة و رفیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبر اعظم و صاحبقران ثانی کی خون عظمت و جبروت کے حامل تھے جنہوں نے چھ صدیوں

سے متصل شہنشاہی اور فرمانروائی کی گود میں پرورش پائی تھی جنہیں حکم سلطنت کے عیش و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی ہوا تھا۔ اور جو ہمیشہ اُن کروڑوں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوستان سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے سامنے منہ جود پاتے تھے، کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گھٹیوں میں مائے جاہیں اور ان کی لاشیں اُس عظمت رقتہ کا فسانہ ماتم سنائیں، جو چند روزہ بیشتر تک دنیا میں صرف اُنھی کے لئے تھی؟

غدا سمرًا بین الانام حدیثکم وذا سمرید می المسامع کالسمرا
تحتہ مشتاق والف ترجمہ علی الشہداء الطاہرین من الوثا
ان الملوك اذا دخلوا قرية، اسندوها وجعلوا اعزاة اهلها
اذ لئذ وکذلک تفعلون (۳۲: ۲۷)

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لئے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے اور دیکھتے رہے تھے۔ یہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں!

گو ضرورت و احتیاج نے انہیں انگریز حکام اور گورنروں کی جو کھٹوں پر گرا دیا تھا اور مدحہ قصائد لکھواتے تھے، تاہم ”مرزا

صاحب شفیق و مہربان کے خطابات اور ساٹھ شر روپیہ کا خلعت اُس زخم کاری کا مرہم تو نہیں ہو سکتا تھا جو حادثہ غدر سے ان کے دل پر لگا ہو گا؛ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت و احتیاج سے مجبور ہو کر صد ہا باتیں اوپر سے دل سے کر بیٹھا ہے مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثہ بکری اور مصیبت عظمیٰ کے موقع پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدار دلت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی!

الزام لغاوت

چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سب باتوں کا جو اثر ایک مسلمان ہندوستانی کے قلب پر پڑتا تھا، مرزا مرحوم پر بھی پڑا اور ان کی غیرت و حمیت نے گوارا نہ کیا کہ فتح دہلی کے بعد فاتح حکام کے سامنے جا کر خوشامد و عاجزی کریں، اور اُس عیش و نشاط تازہ کا تماشہ دیکھیں جو دہلی مرحوم کی بربادی و تباہی کے غم و ماتم سے حاصل کی گئی ہے۔ وہ خود ہی کہہ چکے تھے:

ہر جاوہ کہ از نقش پئے تست بگلشن

جا کیست بہ جیب یوس انداختہ ما !

ان کے تعلقات حکام انگریزی کے ساتھ ابتدا سے خوشامد نہ رہے تھے۔ ان کا وظیفہ انہی کے ہاتھ تھا۔ اس کمبخت وظیفہ کے داگدار کرنے کے لئے انہیں بیسوں قصبہ انگریزوں کی مدح و ثنائیں

اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر دجہانگیر کی مداحی ہو رہی ہے! پھر وقت بھی ایسا پر آشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا، اور سولی کے تختوں اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رستی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ بڑی ہی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے۔ تاہم ان کی طبیعت کچھ اس طرح بیزار ہوئی کہ فتح کے بعد قلعہ میں وفاداران سرکاری جمع ہوئے، انعامات و سندات ملیں، اُن تمام لوگوں نے بڑی بڑی کوششیں کر کے اپنے تئیں نمایاں کیا جنہوں نے غدر میں حصہ نہیں لیا تھا اور اس کے صلہ و اکرام سے مالا مال ہوئے، مگر مرزا غالب اپنے بیت الحزن سے نہ بچ سکے اور کسی حاکم کے آگے جا کر اس کا منتقم و فاسر جبرہ نہ دیکھا!

بعد گواہی بریت کے لئے انہوں نے اس عدم حاضری کے بہت سے وجوہ بیان کئے تھے، مگر اصل حقیقت یہی تھی کہ دل درد مند کے ہاتھوں پاؤں بندھ گئے اور مصلحت و ضرورت کی عاقبت اندیشیوں کی بھی کچھ نہ چلی، بعد کو ہوش آیا تو عذر بنا کر پیش کرنے پڑے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری حلقوں میں عام طور پر اس مندستان کے سب سے بڑے شاعر کی نسبت ٹھیک اسی طرح "غیر وفاداری" کا یقین ہو گیا، جس طرح آج کل بہت سے شرفوریوں کی نسبت یقین کیا جاتا ہے جو اپنے دلی جذبات و حیات کے ہاتھوں مجبور ہیں، ان کی

وہ پیش بھی بند ہو گئی جو ان کی زندگی کا اصلی آذوقہ تھی اور چند جام ہائے
 ”فرنج“ گلاب آمیز کا وسیلہ تھی۔ انگریزی درباروں میں پریش و
 طلب اور عام تعلقات لطف و نوازش بھی ایک قلم موقوف ہو گئے
 اور پوری طرح نیم باغیوں میں شمار ہونے لگا!

مرزا مرحوم کے لئے یہ حالت بڑی ہی سخت مصیبت تھی۔ ایک
 شاعران کڑی منزلوں کا مرد نہیں ہو سکتا۔ انوری نے صاف کہہ دیا
 حکیم و شاعر و ملا جگہ نہ جنگ کنند!

قلعہ کے برباد ہونے سے وہ حذر و پیہ بھی جاتے رہے
 جو بہ تعلق تاریخ نویسی و شاعری ملا کرتے تھے۔ اس برسرکاری و بیخ
 کا بند ہو جانا قیامت تھا۔ شام کی سرشاری اور صبح کی خار شکنی
 دونوں سے محروم ہو گئے۔ ساری زندگی آزادانہ داد و ستد

(۱) مرزا مرحوم اپنے فارسی خطوں میں دلایتی شراب کو ”فرنج“ لکھا کرتے
 ہیں۔ فرانس اور اسپین شراب سازی کا مرکز ہیں۔ کوئی فرانسیسی
 شراب لی ہوگی جس کو ساختہ فرانس ہونے کی وجہ سے ”فرنج“ کہہ دیا ہوگا
 انھوں نے اپنے عالم دارشکی میں یہی نام رکھ لیا۔ قاعدہ تھا کہ اس کی
 تیزی کم کرنے کے لئے گاہ گاہ عرق گلاب ملا لیا کرتے تھے چنانچہ ایک فنل
 کے مقطع میں کہتے ہیں:

آسودہ باد خاطر غالب کہ غمے است آسختن بہ بادہ صافی گلاب را!

اور یک گونہ قانع البالی میں بسر ہوئی تھی اب فاقہ مستی تک نوبت پہنچ گئی اور صرف دوستوں اور شاگردوں کی خدمت گزاری پر دن گئے گئے۔ اس زمانے کے خطوط اردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے تنگ آ گئے تھے اور سرکاری وظیفہ کی داگرزاری اور الزام بغاوت سے بریت کے لئے بڑی کوششیں کرتے تھے۔

غیر مطبوعہ قصیدہ

یہ زمانہ تین سال تک رہا اور صفائی کی کوئی کوشش سود مند نہ ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ دربار خلعت کا نہ ملنا، نذر وغیرہ کا سلسلہ بند چلانا قدیمی عزت و احترام کی یاد اپنی بے آبروئی و بے عزتی پر حسرت و افسوس، یہ تمام باتیں جو اس میں پائی جاتی ہیں، صرف اسی زمانے کی شکایتیں ہو سکتی ہیں۔ غالباً لارڈ کلیننگ نے جنوری سنہ ۱۸۵۷ء میں جوہا آگرہ میں لب دریائے جنا کیا تھا، اسی کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔ دہلی سے اس میں شریک ہونے کے لئے شاید آگرہ گئے ہوں گے ”لب دریا“ خیموں کے گئے اور ریل کا وقت کم ہونے کے ذکر سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

چنانچہ اس کی تصدیق ان کے بعض فارسی قصائد و قطعات سے بھی ہوتی ہے جو اسی زمانے میں لکھے گئے تھے، اور جو بالکل اس

قصیدے کے ہم معنی و ہم مطلب ہیں۔
مثلاً غدر کے بعد جو فارسی قطعہ مسٹر اڈنٹن بہادر لفٹنٹ گورنر
صوبہ شمال و مغربی کو مخاطب کر کے لکھا ہے، اور جس کا پہلا شعر:

فرزائے یگانہ، اڈنٹن بہادر
کا موخت دانش از بے آئین کاروانی

ہے۔ اس میں اپنی مصیبتوں کا افسانہ بنا کر الزام شرکت بغاوت
سے اپنی بریت کی ہے اور کہا ہے کہ حکام کے دل میری جانب سے
پھر گئے ہیں۔ آپ مدد کیجئے اور میری صفائی کر دیجئے!
چنانچہ لکھتے ہیں کہ سیرے تعلقات انگریزی حکومت سے نہایت
قدیمی ہیں۔ میں ہمیشہ حکام کی مدح میں قصائد لکھتا رہا اور صلہ و انعام
سے شاد کام ہوا:

از حضرت شہنشاہ خاطر نشان من بود
در مزد مدح سخی صد گونہ کا مرانی
یہی حالت تھی کہ:

ناگہ تند بادی کاں خاست در قلمرو
برسم ز دآں بارانیزنگ آسمانی!
یعنی غدر کا ظہور ہوا۔

در وقت فتنہ بودم غلین دبود با من
زاری دے نوالی، پیری و ناتوانی!

حاشاکہ بودہ باشم ”باغی“ باشکارا
 حاشاکہ کردہ باشم ترک و فائہسانی!
 از تہمتی کہ بر من بستند بد سگالان
 حکام راست با من یک گو نہ سرگرائی

یعنی غدر کے زمانے میں پیری و ناتوانی کی وجہ سے کہیں آجا
 نہ سکا اور اظہار و فاداری نہ کر سکا۔ باغیوں سے مجھے کوئی تعلق ظاہر
 و باطن نہ تھا، محض تہمت تراشی سے مقامی حکام مجھ سے بدظن ہو گئے
 ہیں۔

اسی طرح ۱۸۷۷ء میں جب لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے
 دربار کیا ہے تو دو مطلقوں کا ایک پر زور قصیدہ لکھ کر پیش کیا:

ز سال نو دگر آجے بردے کار آمد

ہزار و شست صد و شست در شمار آمد

اس قصیدے کے آخر میں وہ سب شکایتیں ایک ایک کر کے
 لکھی ہیں جن کے لئے اس غیر مطبوعہ اردو قصیدے میں نفثت گورنر پنجا
 ب سے فریادی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹھیک ایک ہی وقت کی لکھی ہوئی
 دونوں چیزیں ہیں۔ فارسی قصیدہ ”اسیرائے کے پاس بھیجا ہو گا، اور
 یہ اردو کا غیر مطبوعہ قصیدہ نفثت گورنر پنجا ب کے پاس اُردو
 قصیدے میں نمبر کرسی، خلعت و نذر، وظیفہ و انعام، تین چیزوں
 کے بند ہو جانے پر افسوس کیا ہے:

نبر رہا نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام،
 یہی دکھ اس فارسی قصیدہ میں بھی رویا ہے۔ اپنی قدیمی مداحی
 و وظیفہ خواری کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

بہ ناکر فت خیاں صرصرے دیزید بیدر
 شرارہ بار غبائے زمغز خاک بخت
 دریں جگر گل آشوب کر صعوبت
 گواہ دعوی غالب بعرض بے گنہی
 کزاں بر آئینہ آساں غبار آمد
 سیاہ رو سپے کاندیں دیار آمد
 پاہدار سپہے بہ زینہار آمد
 ہمیں بس ست کہ ہر گونہ رشکار آمد
 یعنی غدر کی باد صرصرے مصائب کا غبار چھا گیا، اس زمانے میں
 میری بے گناہی کا ثبوت یہی ہے کہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہ ملا اور
 اس لئے کوئی مخالفانہ کارروائی میرے مخالف حکام نہ کر سکے۔
 اس کے بعد کہتے ہیں کہ اب آپ سے طالب لطف و کرم و ملامتی

امات ہوں :

کنوں کہ شد ز تو زینت فزائے رفے زمیں
 سواد ہند کہ چوں زلف تار و مار آمد
 خطاب و خلعت و پیشن ز شاہ می خواہم
 ہم از نخست بدیں وایہ ام قرار آمد
 پس از سہ سال کہ در رنج و بیج و تاب عزت
 سر گذارش اندوہ انتظار آمد
 یہاں بھی اُسی چیزوں کو طلب کیا ہے اور لکھا ہے کہ تین سال پہلے

حالت پر گزر چکے ہیں۔

غالباً اس قصیدے کے گزرتے کے بعد شملہ سے تحقیقات کی گئی اور جب ان کی بے گناہی ثابت ہو گئی تو بدستور ریشن جاری کر دی گئی تین سال کی پھیلی مجموعی رقم بھی دیدی گئی تھی، اس سے مرزا صاحب بہت خوش ہوئے تھے۔ چنانچہ اردو سے علی میں اس کا ذکر موجود ہے۔

جن لوگوں نے مرزا مرحوم کی صفائی کے لئے خاص طور پر کوشش کی تھی، مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اُن میں سر سید مرحوم بھی تھے۔ اس واقعہ سے سید صاحب اور مرزا مرحوم میں صفائی بھی ہو گئی جن کے باہمی تعلقات قدیمانہ آئین اکبری کی تقریبات کے قصہ سے کچھ مکر ہو گئے تھے۔

بہر حال اس غیر مطبوعہ قصیدے کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہے اور ۱۳ جنوری کے دربار سے مقصود دربار اگرہ ہے۔ امید ہے کہ مرزا مرحوم کے اُن عقیدتمندان کمال کے لئے جن کی تعداد اب ملک میں روز افزوں ہو رہی ہے، یہ غیر مطبوعہ قصیدہ بہت دلچسپ ہو گا۔ گو شاعری کے اعتبار سے چنداں اہم نہ ہو۔
رحمۃ اللہ علیہ وغفر اللہ ذلویہ!

قصیدہ

کرتا ہی چرخ روز بصد گونہ احترام
حق گو و حق پرست حق اندیش حق نیک
جم رتبہ مشکوڈ بہادر کہ وقت رزم
جس بزم میں کہ ہوا نہیں آئین سلکشی
فرماں روائے کشور پنجاب کو سلام
نواب مستطاب امیر شہ انتقام
ترک فلک کے ہاتھ سے چھین لیں جام
وہ آسان شیشہ بنے، آفتاب جام

قطعہ

چاہا تھا میں نے تم کو مہ چارہ کہوں
دورات میں تمام ہی ہنگامہ ماہ کا
سچ ہی تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی
ٹکڑے ہوا ہی دیکھ کے تحریر کو جگر
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
سب صودہ میں بدل گئیں ناگاہ یک دم
ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاگداز
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
اُس بزم پر فروغ میں اس تیر تخت کو
سمجھا اسے گراب ہوا پاش پاش دل
دل نے کہا کہ یہ بھی ہی تر خیال خام
حضرت کا غزو جاہ رہے کا علی الدوام
دریائے نور ہی فلک آہگینہ فام
حق کے تفضلات سی ہو مرجع انام
تحریر ایک جس سے ہوا بند و تلخ کام
کاتب کی آستیں ہی مگر تیغ بے نیام
جب یاد آگئی ہی کلیجہ لیا ہے تھام
نمبر ہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام
جس نے جلا کے راگ مجھ کر دیا تمام
استادہ ہو گئے لب دریا یہ جب خیام
نمبر ملا نشست میں ازرقے استہام
دربار میں جو مجھ پہ چلی چشمک عوام

عزت یہ اہل نام کے ہستی کی ہے بنا
 تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
 آتا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی تڑپا
 اس کشمکش میں آپ کا انداز نامور
 جو اں نہ کر سکا وہ لکھا حضور کو
 ملک و سپہ نہ تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
 و کٹوریہ کا دھر میں جو مدح خوان ہو
 خود تے مدارک اس کا گوشت کو فطر
 امر جدید کا تو نہیں ہی مجھے سوال
 ہے بندہ کو اعادہ عزت کی آرزو
 دستور فن شعر ہی ہے قدم سے
 ہے یہ دعا کہ زیر نگین آپ کے سے
 اقلیم سند و سندھ سے تا ملک و دم شام

عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
 اس ناز کا فلک نے لیا مجھے سے اتنا مقام
 تھا بارگاہ خاص میں خلقت کا اثر ہوا
 آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام
 دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام
 سلطان بروجر کے در کا ہدیہ غلام
 شاہان عصر جاہے لیں عزت اس حوام
 بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب جس کا نام
 بائے قدیم قاعدے کا چاہئے قیام
 چاہیں اگر حضور تو مشکل نہیں یہ کام
 یعنی دعا یہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

تعلیم اور تعلیمی ادارے

۱۔ گورنمنٹ کی تعلیمی حکمت عملی

۲۔ ندوۃ العلماء

۳۔ نشہ شام کی نصف شب

۴۔ نشہ نیم شبی کا صبح خمار

اہلال ۴ جون ۱۹۱۳ء

۱۱/۱۸/۲۵ راج ۱۲

۲۵ اگست یکم ۱۲

۵/۲۶/۲۵ زوری ۱۳

۵/۱۳/۲۵ راج ۱۳

مسلمانان ہند اور گورنمنٹ کی

تعلیمی حکمت عملی

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَاءُ كَسَرَابٍ
يَقِيقَةٍ يُحْسِبُهُ الظَّمَانُ مَاءً،
حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ
شَيْئًا وَجَدَ اللَّهَ عِندَهُ فَوَفَّاهُ
حِسَابَهُ وَاللَّهُ مَرِئُومٌ الْحِسَابِ

جو لوگ منکر ہیں، ان کے کام ایسے ہیں جیسے
خیل میدان میں ریت، کہ یہ یا اس کو دور
پانی سمجھ کر دوڑتا ہے، مگر جب اس کے پاس
آیا تو کچھ بھی نہ پایا، پایا تو اللہ کو اپنے قریب
پایا جس نے اس کا حساب چکا دیا، اور اللہ ہر
حساب کر دینے والا ہے۔ (۳۹:۲۴)

”تعلیم ہیچ ایک ایسے درخت کے مشابہ ہے جو کسی نہر کے کنارے اپنی
ننادری و مطہری و سرسبزی کی بہار دکھارہا ہو۔ یہ درخت کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟
ایک ننھے اور نیر سے بیج نے اس کو درخت بنایا ہے، جو درخت کے تمام افعال و

خواص پر مادی ہو، اور جو اس وقت خاک میں چھپا ہوا ہے۔ انسان بھی اسی درخت کے متابہ ہے۔ بچوں میں دیکھو، وہی نام قوتیں مخفی و مستور ہیں، جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتی ہیں۔ انسان کی تہذیب صرف ادبی و اخلاقی حالت کا نتیجہ ہوا اور کچھ نہیں۔
(ہنری بسا لوشی)

ہندوستان کی تعلیمی رفتار نے دماغی قوی پر جو ناگوار اثر ڈالے ہیں، طبیعتیں جس طرح کند ہو گئی ہیں، ابھرنے والی نظری طاقتوں پر جو گراں بار دباؤ پڑا ہے، فوائدِ ذہنیہ کی پامالی میں جیسی دست درازیاں اس نے کی ہیں، اس کی خارجی نظیر اگر ہو سکتی ہے، تو ڈارٹ جگرڈ“ اور اس کے بجائی راجیر“ کی وہ حکمت علمی جس کی رو سے ایک طرف تو مشرق میں جنوبی اطالیہ کی عربی سلطنت پامال کر کے اسلامی دنیا سے عربوں کے تعلقات ہمیشہ کٹنے سے منقطع کر دئے گئے، اور دوسری طرف اس خیال سے کہ ملک کی تمدنی و صناعی و علمی اہمیت کے اجزائے عظمیٰ ان دنوں میں حرب تھے، ان کو یہ امتیازی رعایتیں بھی دی گئیں کہ مسیحی گورنمنٹ کی نگرانی میں انکی تعلیم گاہیں برقرار رہیں، جن میں ان کی اولاد کو ایسی تعلیم، جو منشائے حکومت کے مطابق ہو، سرکاری خرچ پر دی جاسے۔ اس وقت تو ان مراعات کی قدر و قیمت کا علم اعتراف ہوا تھا لیکن حکومت نے جو سیاسی بندشیں ان کے ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں، قومی ترقی کے لئے وہ اسی قدر مہلک ثابت ہوئیں کہ قومیت میں روز بروز انحطاط آنا لگا اور آخر یہ حالت ہو گئی کہ حقوڑے ہی زمانے میں عرب یا تو بالکل ہی فنا ہو گئے یا کچھ رہے بھی تو سرائیت کی تہذیب نے ان کو اپنے اندر مدغم

ہمارے ملک میں اصلاح تعلیم کا خیال تو گورنمنٹ کو اب ہوا ہے اور فاضل مسلمانوں کے متعلق ابھی ۲ مئی ۱۹۱۲ء کو تعلیمی سرکار شائع کیا گیا ہے، لیکن یورپ میں اس کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز سے دوش بدوش ہے۔ ہنری بسٹونی متونی ۱۸۲۰ء (جس کے الفاظ اس مضمون کے طغرائے عزمان ہیں) تہذیب نظام درس کے عوالم محرکہ میں پہلا شخص تھا۔ وہ ایک مقام پر لکھتا ہے:-

”آج کل تعلیم کے جو طریقے رائج ہیں ان کے اتباع نے یورپ کو بڑی سخت غلطی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ غلطی ہی نہیں وہ آپ اپنے سامان ہلاکت میں ہے۔ ایک طرف تو وہ اعلیٰ درجہ کے علوم و فنون و صنائع میں زنی کے فلکِ اعزشی پہنچ گیا، جو اور دوسری طرف تعلیمِ طبیعی کی وہ بنیاد ہی کھو بیٹھا ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ سب کو ایک تعلیم دینی چاہیے، اور سب کی تعلیم ان کے ذوقِ طبیعی کے موافق ہونی چاہیے مجھے معلوم نہیں کہ یورپ کی طرح دنیا کا کوئی اور حصہ ترقی کے اسی درجہ تک بلند اور پھر مہبوط کے ایسے قعر میں گر گیا ہو۔ ہمارے براعظم کی یہ حالت اس مجسمے کے مشابہ، جو جس کی تصویر پیغیروں نے کھینچی تھی کہ اس کا سر تو سونے کا ہے مگر پاؤں (جس پر یہ سر قائم ہے) ٹھیکری کے بنے ہیں! یورپ نے اپنے ان تعلیمات کے ذریعہ سے قوم کو محبت و الفت و دانائی و حکمت و مدرکات و جذبات کے بناب سے برہنہ کر کے، اس کے دماغ میں انسِ پسندی سے وحشت، ایمان سے شغواء و توہمات و خرافات سے دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ اس خلل کا سد باب میری رائے میں یہ ہے کہ سطحی تعلیم کو ترک کر کے عقلی و ذہنی تعلیم کو ترقی دی جائے، اور حقیقی معرفت کے مصدر و منبع کی جانب رجوع ہو۔“

یہ وہ الفاظ ہیں، جو یورپ کی تعلیمی حالت کے متعلق کہے گئے تھے، جس کی ٹلی تو، اس زمانہ میں بھی مسلم تھی، مگر صد حیف ہے ہندوستان پر جو اس طویل و بعض انگریزی عہد حکومت میں علم کے صحیح مفہوم تک سے آشنا ہونے نہ پایا!!
مال میں تعلیم کی نسبت جو سرکاری سرکار شائع ہوا ہے، اس نے مسئلہ تعلیم و اصلاح کو از سر نو چھیڑ دیا ہے۔

مسلمانوں کی قومیت کے آج کل جو مخصوص ترکیبی عناصر ہیں، ان سب میں فکر گذاری و ممونیت کا عنصر ہر ایک پر غالب ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سرکار میں گورنمنٹ کی جانب سے جس سلسلہ احسان کا اعلان ہوا ہے، اس کی منت پذیری کے جذبات سے تمام قوم کے سینے لبریز ہو رہے ہیں یہ احساس واقعہ میں قابل تعریف ہے اور بہودعا منہ کی ذیل میں حکومت کا جو قدم آگے بڑھے، رعایا کا فرض ہے کہ اس کا خیر مقدم بجالائے، اور اس کی قرار واقعی عزت کرے، لیکن جب اس کی شاعت سے خود گورنمنٹ کا مدعا یہ ہے کہ نفاذ احکام سے پیشتر استشارہ و استصواب کر کے مسئلہ کو منسوخ کر لیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس باب میں آزادی سے بحث نہ ہو، اور عام رائے کو اصلی معنوں میں آشکارا نہ کیا جائے؟

عہد قدیم کے ایک گنوار عجمی نے ایک نامور عرب، خطبہ بن عوفان سے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ "حسن اور حسین دینی حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما، اس پیغمبر کیڑکیاں تھیں؟ اس نے جواب دیا کہ فدا کے لئے اس ایک جملہ میں کوئی ایک بات تو درست کہی ہوئی۔" یہ بحث ضروری نہیں کہ اس واقعہ میں موجودہ سرکار میں کس حد تک مماثلت موجود ہے؟ البتہ اس حقیقت کو

بے نقاب کر دینا ضروری ہے کہ سکر کی خامیاں پختہ مغز ان نقد و نظر کے لئے نہایت ایسی کا باعث ہوتی ہیں۔

(۱) اسلام اور تعلیم میں قدرتی لزوم ہے، اس لئے ہر ایک مسلمان کی یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ سب سے پہلے تعلیم یافتہ ہو۔ مہدر سالت میں احکامات اہلہار امان ہی پر قناعت نہ تھی، بلکہ یہ بھی تقید تھا کہ ہر ایک مسلمان بغیر مسور قرآن کریم کی تعلیم نہی، کہ اس زمانہ میں وہی ایک تعلیم تھی، حاصل کرے۔ اس کے لئے اتنے ترغیبی احکام تھے کہ ضروریات زندگی کے اہم اوصاف حتیٰ کہ بنی دفری اور مہر نکاح تک میں ادائے معاوضہ کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ قرآن کی تعلیم دینے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے۔ اسی خصوصیت پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ اعلیٰ تعلیم تو معدوم ہے ہی، ابتدائی تعلیم میں بھی مسلمان کتنے پیچھے ہیں؟ با اس ہمہ مرکز میں بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدائی تعلیم میں مسلمانوں کی جماعت ہر طرح فوقیت رکھتی ہے۔

(۲) ہندوستان کے تمام طبقات و عناصر میں اگر زبان اردو کی عمومیت کو بحث میں نہ بھی لایا جائے، جب بھی اس قدر ماننا پڑے گا کہ تمام اقطاع کے مسلمانوں میں اردو سمجھی جاتی ہے، علمی پہلو سے ہر جگہ اسی زبان کی حکومت ہے اور جہاں دوسری بولیاں رائج ہیں وہ بھی اصل میں زبان نہیں ہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ زبان کے لہجے ہیں، اور ان میں بھی اردو دخیل ہے پھر بھی گورنمنٹ کی رائے ہے کہ بہت سے اقطاع ایسے ہیں جن میں مسلمانوں نے اردو کا استعمال بالکل ترک کر دیا ہے۔

(۳) یہ درست ہے کہ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ذریعہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں مسلمانوں کو سخت سے سخت زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور یہ بھی سچ ہے کہ غالب تعداد کے مدارس ثانویہ (سیکنڈری اسکولوں) کا انتظام بہت کم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کا علاج صرف یہ بنایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے خاص خاص کالج و اسکول قائم کرنے سے یہ دقیق ثانی بریگیٹ سوال یہ ہے کہ ان مخصوص درسگاہوں کا سلسلہ اتنا وسیع تو ہو گا نہیں کہ تمام اسلامی آبادی کے لئے کافی ہو سکے، لہذا حالہ عام درسگاہوں کے ذریعے سے یہ کمی پوری کرنی پڑے گی۔ پھر ان درسگاہوں میں یہ مشکلات کیوں کر آسان ہوں گی؟

(۴) مدرسہ عالیہ کلکتہ، اسلامی کالج لاہور، اور اسلامی اسکولوں کی اصلاح کی تجویز پیش کی گئی ہے، جو نہایت عمدہ بات ہے۔ اگر اس تجویز پر قابل و تجربہ مصلحوں کی اعانت سے عملدرآمد ہوا، اور تعلیمی و انتظامی معاملات میں مسلمانوں کی آزادی طلب نہ ہوئی، تو بے شبہ یہ ایک بہت ہی کامیاب و معقول صورت ہوگی۔ مگر خوف زدہ پبلک کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ ہوگی کالج، حسین آباد اسکول، اور مرزا محسن مرحوم کے وقف اسیسٹ کے لئے بھی ابتدا میں تحریک اصلاح ہی پیش ہوتی تھی، مگر اصلاحی مداخلت نے تھوڑے ہی دنوں میں ان سب کے نظم و نسق سے مسلمانوں کو بے دخل کر دیا، نیشنل اسکول اعظم گدہ اور کاظمین اسکول لکھنؤ اسی بہانہ سے ٹوٹے ہیں، اور اسی مادے کی اصولی صورت گری ہے، جس نے مدرسہ العلوم کی حکومت میں غیروں کو مسلمانوں کی جگہ صاحب نفوذ و حکومت بنا رکھا ہے۔

(۵) برائیتوں انتظام کے ذریعے سے اسلامی ہوسٹلوں کی تجویز نہایت مبارک ہو، لیکن کیا حقیقت میں یہ ہوشل غیر سرکاری مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونگے؟ کیا واقع میں اسلامی خصوصیات کے مطابق یہاں تہذیب نفس کا انتظام ہوگا؟ اور کیا بغیر ان باتوں کے ہوسٹلوں سے کسی مفید و سودمند نتیجہ کی امید ہی بجانب ہو سکتی ہے؟

اب ان اصلاحات کا مقابلہ یورپ کی تعلیم و طرز تعلیم سے کیجئے جس کو ہندستان کی تعلیمی زندگی کے لئے مثال و نمونہ کے طور پر ہمیشہ پیش کیا جاتا ہے، اور یونیورسٹی کے ہر ایک کانوڈکشن میں بند دوستانیوں سے اسی کے اتباع کی خواہش کی جاتی ہے۔ اس تعلیم کے خاص خاص اصول یہ ہیں:-

(۱) تعلیم اس خارجی ترقی کا نام نہیں ہے جو اشاعت و ادبیات کی سطحی معلومات پر قائم ہو، اصل میں تعلیم ان مخفی قوتوں کے اظہار کا نام ہے جو فطرت نے انسانی طبیعت میں ودیعت کی ہیں۔ علم النفس (سائیکالوجی) کے اصول پر آج یورپ میں جس تعلیم کا رواج ہے اس کا مدعا یہی ہے کہ ان خیالات کو علمی صورتوں میں لا کر درس گاہ عمل کا ایک جز بنا لے۔

(۲) تعلیم کا پہلا ہ انداز تھا کہ علم کو محنت و کوشش سے حاصل کیا جائے اور انسان کو محنت و کوشش کا خوگر بنایا جائے۔ اب یہ اسلوب ہے کہ تعلیم کا نقطہ مرکزی صرف نفع ثانی و نفع رسانی ہو۔

(۳) تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ نقد و اختیار و توسیع معلومات کے ذریعے سے انسانی قوی کو ترقی دی جائے۔

(۴) درسگاہوں میں طرز تعلیم کی اصلاح کی جائے اور درس دینے والوں کو نونہل تہذیب بنایا جائے، تاکہ وہ اپنے فرائض کو نہایت کامیابی سے ادا کر سکیں۔
 (۵) تلامذہ کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ ہو، ان کی ذہنی و عقلی و دماغی مالیاتیں ملحوظ رہیں، اور درس میں ہر ایک متعلم کی منفعت و مذاق طبیعت کو زیر نظر رکھا جائے۔

(۶) ابتدائی تعلیم کا پورا پورا اہتمام ہو۔

(۷) تعلیم کا مقصد افراد کو ترقی یافتہ بنانا ہو۔

(۸) تعلیم کے لئے فرض ہے کہ ایسے طرز و طریق پر دینی جائے کہ دنیا کا ہر ایک فرد اپنی عقلی قدرت و طبعی استعداد کے مطابق خاطر خواہ ترقی کر سکے۔
 کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں کہیں بھی ان باتوں کا نام و نشان ہو؟ وہ تعلیم جس کی بنیاد محض گورنمنٹ کی مخصوص ضرورتوں کے لئے پڑی ہو، جس کے نصاب حقیقت میں، وضع و اقتاد میں، اسلوب و پرواز میں، استعداد کا جو ہر ہر ایک چیز پر غالب ہو، جس کا نشانے عمل ہی یہ ہو کہ تعلیمی ڈگریاں، غلامی کی ذلیل زندگی بسر کرنے کا آل تمنا ثابت ہوں، جو افراد کے دماغی منزل کو ترقی دینا چاہتی ہو، جو عقلی قدرت و طبعی استعداد کے دبائے رکھنے کی حامی ہو، جس کے حکام فیصلہ کر چکے ہوں کہ ہندوستان کے لئے براہمڑی ایجوکیشن کا لزوم سود مند نہیں ہے، جس کے ذریعے سے انشاؤ و لغت و ادبیات کی سطحی معلومات میں بھی کامیابی نہ ہوتی ہو، جس کا خالص نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ فطرت انسانی کی مخفی طاقتیں کسی حالت میں بھی ظہور پذیر نہ ہو سکیں

جس کے انداز درس میں نقد و اختیار و توسیع معارف کی گنجائش ہی نہ رکھی گئی ہو، جہاں درس دینے والے اپنے فیشن کے لحاظ سے بہترین نمونہ تہذیب، اور اپنے کیرکٹر کی بنا پر بدترین تمثال بربریت و وحشت نظر آئیں، جو اسانڈہ کو تلامذہ کے ساتھ ذلت آفریں خشونت کا برتاؤ سکھائی ہو، جو ایک عجیب و غریب معنی میں اصول مساوات کی اس شدت سے پابند ہو کہ طلباء کی ذہنی و عقلی دوامی حالتیں خواہ کیسی ہی مختلف ہوں، اور ہر ایک کے ذوق طبیعت میں چاہے کتنا ہی تباہی محسوس ہوتا ہے، مگر سارے گلے کو ایک ہی لٹھ سے ہنکایا جائے، اور تمام طبقات مختلفہ کو ایک ہی قسم کی بے نمک تعلیم دی جائے، ایسی تعلیم اور اس تعلیم کا اصلاحی منشور (سرکل) اگر کسی قوم کی کامیاب زندگی میں معاون ہو سکتا ہے تو ہم کو تسلیم کرنا چاہیے کہ قدرت نے نتائج میں غلطی کی، ورنہ محکوم مسلمانانِ مسلمانی کے لئے وہاں کی مسیحی گورنمنٹ کے فرمانِ مراعات کو اصل میں آیہ رحمت ثابت ہونا چاہیے تھا!!

یورپ میں طرزِ تعلیم کے کیا اصول ہیں؟ اس کا معیار حقیقت یوں قائم کیا گیا ہے

(۱) طرزِ تعلیم میں اصلی چیز نقد و نظر ہے۔

(۲) ہر ایک شاخ میں درس کی ابتدا سادہ و سہل اصول سے کر کے دقیق

مسائل تک اس کو بند رنج پہنچانا چاہیئے۔

(۳) مسئلہ جب تک منفعہ ہو کہ متعلم کے ذہن نشین نہ ہو جائے معلم کو اگلے

نہ پڑھنا چاہیئے۔

(۴) طرز تعلیم کو صرف عقل کے ترقی دینے والے مسائل کے دائرے میں محدود رہنا چاہیئے۔ مباحث علیہ کے دوران میں دماغوں پر غیر علمی تسلط بٹھانا، یا علمی اصول میں مذہبی تحقیق کو خلط و ملط کر دینا، دماغ کے لئے ایک تشویش آفریں چیز ہے۔
(۵) تلاذہ کی شخصیت قابل احترام ہے۔

(۶) تعلیم کا یہ نتیجہ ہونا چاہیئے کہ انسان میں جو قوتیں مخفی ہیں، وہ آشکار ہو جائیں۔
یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیئے کہ دل میں نئی قوتیں ڈال دی جائیں۔

(۷) قوت کو معلومات، اور ذکاوت کو تعلیم سے آمیزش دینی چاہیئے۔

(۸) متعلمین و متعلیمین کے مابین جو بزرگانہ تعلقات ہوں ان کی عمارت اس دماغ میں پر تعمیر ہونی چاہیئے، جس کی بنیاد دراصل تعلیم رسالت نے ڈالی تھی کہ
”لِیْکِیْکُمْ کِتٰبٌ مِّنْکُمْ وَ لَیْسَ حَکْمٌ“
”نہم میں جوڑے ہوں ان کی بزرگی داشت کی
صَغِیْرٌ کَھ“
جائے، اور جو تھوڑے ہوں ان کے ساتھ

رحمت و مہربانی کا برتاؤ ہو۔

(۹) طرز تعلیم کی خاص غرض تہذیب نفس سمجھنا چاہیئے۔

سوال یہ ہے کہ گورنمنٹ کی نظارت معارف (سررشتہ تعلیم) میں کیا اس طرز پر تعلیم دی جاتی ہے؟ اور کیا موجودہ اصلاحی فتنہ اس دل آویز دعوے کا موقع کی ضمانت ہو سکتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں اب انھیں اصول پر تعلیم دی جائے کرے گی؟ سرکل میں جب ان توقعات کی تکمیل کا نام و نشان ہی نہیں ہے، جب طرز تعلیم میں نقد و نظر سے علاقہ ہی نہیں رکھا گیا، جہاں مسائل کے افہام و تفہیم کے لئے کوئی اسلوب تدریج ہی نہ ہو، مباحث درسی کو طلباء سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر

درسگاہ کی ماضی پوری ہو جائے، مدرسین کا یہ فرض ہو کہ مقدار مفودہ تک کے لئے اپنے روزانہ بچروں کا وظیفہ پورا کر دیا کریں، عقلی ترقی کے محرکات سے علاقہ نہ ہو، تلامذہ کی شخصیت کا احترام غیر ضروری سمجھا جائے، کوشش کی جاتی ہو کہ اس طرز تعلیم سے متعلمین کی بہترین مخفی قوتیں مخفی تر ہو جائیں، ان کے دلوں میں نئے نئے قسم کے قوی استعداد پیدا ہوں، تہذیب نفس کی غرض تدنیں قلب سے آلودہ رہے، متعلمین و معلمین کے مابین اکثر اوقات میں خاص قسم کے تعلقات رہا کریں، تو پھر ان حالات میں یہ اصلاحی نائنس کیا مفید ہو سکتی ہیں؟ اور ان پر فکرئے کے رزولیشن پاس کرنے کے کیا معنی ہیں؟

یورپ کی بیشتر مسیحی طاقتوں نے دینائے اسلام کو جن ہولناک و ہلاکت افزا مصائب کا آماجگاہ بنا رکھا ہے، اس کے زخم ایسے اوجھے نہیں ہیں کہ معمولی مرہموں سے مندمل ہو جائیں۔ وہ قوم جس کو فنا کرنے کی علانیہ تدبیریں ہو رہی ہوں، اگر ترقی کی اصلاح سرسری تجویزیں ہی اس کو پامال ہونے سے بچا سکتی ہیں، تو کوئی شک نہیں کہ شیخ شیرازی کی۔

خانہ از پاسے بست ویران است

مذنی حکایت میں خوابہ در بند نقش ایوان است

کی بنا کاری، مکان کو انہدام سے محفوظ رکھنے کی سب سے اچھی ترکیب ہی ہوگی۔

یہ وہ اصول ہیں جن پر ممالک یورپ کی ہر ایک درسگاہ میں عمل درآمد فرض ہے، اور جن کے طریق عمل میں بہت کم اختلافات پیدا ہوئے ہیں، لیکن اس کے

دنوں سے فریات میں بعض اور اصلا میں شروع ہو گئیں ہیں، جن کے اہم پہلو یہ ہیں (۱) تعلیم و طرز تعلیم سے خاص غرض یہ تھی کہ تلامذہ کے قومی عقیدہ آراستہ ہو جائیں، لیکن اس کی کوئی سہل الوصول ترکیب متعین نہ تھی۔ اب اس کی یوں تحدید کی گئی ہے کہ صرف اعمال اور اکیہ سے اس میں کامیابی ممکن ہو۔

(۲) مصالین۔ اب تک طبیعیات کی تعلیم مقدم رکھی تھی، یہ تقدم قراب بھی یک گونہ مسلم ہے، اور دنیا میں سب سے زیادہ فزیکل سائنس ہی کو فروغ دینے پر زور دیا جاتا ہے، مگر اہل نظر کی رائے میں قومیں عموماً زبان کی ترقی یا تنزل کو بنتی جھگڑتی ہیں، اس لئے ادبیات کی تعلیم کو طبیعیات پر ترجیح حاصل ہے۔

(۳) پہلے جغرافیہ و حساب و سائنس کے درس پر زیادہ اصرار تھا، لیکن اب اس کی جگہ زبان و ادب تاریخ کو ملی ہے۔

(۴) اب تک تعلیم نفس کی حمایت کی باقی تھی، قدیم فلسفہ عقیدہ کی تعلیم سے انکار تھا، لیکن اس کی قائم مقام کوئی اور چیز نہیں رکھی گئی تھی۔ اب یہ جگہ فزیکل سائنس سے معمور کی گئی ہے، جس کے لئے پہلے صف اولین میں ممتاز گنجائش نکالی گئی تھی۔

یہ اصلا میں اصولی و عمومی حیثیت سے یورپ میں تسلیم کر لی گئی ہیں، اور اب ایک مدت سے یورپ کے تمام اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں بھی اصول زیر عمل ہیں، اور انھیں کے وہ نتائج ہیں جو ”زپلین“ و ”مارکونی“ و ”بیکر“ و ”ڈگلسن“ کی صورتوں میں نمایاں ہو کر زمانہ کو مجبور کر رہے ہیں کہ ہر ایک قسم کی علمی و عملی ترقی میں یورپ کے قدموں پر سر جھکا دے۔ لیکن کیا ہندوستان میں بھی کوئی ایسا انتظام ہو

یا گورنمنٹ کی مہربانی سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستانیوں کے قوائے عقلیہ آراستہ و مہذب بن جائیں، طواغیر میں اعمال، دراکہ کے لئے بھی کوئی گنجائش بچے؟ قوی زبان توڈ لڑ بچہ، اور قوم کی تاریخ سے بنائے قومیت استوار ہو سکے؟

اسلام نے مسلمانوں کو ہمیشہ ظاہر فریبیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے، جس قوم پر ہر جانب سے افلاس محیط ہوا جسے تعلیم کے ناکام نتائج دیکھتے دیکھتے ایک زمانہ گزر گیا ہو، جس کے لئے عموماً ان مقدمات و مبادی کو نمودنایا گیا ہو جن سے اس کی بے خبری میں اضافہ، اور تنزل میں زرقی ہوتی ہو، ایسی قوم کا علاج طبی و دوسری دواؤں سے ممکن نہیں۔ گورنمنٹ کے حسن انتظامات کا بے شبہ قوم کو شکر گزار ہونا چاہیے لیکن اگر یہ تعلیمی منشور انھیں حالتوں میں نافذ العمل ہو گیا اور اصلی و اساسی دقیقہ سنبھال برقرار رہیں تو مسلمانوں کو مصاف کہہ دینا چاہیئے کہ یہ نام نہاد اجزائے اصلاح ان کے درد کی دوا نہیں ہیں۔ ان سے کسی دوسری جماعت کو خوش کرنے میں مدد یعنی چاہیئے۔

ما بجا ہے کہ زہم ماند، قناعت کر دیم
 بہ سکندر بہ ہیبت خیمہ زار را ماندا

ندوة العلماء

ندوة العلماء رجب قايم ہوا تو ہر طرح کے علما کا ایک وسیع مجمع اور
 درمیان ریاست دینی کا ایک سب سے بڑا عرش جلال نظر آتا تھا۔ مگر
 دراصل اس کی حقیقت سمجھنے والے معدودے چند اشخاص تھے، اور وہی
 اس تماشگاہ کا اصلی گوشہٴ عمل تھا۔ اکثروں نے اسے ایک دارالوعلما سمجھا
 بہتوں نے اپنی اظہار مولویت کے لئے اسے نمائش گاہ قرار دیا، بہتوں نے
 دیکھا کہ مدتوں کے بعد اربابِ عمامہ کی مقبولیت و ریاست کا ایک میدان
 کھلا ہے، استقبال و شائعت کے جھوم ہیں، اور دعوتوں اور سفر خرچ
 کے منی آرڈروں کا وسیلہ، پس وہ اس کی جانب دوڑے۔ لیکن اس
 سفر بے مقصد میں دیرین آدمی ایسے بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ ہمارا مقصد کیا

ہے اور اس مجمع سے کیونکر کام لینا چاہئے؟

ابتدائیں اجتماع علماء، رفع نزاع باہمی، اشاعت اسلام، تائیس دارالافتاء وغیرہ وغیرہ بہت سے مقاصد ندوہ کے قرار دئے گئے لیکن ارباب فکر نے دیکھا کہ یہ سب بے سود ہے۔ اصلاح و عمل کے نام ارادے یہاں آکر رک جاتے ہیں کہ وہ آدمی نہیں جو ان کاموں کو انجام دیں۔ پس اولین کاریہ ہونا چاہئے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے۔

یہ ضرور ہے کہ اصلاح نصاب کا مسئلہ ابتداء سے مقاصد میں رکھا گیا تھا، لیکن صرف سالانہ جلسے ہوتے تھے اور لوگ اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ کوئی مقصد عملی سامنے نہ تھا۔

چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم کا ایک لاکھ روپے متب کیا: اور مولانا محمد علی صاحب کو جو ندوہ کے ابتداء سے ناظم تھے، دے دی کہ اپنی جانب سے چھاپ کر شائع کر دیں۔ اس کے بعد میرٹھ میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں تجویز دارالعلوم پر تقریریں ہوئیں، اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہر طرف سے صدارت اعانت بلند ہوئی۔

اس کے دو برس بعد لکھنؤ میں دارالعلوم قائم ہو گیا اور تعلیم شروع ہوئی۔

مقامی گورنمنٹ کی بدگمانی

خدمت انسانی کا کوئی کام آزمائش سے خالی نہیں ہوتا، اور مجھے یقین ہے کہ جس طرح دنیا میں ہر شے کے لئے خدا کا ایک نظام قانون ہے بالکل اسی طرح ایک قانون ابتداء امتحان بھی ہے۔ وَ تَبْلُوَنَّكُمْ

حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ وَنُنَبِّئُ الْآخِلَاءَ كَمَا

اب تک مذہب شرکارکار کے لئے ایک بے غل و غش مادہ لہذا مذہب اور سفرہ نعام تھا، لیکن اب یکا یک اس کی زندگی کی پہلی اور سب سے بڑی آزمائش شروع ہو گئی۔ بعض اسباب (جن کی یہاں تفصیل مہجوط ہو گئی) ایسے پیش آئے کہ صوبے کی گورنمنٹ کو مذہب کی طرف سے خواہ مخواہ سیاسی بدگمانیاں پیدا ہو گئیں اور بعض لوگوں نے اس سورطن کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ اس وقت صوبے کا حاکم اعلیٰ سرانٹونی میکڈانل تھا جس کو مذہب کے وجود ہی سے بدگمانی تھی۔ اس کو خیال ہوا کہ علماء کا جمع ہونا اور مذہبی تحریک کی پکار ضرور کسی نہ کسی پوشیدہ منصوبے پر مبنی ہے۔ مولانا شبلی بھی اسی لئے ترکی گئے تھے، اور صرف اسی لئے مذہب مذہب پکارا جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے علانیہ مولانا کی نگرانی کا پولیس کو حکم دیدیا اور متنبہ اشخاص میں ان کا نام لکھ لیا گیا!

بد قسمتی سے ایسا ہی خیال مذہبی دعوت کی نسبت آج کل بھی بعض حکام کا ہے۔

وہ اس خیال پر کچھ اس طرح جم گیا کہ اس کا دفتیر بجال ہو گیا۔ اس کی نظر بدلتی ہی تھی کہ یکا یک مذہب کا عروج مٹل میں آ گیا۔ بربادی و تباہی کے تمام سامان ایک ایک کر کے فراہم ہو گئے جس قدر امرار و ارباب دول مذہب کے ساتھ تھے اور دارالعلوم کے لئے روپیہ دینا چاہتے تھے ان کے لئے صرف اس قدر علم ہی کافی تھا کہ صوبے کا حاکم اعلیٰ مذہب کو اچھا نہیں سمجھتا

انہوں نے معائنہ کاروتبر شروع کر دیا۔

اس کے بعد شرکار ندوہ اور عہدہ داران جمعیتہ کی باری آئی
فی الحقیقت یہی وقت اصلی آزمائش کا تھا، مگر جلاوہ لوگ جنہوں نے
ندوہ کو ایک منزل عیش سمجھ کر اپنے اپنے خیمے گاڑ دیے تھے، اس طرح
کانٹوں سے بھرا دیکھ کر کب جہنم والے تھے؟ منشی اطہر علی مرحوم نے ندوہ
کو خراب کیا تھا۔ ندوہ کے تعلق نے انہیں برباد کیا۔ وہ حیدر آباد چلے
جانے پر مجبور ہوئے۔ مولانا محمد علی جج کے لئے چلے گئے، اور ہر نظامت
سے استعفا دے دیا۔ اب نہ رہے جلسوں کے واعظ تھے، نہ مجالس کی
صدائے کرام کے خواستگار۔ وہ غلطی جنہوں نے تمام ہندوستان کو یکسر
اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا، ایک در سال کے اندر ہی انہیں اس طرح بیٹھ گئے
گرا کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ندوہ، ندوہ کا
وجود، اس کی مجالس، اس کا نام، اس کا مدرسہ، ایک از یاد رفتہ خراب
بن کر لوگوں کے ذہنوں سے فراموش ہو گیا۔

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا

رونی گشتم و از طالع دکان رقم

ندوہ جب تک رجوع خلائق کا مرکز، جمع مال میں کامیاب، اور
ہنگامہ و نمائش کا وسیلہ تھا، اس وقت تک اس کا میدان دل فریب، اور
اس کی جیب پُر از زر تھی۔ پس وہ اپنی ایک صدائے سینکڑوں عالموں،
صوفیوں، واعظوں، اور خطیبوں کو اپنے علم کے نیچے جمع کر لیتا تھا، اور

اس کا دسترخوان جب بچھتا تھا تو بڑی بڑی تبرک صفیں اس کے سینہ دیا
 نظر آتی تھیں۔ پر اب وہ تنفس ہو گیا۔ اس کا گھر غربت کدہ اور اس کی جیب
 خالی ہو گئی۔ زمانے نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیریں اور اس سے صاحب
 سلامت رکھنے والوں کے لئے بحکم حکومت روک ٹوک ہونے لگی۔ ایسی
 حالت میں کسے پڑی تھی کہ اس کی طرف جھانک کر بھی دیکھتا۔ اور اس بیکس
 کے لئے اٹھتا جواب دینے سے عاجز تھا اور خود مچنتوں، ہمتوں، قربانوں
 اور صرف وقت و مال کا طالب تھا؟

دوسری نظامت

مولانا محمد علی کے مستغنی ہو جانے کے بعد ناظم کی تلاش ہوئی مگر
 اس وقت نہ تو مولوی خلیل الرحمن بہار پوری نے اپنے حق بالکھلافہ ہونے
 کا دعویٰ کیا اور نہ ان کے کسی دوسرے ہم مقصد نے۔ مولوی خلیل الرحمن صاحب
 ایک تاجر آدمی ہیں۔ دکاندار آدمی ہی اچھی طرح اس نکتے کو سمجھتا ہے کہ خرید و
 فروخت میں متاع کو قیمت سے زیادہ بہتر ہونا چاہیے۔ وہ نیپال کے
 جنگل میں جس اصول کو برتنے تھے اس کو بازار ندوہ کے لئے بھی استعمال
 کر سکتے تھے۔ پھر سب سے زیادہ یہ کہ اس وقت تک ندوہ کی نظامت
 کی اتنی کم قیمت بھی نہ ہوئی تھی کہ ہر دوکاندار بولی دینے کے لئے اٹھ کھڑا
 ہوتا۔ غرض کہ مولوی مسیح الزماں صاحب مرحوم شاہجہان پوری ندوہ کے
 ناظم قرار پائے۔
 یہ نظامت محض برائے نام تھی۔ مولوی صاحب مرحوم ان کا سر

آدمی نہ تھے، اور اصلی بیچ گورنمنٹ کے تعلق کا پڑا تھا۔ وہ خود شاہجہانپور میں رہتے تھے۔ دفتر بھی وہیں اٹھوا لیا اور جیوں توں کچھ زمانہ گزر گیا۔ مگر ندوہ کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ آمدنی کچھ نہ تھی۔ چندوں کا سلسلہ بالکل موقوف تھا، فنڈ کا وجود نہیں۔ انتخاص ناپید تھے

حیات بعد المات

مولانا شبلی نعمانی اس زمانے میں حیدرآباد میں تھے اور براہِ ارادہ کر رہے تھے کہ ندوہ کے لئے اپنا پورا وقت دے دیں۔ کلکتہ اور مدراس کے جلسوں میں اس کا اعلان بھی ہوا تھا۔ بالآخر سلسلہ میں مولانا شبلی نے آخری فیصلہ کر لیا اور حیدرآباد سے لکھنؤ چلے آئے تاکہ ندوہ کی از سر نو تحریک شروع کر دیں۔

اسی زمانے میں مولوی مسیح الزماں مرحوم نے استغفار دے دیا اور وہ بظاہر یہ بتلائی کہ وہ لکھنؤ میں قیام نہیں کر سکتے۔ آئندہ کے لئے طریق عمل یہ طے پایا کہ کسی دوسرے شخص کو اب ناظم بنانے کی ضرورت نہیں اور نہ یہ مسئلہ اس وقت حل ہو سکتا ہے۔ کاموں کو تقسیم کر دینا چاہیئے ناظم کی جگہ تین مختلف صیغوں کے علیحدہ علیحدہ سکرٹری مقرر ہوں جو اپنے اپنے صیغہ کا کام کریں۔

اس بنا پر جلسہ انتظامیہ منعقدہ ماہ صفر ۱۳۳۷ھ نے طے کیا کہ مندرجہ ذیل اصحاب سکرٹری مقرر ہوں۔

صیغہ تعلیم و دارالعلوم کے لئے : مولانا شبلی نعمانی

صیفہ مراسلات مولانا عبدالحی

مال منشی اعتشام علی

یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اس جلسے سے پہلے بھی دارالعلوم کے معتمد (سیکرٹری) تھے۔ مولوی مسیح الزماں مرحوم کی نظامت کے زمانے میں (۱۶ مارچ ۱۹۰۶ء کو) شاہجہانپور میں مجلس انتظامیہ کا ایک اجلاس ہوا تھا جس میں مولانا محمد علی نانظم اول، مولانا عبدالحی مددگار نانظم، اور خود مولوی مسیح الزماں مرحوم بھی شریک تھے۔ اسی جلسے میں قرار پایا کہ مولانا شبلی دارالعلوم کے معتمد منتخب ہوں پس گویا اس جلسے نے سابق کی قرار داد کو برقرار رکھا اور دوسرے صیفوں کے لئے بھی معتمد منتخب کر لئے۔

اس کے بعد مولانا شبلی نے دارالعلوم کے لئے کام شروع کیا اس وقت میں لکھنؤ میں موجود تھا۔ اس زمانے کے بہت سے حالات میرے ذاتی مشاہدات ہیں نہ کہ سماعیات و روایات۔

دارالعلوم ۱۹۰۶ء میں

ایک سہ سہی نظر اس حالت پر ڈال لینی چاہئے جو ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم کی تھی جب کہ مولانا شبلی کی معتمدی شروع ہوئی۔

دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریض جاں بلب کے بستر کو دیکھو، یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو۔ اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر برانی دہلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو جن کی بہت

سی دیواریں گر چکی ہیں، اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عنقریب گرنے والا ہے
 افلاس و فقر بے نوائی و شکستہ حالی، کس پیری و محتاجی، خراب
 کار اور بربادی محنت کا رنگ ویرانہ تھا جس کے اندر نہابی و ہلاکت کے
 آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ ایک ظاہری صورت ضرور قائم تھی۔ مدرسہ تھا
 مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو روپیہ تھا جس سے تمام کام زندہ
 رہتے ہیں، اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی جو بہت سے مادی نقصانوں کی
 بھی تلافی کر دیا کرتی ہے۔

مالی حالت

ندوہ کے حیات بعد المات اور عروج بعد از زوال گئے لئے پہلا
 کام یہ تھا کہ اس کی مالی حالت درست کی جائے۔ اس واقعہ کی حقیقت
 کو کوئی فتنہ نہیں دبا سکتا کہ جب مولانا شبلی نے دارالعلوم کی معتمدی اپنے
 ہاتھ میں لی ہے تو منشی محمد علی محرم دفر نے کہا کہ تحویل بالکل خالی ہے۔
 ریاست حیدر آباد سے سو روپے ندوہ کی منت تھے اور چیس روپے
 بعض دیگر ذرائع سے آتا تھا۔ یہی سو سو روپے دارالعلوم کا مایہ حیات
 تھا اور "لا یزید ولا ینقص" ہو کر رہ گیا تھا۔

خرچ بالکل دو گنا تھا یعنی ڈھائی سو روپیہ۔ باقی کمی چندوں سے
 پوری کی جاتی تھی مگر ان کا بھی یہ حال تھا کہ کبھی روزی اور کبھی روزہ
 امانت کرنے والوں میں امرا گورنمنٹ کے زیر اثر اور گورنمنٹ
 مخالف۔ عام و متوسلین ندوہ کے طرف سے افسردہ دنا امید۔ پس

فراہمی زر کا کام نہایت ہی مشکل ہو گیا تھا۔ تاہم مولانا ہسلی نے مختلف طریقوں میں سعی شروع کر دی۔ سب سے پہلے موجودہ اسلامی ہند کے اولین مبداء فیضان یعنی ریاست بھوپال کا سفر کیا اور پچاس روپیہ ماہوار رقم مقرر ہو گئی اس سے عام ہلک میں ایک نئی قصبہ پیدا ہو گئی اور لوگ یکشت رہیں بھی بیچنے لگے۔ اخبارات میں بھی اب ندوہ کے کاموں کا تذکرہ کیا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی کوشش کی گئی کہ گورنمنٹ کے سوزن کو دور کیا جائے اور اس کے لئے مقامی حکومت سے بھی بالاتر مقامات کو توجہ دلائی گئی۔ بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ سر جان ہیوٹ نے مولانا ہسلی سے پوچھا کہ وہ گورنمنٹ سے کتنی مدد لینا چاہتے ہیں؟ انھوں نے زمین اور غیر دینی تعلیم کے لئے معقول ایڈ کی درخواست کی۔ ڈائریکٹر نے ہم حالات تحقیق کر کے بادداشت پیش کی بالآخر پانچ سو روپے ماہوار ایڈ مع ایک وسیع و بہترین قطعہ زمین کے دیا گیا۔

پھر اسی ندوہ کے دارالعلوم کی تائیس کا جس کو بنیاد کی تحریک سمجھا جاتا تھا، ایک عظیم الشان جلسہ ہوا اور لفٹننٹ گورنر نے بنیادی ہتھ رکھا۔

اس اثنا میں ریاست رامپور سے بھی مولانا خط و کتابت کر رہے تھے۔ ہنز بانس فواب صاحب نے اعانت کا وعدہ کیا اور شاہد جھ سورویہ سالانہ وہاں سے بھی مقرر ہو گیا یا کم و بیش۔ ٹھیک رقم

یاد نہیں تعمیرات

لیکن سب سے بڑا اہم سوال دارالعلوم کی تعمیر کا تھا۔ اب تک مدرسہ جس عمارت میں تھا اسے ابتدا سے عارضی سمجھا گیا تھا اور کسی طرح بھی مدرسہ کے لئے کافی نہ تھا۔ نئی عمارت کے لئے سب سے پہلے زمین اور پھر اقلًا ایک لاکھ روپیہ مطلوب تھا۔

مولانا نے تعمیر دارالعلوم کے لئے ایک اپیل شائع کی اور مدرسہ کی تعمیر کے لئے پچاس ہزار روپے کا ابتدائی اندازہ کیا۔ یہ اپیل ریاست بھاول پور کے خاندان شاہی تک پہنچی اور خدا تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی توفیق عطا فرمائی کہ پچاس ہزار روپے کے گرانقدر عطیے کا صرف بھاول پور ہی سے اعلان ہو گیا!

بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لئے یہ کارروائی کی گئی کہ آٹھ سو روپے کی لاگت کا ایک ایک کمرہ قرار دیا گیا جو اپنے معطلی کے نام پر تعمیر ہوگا۔ اس اعلان نے اکثر ارباب خیر کو توجہ دلائی اور روپیہ جمع ہونے لگا (اگرچہ وہ تمام روپیہ خلاف نیت عطا کنندگان دوسرے کاموں میں صرف کیا گیا)

اس طرح مالی مشکلات کی منزل سے ندوہ بہ کمال کامیابی و ترقی گزر گیا۔ مولانا بسلی نے جب اس کو لیا تھا تو سوا سو روپیہ ماہوار آمدنی تھی اور خزانہ بالکل خالی۔ لیکن اب ایک ہزار روپیہ تک ماہوار آمدنی پہنچ

گئی اور دارالعلوم اور بورڈنگ کی عمارت کے لئے ستر اسی ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔

اعلان حیات و غفلہ کار
ایک شخص جو مر گیا ہے، لوگ کبھی اسے زندہ نہیں سمجھیں گے اگر وہ بستر پر چند کروٹیں لے کر اپنی زندگی کا ثبوت دینا چاہے گا۔ کیونکہ دنیا اس کی طرف سے مایوسی کا فیصلہ کر چکی ہے، اور یہ فیصلہ جب ہی ٹوٹ سکتا ہے جب کہ وہ اٹھ کر اس طرح دوڑنے لگے کہ لوگ زندہ مان لینے کے لئے مجبور ہو جائیں۔

یہی حال کاموں اور تحریکوں کا ہے۔ جماعت کی توجہ میں کبھی بھی کوئی ترتیب صحیح یا عقلی باقاعدگی نہیں ہوتی۔ وہ جب کسی کام کی طرف سے مایوس ہو جاتی ہے تو پھر دوبارہ امید کا پیدا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے مولانا شبلی نے مذہد کے لئے سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ جس چیز کو لوگ بھلا چکے تھے، اسے پھر ان کے سامنے کر دیا، اور جس کے لئے مایوسی کا فیصلہ ہو گیا تھا، اس کے لئے امیدیں مر کر پھر زندہ ہو گئیں۔

ایسا ہونے کے لئے نہ صرف ایک ہی شاخ عمل کافی نہیں ہے بلکہ مسلسل اور غیر منقطع کاموں کا ایک پورا سلسلہ چاہیے۔ دارالعلوم مذہد کے متعلق جو کچھ ہوا، وہ اس قسم کے کاموں کے لئے ایک عمدہ تجربہ ہے۔ مذہدۃ العلیٰ کے سالانہ اجلاس، مدراس کے جلسہ کے بعد بالکل

موقوف ہو گئے تھے، کیونکہ نہ تو کام کرنے والے تھے اور نہ لوگوں ہی کو
 کسی قسم کی دلچسپی باقی رہی تھی۔

مولانا فیصلی نے کوشش کی کہ سالانہ جلسوں کا سلسلہ پھر
 شروع ہو۔

سب سے پہلے بنارس میں اس کی تحریک کی گئی اور برسوں
 کے بعد ندوۃ العلماء کے انعقاد کا نفلہ ہوا۔ پھر دوسرا جلسہ لکھنؤ میں ہوا
 یسرا دہلی میں اور پانچواں دارالعلوم ندوہ کی نئی عمارت میں جس کی
 صدارت کے لئے سید رشید رضا مصر سے آئے، گو علماء ندوہ نے
 کہا کہ ہمیں ان کی قابلیت معلوم نہیں۔

دارالعلوم کے سنگ بنیاد نصب کرنے کا جلسہ بھی اسی سلسلے
 میں شامل ہے۔

ان جلسوں سے ملک میں ندوہ کی صدائیں دوبارہ بلند
 ہو گئیں اور اس کے متعلق عرصے کی خاموشی سے جو افسردگی پھیل
 چکی تھی دور ہو گئی۔

خلیسی حالت
 ندوہ کے متعلق تمام مباحث کا خلاصہ یہی عنوان ہے۔ اس کی
 عظمت کسی عمارت سے وابستہ نہیں، اور نہ بہت سارے پیسے مل جانا
 ہی کو قابل قدر بنادے سکتا ہے۔ ہنسٹے یہ سب کہ جس قسم کی خیریں
 از تعلیم کے ذریعہ وہ ایک خاص جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور جس

بنا پر میں اسے "اصلاح دینی" کی سب سے بڑی تحریک سمجھتا ہوں
اس کے لئے کیا ہوا اور کس قدر کام کیا گیا؟

اس سلسلہ کے کسی گزشتہ نمبر میں لکھ چکا ہوں کہ اصلاح تعلیم کے
بارے میں بعض خاص رائیں رکھتا ہوں اور میں نے ابتدا سے ندوہ پر
صرف اس حیثیت سے نظر ڈالنا شروع کی ہے کہ گزشتہ قرون و تغیرات
اصلاح میں جس قدر تحریکیں عالم اسلامی میں پیدا ہوئیں ان سب میں ندوہ
کا کیا درجہ ہے۔ اور جو راہ اس نے اختیار کی ہے وہ اصولاً اصلاح کے
کس قسم میں داخل ہے؟ پس یہاں بھی اپنی خاص آراء کی بنا پر بحث نہ
چھیڑوں گا بلکہ صرف اس بنا پر کہ ندوہ نے جو تعلیمی اہول قائم کیا، اس کے
مطابق اس کے اندر کیا کیا کچھ ہوا اور وہ کس نے کیا؟

آخری سوال کا ایک ہی جواب یہ ہے کہ مولانا شبلی نے کیا کیا
واقعہ کو کیسے جھٹلایا جائے اور حقیقت سے کیونکر انکار کیا جائے؟

وہ جب دارالعلوم میں آئے تو اس کی بربادیاں صرف مادی
اور مادی حیثیت ہی سے نہ تھیں، بلکہ سب سے زیادہ مصیبت انیسویں
میں یہ تھی کہ وہ اپنی تعلیم و اہول تعلیم کی مصنوعی روح سے بھی یکسر محروم
تھا، اور باوجود اعمار اصلاح نصاب و غلغلہ تجدید تعلیم، اس کی حالت
ان مدارس پر کچھ بھی مزیت نہیں رکھتی تھی جو زیادہ وسیع پیمانے پر
ملک میں پیشتر سے موجود ہیں، اور اس سے زیادہ وسیع جماعت
تعلیم دے رہے ہیں۔

مدوۃ العلام نے اپنے تعلیمی کاموں کے لئے اصولاً تین نئی
 صلاحوں کا دعویٰ کیا تھا۔

(۱) موجود طریق مدارس و حسن تقسیم و نظم و ادارہ کے ساتھ ایک
 مدرسہ عربیہ قائم کرنا۔

(۲) درس نظامیہ جو آج کل تمام مدارس ہند میں علوم عربیہ کا نصاب تعلیم
 ہے، اس کی اصلاح کرنا اور ایک نیا مکمل نصاب داخل کرنا، جو مقننات
 عصریہ اور احتیاجات حالیہ کے مطابق، علوم اسلامیہ صحیحہ پر مادی، غیر
 ضروری کتابوں اور قدیم طریق حواشی و شروح سے پاک، اور علوم شرعیہ
 میں باحسن بیج و باکل طرق رسوخ و کمال پیدا کرنے والا ہو۔

(۳) بعض علوم عصریہ کی شمولیت اور انگریزی زبان کی تعلیم تاکہ
 انگریزی داں علماء پیدا ہو سکیں۔

لیکن اس وقت تک ان تینوں چیزوں میں سے ایک شے
 بھی دارالعلوم میں نہ تھی۔ اول تو بنیاداً سب سے دو تین سال تک داخل مدرسہ
 پہنچ نہ سکا۔ پھر انگریزی زبان کی تعلیم کی مخالفت کی گئی۔ اس کے بعد
 بشکل گوارہ کیا لہجی تو اس طرح کہ صرف پندرہ روپیہ تنخواہ کا ایک
 مدرس انگریزی کے لئے رکھا گیا جس سے دو چار لڑکوں نے اے
 ٹی۔ سی شروع کر دی۔ فن ادب کی باطنی و جدید تعلیم بالکل نہ تھی۔
 مضمون نگاری اور تقریر و خطابت کا کوئی سامان نہ تھا۔ طلباء میں بہت
 سی ذہین طبیعتیں موجود تھیں لیکن برباد یا بے تھیں۔ یہ تمام باتیں انھیں خاص پر

موقوف ہیں۔ دارالعلوم میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان باتوں کو محسوس کرے۔ کرنا اور کرنے کی قابلیت تو بڑی چیز ہے۔

ادب و تفسیر

مولانا شبلی نے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلا اور اس نصاب کی تعلیم شروع کی جو مدراس کے اجلاس میں منظور ہوا تھا۔ فن ادب ہماری قدیم تعلیم کی حقیقی روح ہے، اور قرآن و حدیث کے خزائن و علوم اسی کے اندر مدفون ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ابتدا سے یہ فن بھور رہا اور درس نظامیہ کو تو گویا اس سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ مولانا نے فن ادب کے لئے خاص طور پر کوشش کی اور صحت تعلیم فن، حصول مناسبت تمام، و درس کتب قدما ربیان و بلاغت کے ساتھ صحیح و فصیح عربی میں تقریر و تحریر کا بھی طلباء کے لئے سامان کیا۔ یہ فی الحقیقت ہندوستان کے تمام مدارس عربیہ کے تعلیم ادب میں سب سے پہلی بدعت حسنہ تھی چنانچہ چند سالوں کے اندر ہی اس کے نتائج ظاہر ہوئے متعدد متعلمین زندہ کو عربی میں تقریر و تحریر کی ایسی قابلیت پیدا ہو گئی کہ انھوں سالانہ مجامع میں فی البدیہہ و برجستہ عربی میں تقریریں کیں!

اس بوالہبی پر ہمیشہ اتم کیا جائے گا کہ تمام علوم اسلامیہ کے درجہ تدریس کا اصل مقصود قرآن تھا، اور سب کے سب اس کے لئے بمنزلہ آلات و وسائل کے تھے، مگر اجرام سماویہ کا مطالعہ کرنے والا دورِ ہمارے بنانے میں ایسا غرق ہو گیا کہ اسے آسمان کے طرف نظر اٹھانے کا

مہلت ہی نہ ملی! یعنی معقولات اور فلسفہ کلام اصل مقصود بن گئے، اور قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔ پھر یہ حالت یہاں تک بڑھی کہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ہمارے مدارس کا اصل مقصود کیا ہے؟ ارسطو اور اس کے بہت دور کے کچھ فہم ترجانوں کی پرستش، یا قرآن حکیم و حدیث نبوی کا فہم و درس؟

بعض حایان نصاب قدیم یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہمارا مقصود بر علم و فن میں بذریعہ مختصرات و مطولات قوم اس درجہ مناسبت پیدا کر دینا ہے کہ شعلہ آگ سے جل کر خود اپنے درس و مطالعہ کے لئے راہ پیدا کر لے۔

یہ سچ ہے۔ دنیا کی ہر زبان کا نصاب تعلیم ہی مقصد رکھتا ہے۔ کچھ آپ ہی کا مقصود نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہی مقصود تھا تو اس کی کیا علت ہے کہ معقولات قدیم کے لئے تو متون و شرح کے بوجھ سے دماغوں کو کھل ڈالا جاتا ہے مگر قرآن و علوم قرآن کے لئے صرف جلا میں و بیضاً وی کے چند اجزائی کافی سمجھ لئے گئے ہیں؟ اور پھر کیا ان کتابوں کے ذریعہ قرآن اور علوم و معارف قرآن سے کوئی حقیقی مناسبت پیدا ہو سکتی ہے؟

بہر حال دارالعلوم ندوہ میں فن ادب کی اصلاح کے بعد سب سے زیادہ زور و زلف تفسیر پر دیا گیا۔ طریق تعلیم میں امارت لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا، قرآن کریم کے مطالب کے مختلف حصے کر کے ہر حصہ پر مستقل

درس دینے کی کوشش کی، اور گرسب سے بڑی لاعلاج مصیبت
اشخاص و معلمین کے فقدان کی تھی، تاہم بہت سی مشکلوں سے راہ
صاف ہوئی اور تفصیل مفصل صحبتوں کی محتاج ہے۔

درجہ تکمیل

علوم اسلامیہ کی موجودہ تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ فن تعلیم
کے ان عمدہ اصولوں سے جو آج انسانی دماغ کی محنتی قوتوں کو ابھار
رہے، اور قدرتی قابلیتوں کی نشوونما کر رہے ہیں، اسے کوئی مناسبت
نہیں۔ تعلیم کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ سب سے پہلے طلبا کو تمام
ضروری علوم سے بقدر ضرورت آشنا کیا جائے، اور گویا اس طرح
ان کے دماغ کے آگے علم و فن کی تمام جنس و متاع رکھ دی جائے۔
پھر دیکھے کہ قدرتی طور پر کس طالب علم کو کس چیز سے ذوق خاص ہے؟
اور کون دماغ کس شلخ علم کے لئے اپنے اندر مناسبت طبعی رکھتا ہے
جس علم سے جس معلم کو ذوق خاص ہو، اسی کی تکمیل کا اس کے لئے سامان
کرے۔ کیونکہ ہر دماغ قدرتا ایک ہی فن کے لئے مستعد ہوتا ہے
اور ایسے افراد غالباً خال ہوتے ہیں جو متعدد علوم سے یکساں ذوق
رکھتے ہوں۔

یہ میں کچھ اسپنسر کی ایجوکیشن سے نقل نہیں کر رہا ہوں، بلکہ

پانچویں صدی میں امام غزالی نے بھی یہی لکھا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں تکمیل فن خاص کا مفہوم مفقود ہے۔ طالب علم

خود اپنی مناسبت سے کسی فن میں رسوخ خاص حاصل کر لے لیکن مدرسہ اس بارے میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم میں علمائے فن یکسر ناپید ہو گئے ہیں۔

مولانا فاضل نے اس نقص کو دور کیا اور دارالعلوم میں ایم اے کا درجہ ”درجہ تکمیل“ کے نام سے کھولا گیا تاکہ فراغت کے بعد طلباء اپنے ذوق و مناسبت کو دیکھیں اور ادب، تفسیر، حدیث، علوم جدیدہ، زبان انگریزی جس فن کو چاہیں، دو سال تک صرف اسی کو حاصل کریں علوم عصریہ و زبان انگریزی

ندوہ نے اپنی خصوصیات تعلیم میں ایک بڑی چیز یہ بتلائی کہ وہ علوم عصریہ و السنہ و فنگ کی تعلیم، علوم اسلامیہ کے ساتھ شامل کرے گا تاکہ اسلام و اہل اسلام کی موجودہ داعیات و ضروریات کے لئے علماء جامع ذوالیمین پیدا ہوں۔

پنبہ را آشتی اینجا به شرار افتادست!

لیکن اس راہ کی دقتیں بھی کم نہ تھیں۔ انگریزی زبان کی تعلیم کا انتظام آسان تھا مگر عربی داں طلباء کے لئے علوم عصریہ کی تعلیم مشکل تھی۔ اول تو ہماری مشرقی زبانوں میں نئے علوم کی مستند کتب ناپید، پھر بعض تراجم عربیہ میں بھی تو ان کے پڑھانے والے کہاں سے لائے جائیں؟

تاہم اس شاخ میں بھی کوشش بالکل رائیگاں نہ گئی۔ انگریزی

تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس نے ادب انگریزی کی تعلیم کے لئے ایسا نصاب تجویز کیا جس کی تدریس کے بعد متعلم کو اتنی قابلیت حاصل ہو جائے، جتنی انٹرنس کے درجے تک یونیورسٹی کے طالب علموں کو ہو جاتی ہے۔ حساب، جغرافیہ، اقلیدس، اور ریاضی جن کو ہمارے علماء کے دربار علم میں بہت حقارت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور اس لئے بہت کم اہمیت وہاں تک باریابی ملتی ہے داخل تعلیم کئے گئے۔ دروس الاولیہ وغیرہ بیروت کے بعض تراجم کو باہر کے مخصوص اشخاص کے ذریعہ پڑھایا گیا اور اس طرح طلبائے دارالعلوم اک گونہ نے علوم سے بھی آشنا ہو گئے۔ کم از کم وحشت و بیگانگی نہ رہی۔

تصنیف و تالیف

مذکورہ نے جس اصلاح تعلیم کا دعو کیا تھا، اس کا ایک بہت بڑا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ وہ اپنی درس گاہ میں ایسے وسائل و اسباب ہیا کرتا کہ اس کے تعلیم یافتہ گروہ سے مختلف علوم و فنون میں اہل قلم و مصنف پیدا ہوتے۔

تصنیف و تالیف کا مذاق بہت سی چیزوں کا طالب ہے تعلیم و طرز تعلیم کے بعد علمی صحبت و مجامع، مذاکرات و مباحثات علمیہ مطالعہ و نظر، منطق و مزاہلت اور سب سے زیادہ کسی مصنف کے زیر نظر کام کرنے سے قدرتی قابلیتوں کو تربیت یسر آتی ہے، قدیم

مدارس میں اس کا سامان ناپید ہے۔ خود مدرسین ہی کو ذوق نہیں تاہم دیگران چہ رسد؟ وسعت مطالعہ و نظر کا جب سامان ہی نہ ہو تو دماغ میں استعداد افزا و ترتیب و بحث کیونکر کام دے؟ اسی کا نتیجہ ہے کہ صد ہا متحرر چین مدارس عربیہ میں دوچار صاحب نظر مصنف بھی نظر نہیں آتے۔

دارالعلوم ندوہ کی ہر چیز محض ابتدائی۔ نیز وہ ایک انقلابی سعی تھی جو نئے ساز و سامان سے نئے نتائج پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے ابتدائی تجربوں سے نتائج کا مل کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم بلا خوف تغلیط کہا جاسکتا ہے کہ آٹھ دس برس کے تعلیمی دور سے جو نتائج اس بارے میں بھی اس نے پیدا کئے، وہ بہت حد تک تعجب انگیز اور نہایت قیمتی ہیں!

مولانا شبلی کے مذاق علم و تصنیف و تالیف نے قدرتی طور پر اس کا سامان ہیا کر دیا۔ ایک مصنف کا وجود خود مدرسہ فن تصنیف ہوتا ہے۔ خاص خاص طلباء جن کے اندر اس کام سے مناسبت موجود تھی مختلف عنوانوں سے تصنیف و تالیف اور انشائے رسائل کے کاموں پر لگائے گئے، اور فکر و مطالعہ کی راہیں ان کے سامنے کھل گئیں۔ چنانچہ متحرر چین ندوہ میں سے کسی اہل قلم و مصنف پیدا ہوئے جو مختلف جہتوں سے آج کل کی اہل قلم جماعت میں امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ بہترین مدارس جدیدہ بھی ان کے سے نمونے پیدا نہیں کر سکے ہیں۔

بھاشا اور سنسکرت

مذہب کا اولین مقصد اشاعت اسلام تھا۔ دارالعلوم اسی لئے
 قدیم ہوا کہ اس کے لئے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ آج کل آریہ سماج
 کے نئے مذہبی حلقوں نے مسلمانان ہند کے سامنے ایک نیا حریف پیدا
 کر دیا ہے۔ ان سے مباحثہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے علوم و
 الہیات سے واقفیت ہو۔

مولانا شبلی نے جانا کہ دارالعلوم میں ایک کلاس اس کے لئے
 بھی کھول دی جائے تاکہ کچھ طلباء ابھی سے اس کے لئے تیار ہونے لگیں
 چنانچہ ایک پنڈت خاص اسی غرض سے ملازم رکھا گیا اور چند طلباء
 نے باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ غرض تک یہ سلسلہ قائم تھا۔ مجھے معلوم
 نہیں پھر قائم رہا یا نہیں۔
 جماعت خدام اسلام

اس سے بھی اہم تر اور نتائج کے لحاظ سے اعظم ترین خیال جو
 ہوا وہ یہ تھا کہ طلبائے دارالعلوم میں سے کم سن بچوں کی ایک جماعت
 عام طلباء سے الگ کر لی جائے۔ ان کا قیام علیحدہ ہو، ان کی تربیت
 خاص طور پر کی جائے، ان کے طرز معیشت میں فقر و محنت کا زیادہ
 خیال رہے۔ ایک خاص شخص اس طرح ان کی نگرانی کرے کہ ہر وقت
 انہیں کے ساتھ رہے اور شب و روز کسی وقت بھی ان سے علیحدہ
 نہ ہو تاکہ اس گروہ سے جفاکش، ایذا دوست، مذہب پرست اور

اشاعت اسلام و اصلاح ملت کے کاموں میں اپنے تئیں فدا کرینے والے طلباء رنیا رہ سکیں۔

یہ خیال جس آسانی سے ذہنوں میں آجاتا ہے، اس قدر اس کا کرنا آسان نہیں ہے، اور اس کے لئے جو سامان مطلوب ہیں وہ خاص اور بہت کم یاب ہیں۔ تاہم مولانا فیلی نے حتی الامکان اس کی ایک ابتدائی بنیاد سی ڈال دینی چاہی اور کم سن طلباء میں سے ایسے لوگوں کو حرم و احتیاط کے ساتھ جن بابا جنوں نے اس راہ کی تکمیل سننے کے بعد خود ہی ان کے جھیلنے کی خواہش کی، اور جن میں ذہانت و سرافت کے علاوہ اور جوہر بھی اوروں سے زیادہ نظر آئے۔

ان کے قیام کا انتظام مخصوص کیا گیا۔ مدرسین دارالعلوم میں سے ایک معتد ترین بزرگ کو ان کی نگرانی سپرد کی۔ تقریر و بحث کی مشق کرائی جانے لگی۔ جھوٹے جھوٹے بچے جن کی عمریں بارہ تیرہ برس سے کسی طرح زاید نہ ہوئی، برجستہ اور رواں و مربوط تقریر کرنے لگے۔ مذہبی اعمال کی پابندی میں بھی ان کی سختی بہت زیادہ رکھی گئی۔ پانچ وقت مسجد میں وہ اولین صف کے نمازی تھے۔

میں نے یہ حالات بارہا خود دیکھے اور جب کبھی لکھتا ہوں ان میں سے کسی نہ کسی لڑکے کی نسبت اچھی رائے قائم کرنے کے مواقع ہاتھ آئے

یہ ایک صحیح اصول پر مبنی ابتدا تھی لیکن اس کے لئے بہت سے

تایاب اجزاء عمل مطلوب ہیں

خلاصہ مطالب

یہ ایک اجمالی نظر تھی ان واقعات پر جو ششہ سے کہ ندوہ کی نئی حیات عمل کا آغاز ہے، گزشتہ سال تک ظہور میں آئے اور یہی اس کی حیات بعد المات اور عروج بعد از زوال کی سرگزشت ہے۔ اس مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے گزشتہ کاموں کی نسبت لوگوں کو ایک مکمل و مرتب معلومات حاصل ہو جائے اور وہ اندازہ کر سکیں کہ کس قدر کام ہو چکا ہے؟ یہی سبب ہے کہ موجودہ حالات کے نقائص کا تفصیلی بیان میں نے ملوثی کر دیا تھا اور چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ندوہ کی غرض تائیس اور گزشتہ کاموں کی مقدار بیان کر دی جائے۔

ایک صحیح اور مکمل واقفیت کے بعد جو رائے قائم ہوتی ہے وہی صحیح رائے ہوتی ہے۔ ندوہ اب ایسی ہی رایوں کا محتاج ہے۔ دنیا عالم اسباب ہے اور کوئی فعل وجود میں آنے نہیں سکتا جب تک کہ اس کے تمام اسباب جمع نہ ہو جائیں۔ پس مولانا شبلی نے دارالعلوم کے لئے جو کچھ کیا، اس کی اصلی علت صرف انھیں کی کوششیں نہیں ہو سکتیں۔ یقیناً بہت سے اسباب و علل اس کے لئے فراہم ہوئے۔ لیکن اگر اس تفصیل کا مطلب یہ ہو کہ پیش نظر نتائج کو ان کی طرف منسوب نہ ہونا چاہئے تو یہ ایک ایسی سو فسطائیت ہوگی جس کے بعد دنیا میں کوئی نسبت فضل و کار جائز نہ ہو سکے گی!

دنیا جانتی ہے کہ میں مداح نہیں بلکہ معترض ہوں۔ الحمد للہ کہ میرے اعتراف و اقرار کی گردن میرے خداے قدوس نے بہت ہی متکبر بنائی ہے، اور مجھے انسانوں کے آگے جھکنے کا سبق نہیں ملا ہے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ میرے لئے انسانوں کی تعریف سے بڑھ کر کوئی بھی مکروہ و غیر مطبوع کام نہیں ہوتا۔ اگر میں ایسا کرنا چاہوں بھی تو خود میرا دل مجھے ملامت کرنے لگتا ہے، اور میرا ضمیر کچھ اس طرح خود بخود مجھوب ہو جاتا ہے گویا اس سے کوئی بڑا ہی شرمناک مجرم سرزد ہو رہا ہے

غیور و العظم عرفی نے میری زبانی کہا ہے۔

قصیدہ کارہوس ہشگاں بود عرفی

تواز وظیفہ عشقی وظیفات غزل ست

لیکن با این ہمہ میں پورے اطمینان اور کامل راحت ضمیر کے ساتھ مولانا شبلی کی ان خدمات کا اعتراف کرتا ہوں جو انھوں نے ندوۃ العلماء کے لئے انجام دیں اور تسلیم کرتا ہوں کہ ان کاموں میں ایک بڑا ہی قیمتی جوہر ایشیاٹکس کا تھا جو آج کل بہت کم یا بے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ندوہ جس غرض سے قائم ہوا، جس مقصد کا اس نے

اعلان کیا، جو مقصد وہ کھو رہا تھا جس کھوکے ہوئے کو اٹھانے والا اور گمنامی و فنا سے زندگی و شہرت میں لانے والا کوئی نہ تھا، اس کے لئے کس کا درجہ موجب سنجاح ہوا، اور کس نے اپنا وقت، اپنی

قابلیت، اپنا دماغ، صرف کر کے پورے ایشار کے ساتھ دارالعلوم ندوہ کو موت کے منہ سے نکالا، اور موجودہ حالت تک پہنچایا؟

صداقت کا اعتراف، اس کا قدرتی حق ہے، اور دماغ و عقل مجبور ہے کہ سفید کی سفیدی کا اقرار کرے۔ پس یہ کہنا بڑا تابے کہ یہ سب کچھ مولانا شبلی نے کیا، اور ان کے وجود سے ندوہ کی گزشتہ ہستی کو الگ کر کے دیکھے تو صرف گولا گنج لکھنؤ کا ایک ویرانہ باقی رہ جاتا ہے جس کے اندر تباہی و بربادی کی خاک اڑ رہی ہے!

مفسد و فتن

یہ تصویر کاروشن رُخ تھا۔ اب اس کے تاریک رخ پر نظر ڈالئے یہاں تک تو ان کاموں کی تفصیل بیان کی گئی جو ندوہ کی تکمیل کے لئے انجام پائے، مگر اب ان مفسد کی طرف متوجہ ہونا چاہئے جو ندوہ کی تخریب و ہلاکت کے لئے مختلف اسباب سے پیدا ہوئے اور جن کی اصلاح کے لئے مولانا شبلی نے اپنی پوری قوت صرف نہ کی۔ وہ خود بھی دیتے رہے اور باہر کے ان لوگوں کو بھی دباتے رہے جن کو اصلاح کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ ان کے سامنے فساد و فتن کا شجرہ ضیئہ نشوونما پارہا تھا اور آنے والے وقت کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔ ان کا فرض تھا کہ یا تو اس کا پورا استیصال کرتے اور اگر اشتعال فتنہ وطنیان کے خوف اور اپنے کاموں میں تنہا ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تھے، تو کم از کم قوم کو اس سے مطلع کر دیتے تاکہ ان کی ذمہ داری باقی نہ رہتی۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اس کام کے لئے قوم کا

نہایت قیمتی اینٹ جو نافراہم کرتے رہے، جس کی نسبت انھیں علم تھا کہ اس کی بنیاد ہی یکسر کھل ہے!

علاوہ ان اصولی مفاسد کے جو مذہب کو اس کی حقیقی روح ہی سے خالی کر دینے والے ہیں، اور بھی متفرق واقعات ایسے پیش آتے رہے جو دیانت و صداقت اور اصول و قواعد کے بالکل خلاف تھے۔ جلد۱ نظامیہ کی مجارٹی ان کو پسند کرنی اور مولانا شبلی مخالف کر کے پھر اپنی کمزوری سے خاموش رہ جاتے۔

یہ سچ ہے کہ مولانا شبلی نے مذہب کو بالکل بربادی کے عالم میں پایا اور وہ اسے رفتہ رفتہ درست کرنا چاہتے تھے۔ نیز اصلاح کا عنصر قلیل اور مادہ فساد و شرارت کثیر و وسیع تھا۔ تاہم یہ مفاسد ایسے تھے جن پر کسی طرح بھی چشم پوشی جائز نہیں ہو سکتی اور جب کہ خود اسی کام کے اندر یہ سب کچھ ہو رہا تھا جس کے وہ خود بھی ایک رکن رکن تھے، اور جس پر صرف انھیں کی وجہ سے قوم کو اعتقاد تھا تو ایسی حالت میں ان کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور وہ معاف فرمائیں اگر میں کہوں کہ ان پر باطل کی اعانت اور فساد پر سکوت کا الزام عائد ہوتا ہے۔ ہاں، یہ سچ ہے کہ وہ صرف دارالعلوم کے سیکرٹری تھے۔ ان کاموں میں شریک نہ تھے اور ان کو اندر ہی اندر روکنا بھی چاہتے تھے، مگر صحیح مسلم کی حدیث: "مَنْ رَىٰ مِثْقَالَ دُنْكَرٍ اَلْحَزَّ" کے آخری درجے کے اَلْحَزَّ لَمْ يَسْتَنْطِعْ بِقَلْبِهِ کا یہ موقع نہ تھا، اور وہ بھی اضعاف الایمان میں داخل ہے۔

روہ کا قانون اساسی
افساد و فتن کی پہلی تخم ریزی ندوہ کی بنیادی چٹان، یعنی دستورِ اہل
سے شروع ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرے سے ندوہ نے اپنا مقصد
ہی کھو دیا۔

ندوۃ العلماء اصلاح دینی کی ایک تحریک تھی جو علوم اسلامیہ کے
درسِ صبح کے ذریعہ قوم میں مرشدین و مصلحین کا ایک ایسا گروہ پیدا کرنا چاہتی
تھی جس کی تعلیم و مساعی سے ارشاد و دعوت دینے کا سلسلہ حتمہً قائم ہو کہ تمام
امراضِ ملت کا یہ ایک ہی علاج ہے۔

لیکن بیکٹی یہ تھی کہ یہ خیال معدودے چند اشخاص کا تھا جو ندوہ کے
بانی اور روحِ رواں تھے۔ باقی زیادہ تر ہجوم ان لوگوں کا تھا جو یا تو سرے سے
”اصلاح“ کے مخالف و منکر شدید تھے۔ یا ایک بھیڑ کھٹی ہوتی دیکھ کر خود بھی
شامل ہو گئے تھے مگر کچھ نہیں جانتے تھے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ کوئی سمجھا
کہ شہرت و نمائش کا وسیع ہے۔ کسی نے خیال کیا کہ اربابِ دستار کی مقبولیت
اور مرجِ خلافت بننے کا اچھا آکر ہے۔ کوئی آیا کہ اپنی وعظ طرزی اور ترانہ سنجی
کا اشتہار دے، اور کسی نے اس کے سفرہ ضیافت کے طول و عرض کو
ناپا اور بے اختیار ہو گیا۔

پس کچھ تو وہ لوگ جو اُسے بالکل نہ سمجھے، اور کچھ وہ جو اُسے
سمجھے ہوں یا نہ سمجھے ہوں مگر اعتقاداً ”مسئلہ اصلاح“ کے سخت مخالف و
بیزار تھے۔ مثلاً گھ کے حو درخت کی جڑ میں لگ گیا ہو، ابتدا سے

اس کے اندر ہے، اور جماعت مصلحین کی قلت و کمزوری اور زیادہ تر اس کے مرکز میں نہ رہنے کی وجہ سے متصل نشوونما پاتے رہے۔ ان کا مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ نذر وہ سے ”اصلاح“ کا عنصر نکال دیا جائے، اور جہاں تک ممکن ہو اپنی تنگ خیالی اور تعسف و جمود کے رنگ میں اسے رنگ دیا جائے۔ چنانچہ اس کو عمدہ فرصتیں ملیں اور سب سے پہلے نذر وہ کے قانون اساسی (کانٹنٹی ٹیوشن) میں متعدد اہولی تبدیلیاں کر دی گئیں جس کی وجہ سے قوم کی نیابت اور جمود کا اشتراک مفقود ہو گیا اور صرف چند آدمیوں کے ہاتھ میں سیاہ اور سفید کا اختیار آ گیا۔

اس کی پہلی بربادی کے بعد جب مولانا شبلی کھٹنویس آئے تو ان کے متعلق صرف دارالعلوم کی مستعدی کی گئی۔ نذر وہ کی مجلس انتظامیہ کے لئے کوئی سیکرٹری ہاتھ نہ آیا جو اس کی اصلی مشین کے پرزوں کا رنگ دور کرتا۔ وہ تمام دارالعلوم کی اصلاح و تکمیل میں مشغول رہے اور یہ عنصر فساد مجلس انتظامی میں اپنے اعمال مفسدہ برابر انجام دیتا رہا۔ وہ اگر چاہتے تو اصلاح کی قوت سے فساد کو شکست کا مل دے سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ اپنے کاموں میں موانع و فساد دیکھ کر خاموش ہوتے رہے۔

وہ سمجھے کہ کسی کام کے اندر رہ کر آہستہ آہستہ اصلاح کرنے کا ہول اختیار کرنا چاہئے حالانکہ اس کا موقع نہ تھا

تفصیل اجمال

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

ندوۃ العلماء مسلمانان ہند کی ایک عظیم الشان دینی تحریک تھی اور وہ ایک ایسا مرکز بنا چاہتی تھی جو ان کی تمام ضروریات و معاملات مذہبی کی کفیل ہو۔ وہ جماعتی کاموں کے اصول پر ایک قومی مجلس تھی اور قوم ہی کے سرمایہ سے اپنے تمام کاموں کو انجام دینا چاہتی تھی۔ اس بنا پر ضرور تھا کہ اس کا نظام عمل بالکل اسی طرح جمہوری اور اشتراکی اصول پر ہوتا، جیسا کہ ہر قومی انجمن کا ہونا چاہیے، اور شخصی اقتدار اور محدود جماعتوں کے قبضہ و تسلط سے وہ ہمیشہ آزاد رہتی۔

اس کی شاخیں تمام ضلعوں میں قائم کی جاتیں اور ہر صوبے سے اس کے بے نمبر منتخب ہوتے اور جو کچھ ہوتا، جلسہ عام میں ہوتا۔

صرف یہی نہیں کہ آج کل تمام جماعتی کاموں کا یہی اصول ہے، بلکہ دراصل شریعت حقہ اسلامیہ کا اصل الاصول "شوری" یہی تعلیم دیتا ہے اور ہماری نظر غیروں کی تقلید پر نہیں بلکہ اپنے الہامی اصولوں پر ہونی چاہئے۔

چنانچہ ندوہ جب قائم ہوا تو یہ امور اس کے پیش نظر تھے اور جو قانون اساسی بنایا گیا اس میں جماعتی کاموں کے نظام صحیح کے مطابق پوری وسعت اور جمہوریت رکھی گئی۔ اس قسم کے کاموں میں سب سے بڑا اہم مسئلہ عہدہ داروں کے تقرر اور ممبران خاص کے انتخاب کا ہوتا ہے کہ اصلی کارکن قوت وہی ہوتے ہیں۔ ندوہ کے اصلی قانون اساسی کی دفعات اس بارے میں یہ تھیں

دفعہ ۲۷ ارکان جلسہ انتظامیہ کا انتخاب ہر سال جلسہ عام میں

اس طرح ہوا کرے گا کہ موجودہ مجلس انتظامیہ ایک فہرست بہ پابندی قواعد دستور العمل ہذا مرتب کر کے پیش کیا کرے گی جس میں کمی بیشی اور تغیر و تبدل کا اختیار جلسہ عام کو ہوگا۔

دفعہ ۳۶ - ندوۃ العلماء میں ایک ناظم اغوازی (آزیری سیکریٹری جلسہ عام سے منتخب ہوگا۔

دفعہ ۳۸ - عموماً صرف ناظم ندوۃ العلماء کی معزولی جلسہ عام سے ہو سکے گی اور دیگر عہدیداران ندوۃ العلماء کی معزولی جلسہ انتظامیہ سے ہوگی۔

ندوہ کا نظام کانسیٹی ٹیوٹن اس اصول پر تھا کہ تمام حق نظم و ادارہ اور قوت نافذہ و آمرہ ایک منتخب مجلس کو دی گئی تھی جس کا نام "مجلس انتظامیہ" رکھا گیا تھا۔ "مجلس انتظامیہ" ایک لغو اور مصلح ترکیب ہے۔ نہیں معلوم کس نے وضع کی؟۔ یہی مجلس سب کچھ تھی اور اب تک ہے۔

پس دفعات کے ان الفاظ پر غور کیجئے جن پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔ ان دفعات سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ندوہ نے اپنی مجلس انتظامیہ اور اپنے سیکریٹری کا حق انتخاب جلسہ عام کو دیا تھا جس میں ہر حصہ اور ہر طبقہ کے افراد ملت جمع ہوں اور بنیادی اصول پر مبر اور سیکریٹری منتخب کیا جائے پھر سیکریٹری کی معزولی کا حق بھی جلسہ عام کو دیا تھا کہ جو قوت کسی عہدہ دار کو نصب کر سکتی ہے، اسی کو حق عزل بھی ملنا چاہیے۔

یہی اسلام کا صحیح اصول شوریٰ اور نظام اجتماعی ہے اور کوئی حکومت کوئی ریاست، کوئی انجمن، کوئی جماعت، کبھی اسلامی نہیں کہی جاسکتی، جب تک

کہ وہ اس اصل شرعی و دینی اور حکم مقدس الہی کی پیروی نہ ہو۔
 لیکن یہ تجتائہ مسب سے پہلے خیر فساد و ضلالت نے ندوہ کی اسی شہرگ
 کو زخمی کیا اور "ملک غصوص" کی نبض ارواح مفسدہ ایسی پیدا ہو گئیں جنہوں نے
 ندوہ کے نظام جمہوری و شرعی کو یکا یک حکومت مطلقہ و شخصیت کے نظام ہٹل
 و بدعت سے بدل دیا، اور اس طرح ندوہ کی وہ بنیادی چٹان ہی شق ہو گئی
 جس پر کبھی اس کی سربفلک عمارتیں کھڑی کی جاتیں۔

انہوں نے دیکھا کہ ندوہ کی اصلی قوت حاکمہ مجلس انتظامیہ ہے۔ اس کے
 ممبر اگر جلسہ عام میں منتخب کئے گئے تو قوم کا ایک بڑا حصہ اس میں شامل ہو گا
 اور ہر حصے اور طبقے سے اشخاص لئے جائیں گے۔ پس ندوہ کی حکومت قوم
 کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ جس کو وہ چاہے گی سیکرٹری بنائے گی اور
 جس کو چاہے گی معزول کر دے گی۔ اس طرح کی حکومت راشدہ سے کبھی اقتدار
 و مطلق العنانہ حکمرانوں کا دروازہ بند ہو جائے گا اور ندوہ کو اپنی جائیداد بنا کر
 کوئی نہیں رکھ سکے گا۔ پس مسب سے پہلے مجلس انتظامی کے انتخاب کا حق
 جلسہ عام سے غصب کر لینا چاہیے۔ چنانچہ نئے دستور العمل میں جلسہ عام کی قید
 اٹھا دی گئی۔

اسی طرح سیکرٹری کی معزولی کا جو حق شرعی و دینی جلسہ عام کو حاصل تھا،
 وہ بھی اس سے چھین لیا گیا۔ یعنی جن مسلمانوں کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر
 رضی اللہ عنہما کی معزولی کا حق حاصل تھا اور ان کے اس حق کو خود یہ جانشین
 پیغمبر تسلیم کرتے تھے، انہیں ندوۃ العلماء نامی ایک انجمن کے سیکرٹری کو معزول

کرنے کا حق نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت اس کارروائی کے بعد ندوہ ایک اسلامی انجمن ہی نہ رہا کیونکہ میں کسی جماعت کو جو اپنے اندر اسلام کے اصل الاصول شوریٰ اور اشتراک جمہور کے قاعدے کو نہ رکھتی ہو، ابداً اسلامی جماعت تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ شاید اس ملت کی پیرو ہوگی جس میں کسریٰ اور قیصر گزرے ہیں، مگر وہ اسلام جس کے پیروایہ بکر و عمر تھے (رضی اللہ عنہما)، اور جس کے قرآن میں سورہ شوریٰ موجود ہے، اس سے انھیں کچھ تعلق نہیں۔

مجلس خاص

اس کے بعد اپنے تمام استبدادی اغراض مضدہ کی ٹکیل اور خود مختارانہ اعمال سیئہ کی تحصیل کے لئے ایک قدم ضلالت اور آگے بڑھایا اور دستور العمل میں "مجلس خاص" کے نام سے ایک مجلس کا اضافہ کیا جو فی الحقیقت اپنے خواص و اوصاف کے لحاظ سے عجائب خانہ ندوہ کا سب سے زیادہ عجیب انخلقت چانور ہے۔ شاید ہی دنیا کی کسی مجلس میں جو ایک قومی مجلس کے نام سے مشہور ہو، ایسی صریح خود مختاری اور شخصی استبداد و حکومت مطلقہ سے کام لیا گیا ہوگا جیسا کہ اس خانہ ساز مجلس کے وضع کرنے میں لیا گیا۔ وہ قطعاً عجیب انخلص ہے۔ کیونکہ جہل و فساد، دونوں کا مجموعہ ہے۔ ایک طرف تو اس کو دیکھ کر ان احمقوں کی بے وقوفی پر ہنسی آتی ہے، جو ایک عظیم الشان مجلس کو چلانے اور قائم رکھنے کے وہم میں گرفتار تھے مگر انھیں اتنی بھی خبر نہ تھی کہ دنیا بھر میں مجلسوں اور جماعتی کاموں کے عام اصول کیا ہیں؛ دوسری طرف

ان کے افساد و شرِ عظیم پر متاسف ہونا بڑا ناہنجہ کی طرح قوم کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مذوہ کے جسم سے یکسر روح حیات و عمل کھینچ لی اور پھر اس کی بے جان لاش پر گدروں کی طرح گر کر پہنچے مارنے لگے۔

اس ”جلسہ خاص“ کو ایک طرف تو اس قدر وسیع اختیارات دے دیے گئے کہ مذوہ کی ہستی یکسر اس کے قبضہ میں چلی گئی۔ یعنی قانون اساسی اور تمام قواعد و ضوابط متعلق مذوہ کی تبدیل و ترمیم بلکہ یک قلم منسوخ کر دینے کا اختیار بھی اسی کو دے دیا گیا (دیکھو دفعہ ۳۰۵ دستور اہل حال)، دوسری طرف اس کے انعقاد کو تمام مجلسی قواعد و شرائط کی پابندی سے بالکل آزاد کر دیا تاکہ اس کے مطلق انعقاد کا سونے میں کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے!

چنانچہ دستور اہل مال کی دفعہ ۲۹ میں ہے۔

”جلسہ خاص کے لئے کوئی وقت اور کوئی زمانہ معین نہیں ہے۔“

حب تحریک ارکان مجلس انتظامی، یا ناظم، یا نائب ناظم، جب ضرورت پیش آئے، منعقد ہو سکتا ہے۔“

اضول اور حقِ جماعت کو شاید ہی دنیا میں اس طرح کسی نے غارت کیا ہوگا! ایک عظیم الشان قوی انجمن کے انتظام کے لئے ایک مجلس مقرر کی جاتی ہے جس کے اختیارات کا یہ عالم ہے کہ وہ اس کے کانسٹی ٹیوشن تک کو بدل ڈال سکتی ہے۔ لیکن نہ تو اس میں عام انتخاب کو دخل ہے، نہ اس کے ممبروں کی تعداد میں وسعت ہے، نہ اس کے لئے قابلِ اطمینان ضوابط و قواعد ہیں کوئی شرط، کوئی ہمت، کوئی زمانہ اس کے لئے معین نہیں جب کبھی دوچار

انتظامی بیوروں کے نام سے ایک درخواست حاصل کر لی جاسکے یا سیکرٹری اپنی کسی خاص غرض سے ایسا کرنا چاہے، فوراً چند اشخاص کی ایک مجلس منعقد کر کے ایک حکمران و فعال مایرید کی طرح ندوہ کے تمام قوانین و ضوابط کو منسوخ کر دے سکتا ہے!

پھر صرف سیکرٹری ہی تک آکر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ نائب سیکرٹری بھی اگر چاہے تو دستور العمل نے اسے پورا حق دے دیا ہے۔

شجرہ فساد کا دوسرا اٹھم

یہ ظاہر ہے کہ ندوۃ العلماء کا مقصد صرف ایک عربی مدرسہ قائم کرنا نہ تھا۔ وہ ایک عظیم الشان دینی تحریک تھی جو حفظ کلمہ اسلام کے لئے تمام علماء ملت کو متفقہ و متحدہ جدوجہد کرنے کی دعوت دیتی تھی، اور ایک ایسا عام مذہبی مرکز بنانا چاہتی تھی جو کسی خاص گروہ کے لئے مخصوص نہ ہو، بلکہ وہ تمام عظیم الشان تحریکیں جو کل مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہوں اس کے اندر انجام پائیں یہی سبب تھا کہ اس نے ابتدا ہی سے اپنے اہم مقاصد یہ قرار دیے کہ حفظ کلمہ توحید و خدمت اسلام کے لئے تمام علماء کا اجتماع، اور اصلاح نصاب و تعلیم قدیم۔

پہلے مقصد کی بعض حلقوں سے سخت مخالفت ہوئی اور بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ بعض علماء نے رفع نزاع باہمی اور اتحاد علماء کا یہ مطلب سمجھا کہ ندوہ اسلام کے مختلف فرقوں کے عقائد کو باہم ملا کر ایک نیا معجون مرکب بنانا چاہتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے ان مخصوص عقائد کو ترک کر دے جنہیں وہ حق سمجھتا ہے، لیکن ندوہ نے اپنے مقصد کو

زیادہ واضح کیا کہ اس کا مقصد اختلافات باہمی سے دست بردار ہونا نہیں ہے اور نہ اس طرح کا اتحاد حق پرستی اور امر بالمعروف کے ساتھ کبھی ہو سکتا ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ جو امور تمام مختلف گروہوں اور جماعتوں کے مشترک معتقدات ہیں مثلاً حفظ مبیضہ شریعت و دفع هجوم منکرین اسلام، و اصلاح عموم مسلمین، و تبلیغ کلمہ توحید و رسالت، ان مقاصد کے لئے تمام پیر و ان کلمہ شہادت شفیق ہو کر اپنی قوتوں کا ایک مشترک مرکز بنائیں۔ جدید علوم مادی نے آریہ سماج کے مشنریوں نے، عالم مسیحی کے عالمگیر دینی حملوں اور متواتر کوششوں نے، جو نقصان اسلام کی قوت دینی و تبلیغی کو پہنچا یا ہے، اس کا اثر اسلام کے ہر فرقے پر یکساں پڑتا ہے۔ اگر کلمہ اسلام سب کو محبوب ہے، تو اس کے لئے سب کو اپنی قوت صرف کرنی چاہئے۔

اسی طرح بہت سے مذہبی سالمات ایسے ہیں جن کا تعلق گورنمنٹ سے ہے اور ان کے لئے کسی ایک فرقے کی نہیں بلکہ عموم اہل اسلام کی طرف سے صدا بلند ہونی چاہئے۔ مذہ وہ صرف اس لئے قائم ہوا ہے کہ ان مشترک مقاصد کو انجام دے۔ باقی رہے ہر گروہ کے مخصوص کام، تو ان کے لئے پہلے سے مختلف انجینس قائم ہیں اور ہر فرقہ اپنے مخصوص اعتقادات پر پوری طرح قائم رہ کر ہر طرح کے کام انجام دے سکتا ہے۔

مذہ کے لئے یہ اصول ابتداء سے بمنزلہ ایک بنیاد اور اساس کے تھا اور اس کے قدیمی دستور اہل میں کوئی قید کسی خاص گروہ کے لئے نہ تھی لیکن بعد کو یہ عمر میت بالکل نکال دی گئی اور ایک دفعہ یہ بڑھادی گئی کہ مذہ کے

ارکان انتظامی صرف ایک ہی گروہ سے لئے جائیں گے اور اس طرح اس کا دائرہ سمٹ کر باطل محدود ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی انجمنیں جو آج ملک میں قائم ہیں، ان کے دستور العمل میں اس سے زیادہ وسعت و عمومیت ہوئی جتنی کہ موجودہ حالت میں منظم انشائے ندوہ میں ہے!

استبداد و افساد کا رکا نتیجہ

ان تغیرات مفسدہ و بدعات منکرہ سبب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ندوۃ العلماء سے روح عمل و اصلاح بالکل مفقود ہو گئی، اور جیسا کہ یہ مفسدین مفصلین چاہتے تھے وہ محض چند آدمیوں کا ایک خانہ ساز کھڑنا بن کر رہ گیا۔ ہلک اس کے نام کو عزت کے کاؤں سے سنتی تھی، لوگ اس کے مقاصد کو یاد کر کے اس سے حسن ظن رکھتے تھے، ارباب فکر و اصلاح سمجھتے تھے کہ وہ اصلاح دینی کا تمام عالم اسلامی میں ایک ہی عملی کام ہے۔ حتیٰ کہ قسطنطنیہ کی شیخیت اسلامیہ اس کے حالات تحقیق کرتی تھی اور سید رشید رضا اپنے تمام تصدق اصلاح کے لئے اس کو ایک اسوۂ حسنہ بتلاتا تھا، لیکن جب کہ یہ سب کچھ سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا، تو بین اسی وقت خود ندوہ کے ارباب عمل و عقد کا یہ حال تھا کہ اصلاح کے نام پر تبرائیہ تھے، اور ان کے نفوس مفسدہ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی گروہ اصلاح و دعوت کے عمل صالح اور اقدام صحیح کا الدلہ الخصام دشمن نہ تھا!

قبلہ گم شد، محتسب میخانہ را آباد کن!

متضاد صورتوں اور متخالف حقیقتوں کا شاید ہی کوئی ایسا تسخیر انگیز اجتماع ہوگا جیسا کہ بد بخت مذوقہ العلماء تھا! تھوڑی دیر کے لئے اس منظر کا تصور کرو! ایک طرف تو زندہ کی ظاہری مصلحانہ صورت تھی، جس کی زبان پر ہر دم اصلاح اور عمل کا ورد جاری تھا۔ اس کی صدائیں قسطنطنیہ پہنچتی تھیں، اور قاہرہ کے اندر اس کی تقلید میں ایک نئی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ اس کے جلسے ہوتے تھے اور اس کے سب سے بڑے کام یعنی دارالعلوم کا سیکرٹری مسئلہ اصلاح تعلیم اور اجتماع نتائج قدیم و جدید پر تقریر کرتا تھا۔ لوگ سنتے تھے اور آمال اصلاح و قرب حصول نتائج کے تصور سے خوش ہوتے تھے اس کے بعد بعض ان فارغ التحصیل طلباء کی صورتیں تھیں جو دارالعلوم کے اولین دور کے نتائج قائمہ ہیں، اور جو اپنی ممتاز خصوصیات کے اندر لوگوں کے لئے ایک دعوت جالب اور پیغام جاذب تھے۔

لیکن دوسری طرف جب تلوار ہر وصور کا پردہ اٹھاتا تھا اور خود زندہ کا باطن سامنے آتا تھا، تو اس کی جماعت حل و عقد اپنے تمام آلات مفسدہ اور اسلحہ باطلہ کے ساتھ جلوہ فروش ہوتی تھی اور ان نبرد آزما یانِ فضیلت و تقدس میں کاہر مجاہد فخر کرتا تھا کہ اس کی سیف غزا رچیل نے "اصلاح دین" کی کسی نہ کسی ایک ہستی کو عین اس کی پیدائش کے وقت ضرور ہی خاک و خون میں تڑپایا ہے!!

آفتے بود ایں شکار افکن گزین صحرا گذشت!

نشہ شام کی نصف شب

بہت سی تاریخیں یاد رکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ فرانس ۱۷ جولائی ۱۷۹۳ء کو نہیں بھولنا کہ آزادی کی رحمت کا اسی دن نزول ہوا۔ انگلستان ۲ جون ۱۷۷۶ء کو ہمیشہ یاد رکھنا ہے کہ شاہی اقتدار پر آخری ضرب اسی دن لگی۔ لیکن یہ یاد گاریں دنیا کی زندہ قوموں کا حصہ ہیں۔ ہم بدبختوں اور زبوں طالعوں کے پاس بھی بہت سی تاریخیں ایسی تھیں جن کی عظمت کے آگے صرف ہم ہی نہیں بلکہ تمام عالم سر جھکاتا تھا، لیکن یہ زندگی کے کاروبار تھے، اب کہ موت کی مرونی سے ہم ملت کا ہر عضو افسردہ ہو رہا ہے، ایسے نصیب کہاں کہ کامیابی و فتحیابی کی تاریخیں یاد رکھنے کے لئے ہمیں اس قوم کی اقبال کا آفتاب جب چمکتا ہے تو شاید ایک ہی مرتبہ چمکتا ہے، لیکن ترقین باندازہ ہمت سے ازل سے تمام ازل نے ہر شخص کو اس کی ہمت اور صلاحیت کے مطابق

اس کا حصہ دے دیا ہے۔ کوئی سایہ طوبیٰ میں بیٹھ کر خوش ہوتا ہے اور کوئی قامت یار کی جستجو میں۔

تو طوبیٰ و ما و قامت یار

خوشی کے دن ہیں نصیب نہیں کہ یاد رکھیں تو اپنے ایام غم کو تو بھول نہیں سکتے اور روں کو اگر فصل بہار کی یاد ملی ہے تو مبارک ہو، ہم خزاں کی یادگار مٹا کر یں گے۔

نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

اگر دن پھرنے والے ہیں تو عجب نہیں کہ نوحہ غم سے نغمہ طرب کی لے پیدا ہو جائے۔ بہار خزاں کے بعد ہی آتی ہے اور خشک درختوں کو ہم نے سرسبز ہونے دیکھا ہے۔

خدا ز زندگی سے موت کو اور موت سے
میت من الحی و میت من المیت و یخیر
میت من الحی و میت من المیت و یخیر
میت من الحی و میت من المیت و یخیر
میت من الحی و میت من المیت و یخیر
میت من الحی و میت من المیت و یخیر
میت من الحی و میت من المیت و یخیر
میت من الحی و میت من المیت و یخیر

اسے زندہ کر دیتی ہے۔

۱۲ دسمبر

ہمارے اخیان وطن جب ۱۲ دسمبر کی یادگار کا جشن منائیں گے کہ اسی دن ان کی سی سالہ آئیں سالہ جد و جہد نے حکومت کو شکست دی اور تقسیم بنگال کا نوشتہ تقدیر (جس کی تیغ کو لارڈ ڈارلے جانے کے لئے بچوں کا چھٹا کہتے تھے) بالاخر مٹا کر چھوڑا، تو ہم بھی بیکار نہیں رہیں گے۔ وہ اگر

اپنی کامرانی کو یاد رکھیں گے تو ہم اپنی نامرادی کا مرثیہ پڑھیں گے۔ وہ اگر اس پر خوش ہوں گے کہ تیس برس تک شاہراہ مقصود پر چلتے رہے اور بالآخر منزل کو سامنے دیکھا تو ہم اپنی گمراہی و ضلالت پر سر ہنسیں گے کہ تیس برس تک غلط راہ چل کر ٹھوکریں کھاتے رہے اور بالآخر منزل کے بل گرے۔ وہ اگر اپنے رہنماؤں کو یاد رکھیں گے جنہوں نے اپنے تئیں کھو کر آج انہیں پیدا کیا، تو ہم بھی اپنے لیڈروں کو بھول نہ سکیں گے کہ اپنے اغراض و منافع کی تلاش میں پوری ملت کی ملت کو کھو دیا۔ اور سب سے آخر یہ کہ اگر ان کو خوشی ہوگی کہ جو کچھ ملا وہ اس سے زیادہ کہ اہل تھے تو ہم کو بھی شکایت نہ ہوگی کہ جس ٹھوکر سے ٹھکرائے گئے اس سے بھی زیادہ کے مستحق تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے لئے خوشی کی یاد ہے اور ہمارے لئے غم کی، لیکن اگر چشم بینا اور دل عبرت پذیر ہو تو نتیجہ دونوں کا یکساں ہے۔ ان کو کامیابی بہت دلاتی ہے تو ہم کو ناکامی غفلت سے بیدار کرتی ہے۔ ان پر حکومت کا یہ احسان ہے کہ مایوس ہونے سے بچا لیا تو ہم پر ان سے بڑھ کر احسان یہ ہے کہ سوئے میں ہوشیار کر دیا۔

كَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنَا فِيۡ فِصۡلَتَیۡنِ (۱۱:۳) بیشک خدا کی ثناتی ہے دونوں جہانوں میں
۳۱ رجولانی ۱۱۹۱

عبرت کے مواقع جلد جلد میسر نہیں آتے اور غفلت کو ہمیشہ بیداری کی کردیں نصیب نہیں ہوتیں، اگر ایسا ہو تو دنیا کم موئے اور زیادہ

جاگے حالانکہ وہ ہمیشہ ہی سوتی رہتی ہے۔ لیکن شاید اب ہمارے دن جلد پھرنے والے ہیں کہ قدرت کا نازیبا نہ تنبیہ جلد جلد اٹھنے لگا ہے۔ ۱۲ دسمبر کا ابھی زیادہ دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ۲۱ جولائی ۱۹۷۱ء کی تاریخ نمودار ہوئی۔ آنریبل سراج۔ ایس بٹلر اپنے مراسلے کی تہید میں کہتے ہیں۔

”۲۱ جولائی کو میں نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ صاحب وزیر ہند یونیورسٹی کا قیام منظور فرمانے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ۔

۱۱۔ آپ کی کمیٹی کافی سرمایہ دکھلا سکے

۱۲۔ یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن جو آپ پیش کریں، وہ تمام وکال گورنمنٹ

ہند اور صاحب وزیر ہند کو منظور ہو۔

نیز میں نے اس مراسلے میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ آپ کی جراسیکم صاحب وزیر ہند کے سامنے پیش ہوگی اس کی عام تفصیلات کے متعلق وہ اپنے اختیارات کا استعمال کو محفوظ رکھتے ہیں۔“

ہم کو یہ تاریخ بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے یہی وہ یادگار تاریخ ہے جس نے گویا ہمارے موجودہ دور زندگی کی سب سے بڑی جدوجہد ہمارے وقت اور مال کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کا فیصلہ کر دیا تھا۔ حکمران کمیٹی نے تمام قوم کو اس سے بے خبر رکھا، اور برابر ہی پیچھے رہے روسیہ لاؤ، روسیہ لاؤ۔ کیونکہ اس کے سوا اور کوئی رکاوٹ درپیش نہیں کہ اللہ یَعْلَمُ مَا لَعْنَةُ كَاذِبُونَ

ان میں کا ہر فرد، ہر واقف کا شخص کی طرح خوب جانتا تھا کہ ایسی

یونیورسٹی جو گورنمنٹ کے آہنی پنجے میں دبی ہوئی نہ ہونے ملی ہے اور نہ مل سکے گی۔ اور پھر قرائن و حالات سے بڑھ کر خود صاف صاف لفظوں میں مسٹر بٹلر نے کہہ دیا تھا کہ شرط آخری یہی ہے کہ جزد کل پہلے ہاتھ میں محفوظ رہے گا۔ باوجود اس کے پریس کیونکہ کی اشاعت تک ان میں کا ہر شخص دانستہ دس کوڑے سالانوں کو دھوکا دیتا رہا اور صرف اس لئے کہ افشائے راز کے بعد چاندی اور سونے کی لگاؤ بارش جو ہو رہی ہے بند ہو جائے گی۔ کسی کا لب نہیں کھلا کہ "سمائے شملہ" کا "شدید القوی" جو وحی اس پر نازل کر رہا ہے اس کو اپنی مظلوم امت تک بھی پہنچا دے صرف ایک "نواب وقار الملک" کا سچا اور مومن قلب تھا جو ان فریب کاریوں کا متحمل نہ ہو سکا اور علی گڑھ کے مذاہن کی ظلمت اس کے نور ایمان پر غالب نہ آسکی۔ انھوں نے اہلیت سے جب پردہ اٹھایا تو روپیہ دینے والوں کے ہوش و حواس ذرا ٹھکانے ہوئے اور پیشانیوں کو دکھا تو پسینے سے تر قیں۔ لیکن اب شکوک و شکایت کا موقع نہ تھا۔ وہ اجتماعی جوش اور قومی جذبات جو دوسری قومیں آزادی اور وطن پرستی جیسے مقاصد عالیہ کے لئے صرف کرتی ہیں ہم ایک لفظ بے معنی اور ایک سفر بے مقصد یعنی مسلم یونیورسٹی کے پیچھے ضائع کر چکے تھے اور رہزنوں سے پہلے خورجیروں نے دل اور سبب دونوں کو لوٹ لیا تھا۔

بمحو خرابجے کہ یہ خراب ٹولہ
لیکن سخت اضطراب دلی کے ساتھ لکھا پڑا ہے کہ باران شانگ نے

بالآخر نواب صاحب قبلہ کو بھی مہین سے نہ بیٹھنے دیا کہ اس حق گوئی کو اس کی اصلی شان میں رہنے دیتے۔ نواب صاحب کی چٹلی کے شایع ہوتے ہی دراجہ صاحب محمود آباد، "اس سخت اور تکلیف دہ موسم گرما کی دقتیں برداشت کر کے اور "عشق ازیں بسیار کردست و کند" علی گڑھ پہنچے اور پھر چند دنوں کے بعد ہی نواب صاحب قبلہ کی دوسری مراسلت اخبارات میں شایع ہو گئی !

تاہم نواب صاحب کی عظمت ہمارے دلوں میں ہے اور ہے گی ہم ان کی مجبوریوں سے بے خبر نہیں جس سرزمین، اور جن لوگوں میں رہ کر ان کو کام کرنا پڑا اس کو دیکھتے ہوئے، تقسیم بنگال کی فیض، مسئلہ طرابلس اٹلی کی جدہ، پر گولہ باری اور نیز مسلم یونیورسٹی پراٹھوں نے جو کچھ لکھا ! ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ان کی قوت ایمانی کا ایک اعجاز ہے۔ ورنہ ہنگامے سے اذان کی آواز نہ بغیر اس کے ڈھائے ہوئے آج تک کسی نے سنی ہے ؟

قصر یدیز

مگر تمام دنیا اب سلطان عبدالحمید کے مظالم کو تسلیم کرتی ہے لیکن ہندوستان کی مٹی عقیدت اور ریشش کے خمیر سے بنی ہے بہت سے لوگ ہیں جن کو قصر یدیز کے جبر و شخصیت پر اب تک یقین نہیں آتا۔ ایسے لوگ چاہیں تو ہم انہیں خود ہندوستان ہی میں ایک چھوٹا سا یدیز بنلا سکتے ہیں۔ خود مختار بادشاہوں نے اپنا لقب "مالک" رقابہ الامم رکھا تھا یعنی قوموں کی گردنوں کے مالک، کہ وہ جب چاہیں گردنوں

کو جہوں سے الگ کر سکتے ہیں۔ یہ اختیار تو اب ہم نے برطانیہ کی گورنٹ آف انڈیا کو دے دیا ہے، البتہ ہمارے سرور کی مالک ایک جماعت موجود ہے جو جب چاہے بے تال انھیں ٹھکرا سکتی ہے۔ یہ ہمارے خود ساختہ لیڈروں کا گروہ ہے، جنھوں نے اپنے ایوان مشورہ کو قصر پلڈیز کا نمونہ بنا لیا ہے۔ اس کے دروازے بند، اور در و دیوار خاموش ہیں۔ ان کی رہایا کا صرف یہ قرض ہے کہ چند دن کی مالگداری اور خراج بے چون و چرا پیش کرنی رہے اور کبھی دم نہ مارے، اگر کوئی انقلابی خیالات کا باغی ملک میں پھینپی پیدا کرے جو فوراً ”ماین ہائیوٹی“ سے ایک فرمان شایع کر دیا جائے کہ ابھی وقت نہیں آیا، یا یہ رموز مملکت اور رازدارانہ اعمال میں جو اپنے وقت پر خود منکشف ہو جائیں گے۔

يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ مختار ہے
یونیورسٹی کے معاملے میں بھی اپنی عادت مستمرہ کے مطابق ان لیڈروں نے ہی سمجھا تھا کہ قوم نے کبھی پوچھا ہے اور نہ پوچھے گی۔ روپیہ ملتے جائیں اور وقت ملتے جائیں، بند کمروں میں بیٹھ کر جو کچھ کرنا ہے کر دیں گے جب وقت آئے گا تو سمجھا دیں گے کہ فرض اطاعت اولی الامر اور شان و قاداری کا بھی اقتضا ہے کہ جو کچھ ملے آنکھوں سے لگا کر قبول کرو یہی سبب ہے کہ جب کبھی کسی بندہ خدا سے رہانہ گیا اور اس نے چار لفظ منہ سے نکالے تو معاً اس کی زبان بند کر دی گئی۔ بارہا پوچھا گیا کہ آخر یونیورسٹی ہے کیا شے؟ گورنمنٹ کیونکر ایک آزاد یونیورسٹی کر

بارٹروے سکتی ہے؟ حق دیتو (Veto) کے کیا معنی ہیں؟ مگر یونیورسٹی
 بھی "استوار علی العرش" کا مسئلہ تھی کہ ہمیشہ یہی جواب ملا
 کیفیتہ مجمل، والا اعتقاد واجب اس کی حقیقت مہول ہے مگر اس پر اعتقاد
 والسوال عند بداعت واجب ہے اور اس کی نسبت سوال بدعت
 لیکن سب کچھ کہہ کر آخر یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب قوم کا قصور ہے
 اور اس کی علت بھی مسلمانوں کی تمام امراض کی طرح مذہب سے رد گردانی
 ہے۔ اسلام نے اپنے ہر سپرد کو لیڈر بنایا ہے اور کوئی نہیں جس کو خدا
 اور رسول کے سوا مسلمانوں کے کاموں پر خود مختار رائہ اقتدار حاصل ہو
 احتساب ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے جب خود ہم نے اپنے تئیں
 فاضل رکھا تو عبادت کیا ضروری ہے؟

نہ پیش نہ ہو قتل انصاف یہ ہے

کہ ہم خود پہ آموز قاتل ہوئے ہیں

کیا کیٹی کو آج ہی یہ معلوم ہوا ہے کہ یونیورسٹی آزاد اور مسلم یونیورسٹی
 شہر کی کہ اب آگ لگانے والے آگ بجھانے والوں کے ساتھ شریک
 ہو گئے ہیں؟ منجیب سے اگر شدہ دوڑ دوڑ کر جانے والوں کو اس کی
 خبر نہ ہو جب کہ خود ہم کو گھر بیٹھے اس کی خبر تھی ہم مسلمانوں سے منت انجا کرتے
 ہیں کہ خدا کے لئے اب وہ جماعہ عقیدت اور مہلک جن ظن سے کام نہ
 میں کہ لیڈر پرستی کی حد ہو گئی۔ ہم ان کو اپنا دل نہیں دکھا سکتے مگر اپنی سچائی
 کا شاید یقین دلا سکتے ہیں، ولتدعیلم سری وعلانیۃ، ہم کو کسی سے بعض

نہیں، مگر خدا کی دوستی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ یقین کریں کہ اگر نواب وقار الملک نے عین موقع پر بھانڈا نہ پھوڑ دیا ہوتا اور قوم میں تغیرات حالت نے حقوق طلبی کی جنبش پیدا نہ کر دی ہوتی تو آج ان لیڈروں میں سے ایک بھی اس موقع پر سامنے نہ آتا اور جو کچھ الگست کو ہوا اس کے ذکر سے ہماری تاریخ ہمیشہ خالی رہتی۔ آج تو آغا خاں بھی عدم الحاق کی مخالفت میں تار بھیجے ہیں اور پھر اس پر اصرار کرتے ہیں کہ اس کا اعلان کر دو، لیکن سوال یہ ہے کہ کل تک حضرت کہاں تھے؟ اس سلسلے پر تو ان کی رائے پہلے ہی ظاہر ہو چکی ہے اور وہ جو کچھ بھی کیٹی کے صیغہ پر رازداری کی الماری میں موجود ہے۔ اب ان کے تار کے اعلان کی ضرورت نہ تھی۔ فیصل الہی سے خردان کی خدمات کی تشہیر ہو رہی ہے۔ کل کی بات ہے کہ ہم نے ان کی گاڑی کھینچی تھی، لیکن شتان مابین الیوم والامس جن عزتوں پر خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا وہ گو گنتی ہی نظر فریب ہوں مگر پامدار اور مستحکم نہیں ہوتیں۔ **وَاللّٰهُ الْخَبِيرُ ذُو الْمُنْتَلٰی اَوَّلُ الْعِزِّ عِزَّتِ خَدَا كے لئے** ہے اور اس کے رسول کے لئے اور سچے مومنوں کے لئے

الگست کو لکھنؤ میں جو جلسہ ہوا تھا پہلے دن اس کے دروازے بند نہیں کئے گئے مگر جو آنکھیں تاریکی میں کام کرنے کی عادی ہوں ان کو باہر کی روشنی کب اس آسکتی ہے بالآخر دوسرے دن گوبٹ بھڑائے نہیں گئے مگر ملک پر دے چھوڑ دئے گئے تاکہ کچھ تو تاریکی پیدا ہو جائے دیدار می نہائی دہریزی کنی

سب سے پہلے راجہ صاحب محمود آباد نے افتتاحی تقریر میں اس پر بے انتہا افسوس ظاہر کیا کہ ہم نے آج تک اپنی کارروائی کو بے صیغہ راز رکھا تھا مگر اب گورنمنٹ خود اسے ظاہر کرتی ہے۔ جب گورنمنٹ چھپانا نہیں چاہتی تو ہم کو کھی جاسیے کہ آئندہ سے اپنے اجلاس پبلک طور پر کریں۔

یہ تو راجہ صاحب نے گورنمنٹ سے خوب انتقام لیا
جزائِ سیئۃ سیئۃ مثلاً بدی کا بدلہ ویسی ہی بدی سے۔

میں بالیقین و الجرحۃ خصائص

ہم کو افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے کیٹی کی رازداری کی قدر نہ کی وہ گورنمنٹ جس کی خاطر کیٹی نے اپنی قوم تک کو چھوڑ دیا، اور اس روپے کے مصروف سے ہمیشہ بے خبر رکھا جس میں معصوم لڑکیوں کے کانوں کی بالیاں اور بچوں کی مٹھائی کے پیسے تک شامل تھے۔ اس کے بعد راجہ صاحب کو بہت سی باتیں ایسی یاد آئیں جو اگر چند ماہ پہلے یاد آئیں تو قوم کا تیس لاکھ روپیہ اور ایک ہی تہہ پیدا ہونے والا جوش اس طرح ضائع نہ جاتا۔ تاہم اب بھی غنیمت ہی سمجھنا چاہئے۔ واقعات نے اس ابتدائی منزل تک تو پہنچا دیا۔ عجیب نہیں کہ کہتے کہتے ایسے ہی الفاظ زبان پر چڑھ جائیں

حور و جنت جلوہ برزاد دہ در راہ دوست
اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

باوجود ایں ہمہ جوش و خروش، پھر بھی اس جلسے کو دیکھئے تو یہ کچھ
ہو چکنے کے بعد بھی ارباب طریقت اسی فکر میں تھے کہ کبے کی طرف رخ
کرنا پڑا ہے تو کم از کم تنکے کی طرف پیٹھ تو نہ ہو۔ پہلے بحث ہوئی کہ
اس مجلس کی کارروائی بھی صیغہ راز میں رکھی جائے یا نہیں؟ گوراجہ صاحب
گورنمنٹ کی اتباع سنت کے خیال سے پبلک جلسے کا اعلان کر چکے تھے
اور اب بھی طبیقیں ایک حد تک جوش و خروش کی نمائش کرنا چاہتی تھیں، لیکن
مدتوں تک جو پاؤں کچھرو میں پھنسے رہے ہوں، وہ یکا یک صاف قالین
پر چلیں گے تو دھبے پڑیں گے ہی۔ بعض صاحبوں نے کہا کہ گورنمنٹ نے
سر حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہو مگر ہم شائقین راہ و فاداری کو کہ یہاں بحث
باندھ چکے ہیں، اب بھی مرغ سحر کی جگہ پروانے کے مشرب عشق پر کار بند
رہنا چاہئے۔

کال سوختہ راجان شد و آواز نیامد

ہم نے سنا ہے کہ صاحبِ زندہ آفتاب احمد خاں صاحب کی
بھی یہی رائے تھی۔

ہم اس موقع پر آنریبل مسٹر مظہر الحق کی تعریف کرنے کے لئے اپنے
اندربے اختیارانہ جوش پاتے ہیں کہ انھوں نے فی الحقیقت اس جلسے کی
شرم رکھ لی، اور پوری آزادی اور دلیری کے ساتھ ہول رازداری کی

مخالفت کی :

جزاء اللہ عتیٰ وعن سائر المسلمین خیر الجزاء

دوسرے دن کے اجلاس میں بھی ان کی تقریر پڑھ کر ہم کو نہایت خوشی ہوئی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے مسلمانوں کی غلامانہ پالیسی کا نتیجہ ہے لیکن ناظرین اس سے یہ رائے قائم نہ کر لیں کہ اب ان کی پولیٹیکل جماعتوں میں بھی ایسی آزادانہ رائے رکھنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب پیدا ہوں، لیکن مسٹر مظہر الحق کی آزادی تو صرف اس کا نتیجہ ہے کہ وہ عمر بھر ملک کی اصلی کارکن جماعت یعنی کانگریس کے ساتھ رہے اور کبھی مسلمانوں کے پولیٹیکل مذہب کی تلقینات قبول نہیں کیں۔ اگر علیگڑھ کی دلدلی میں بھی وہ پھنس گئے ہوتے تو آج ان کی زبان اس طرح نہ چلتی۔ انوس :

کامل اس فرقہ رزاد سے اٹھانہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

جلسہ پر ایک اجمالی نظر

لیکن بہر حال اراگست کا جلسہ بحیثیت مجموعی ہماری انقلاب حالت کے لئے ضرور ایک پیغام امید تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں نے ایک پبلک مجلس میں آزادی کے ساتھ اپنی خواہشوں پر استقامت ظاہر کی، اور جوش بزدلی پر غالب رہا۔ راجہ صاحب محمود آباد کی تقریر اس امر کا

ثبوت میں تھی کہ اگر قوم کے عوام اپنے اندر حرکت پیدا کر لیں تو بڑے آدمیوں کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا ہی پڑے گا۔ انھوں نے جس صفائی اور غیر مشتبہ پے میں موجودہ حالت کی تصویر کھینچی اور ان خیالات کو ظاہر کرتے ہوئے گورنمنٹ کے تعلقات کو جیسی بے پردہا ہی کی نظر سے دیکھا اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے اور وہ آئندہ کے لئے ایک فال نبیہ ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ ملاوہ اور باتوں کے ذاتی طور پر بھی خود ان کے تعلقات سر ایچ ایس جگر سے بہت گہرے ہیں اور اس طرح کے ہیں کہ اگر کسی حالت میں اغماض نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی حالت میں گورنمنٹ اور قوم کی صدائیں، یہ دو حریف مقابل ان کے سامنے تھے۔ انھوں نے قوم کا ساتھ دیا اور ایسی مخدوش سمیت آج کل کے نمایاں کار فرماؤں کی سطح بہت سے بہت بلند ہے۔ انریبل مسٹر منظر الحق اور مسٹر محمد علی کی تقریروں کو جلسہ کی اہلی کارروائی یقین کرتے ہیں۔ بیاں محمد شفیع خان بہادر نے جو کچھ کہا توقع کے خلاف، مگر جنرل کے نواب عبدالحمید نے موقع سے کم کہا تھا جنرل آفتاب احمد خاں صاحب کی رائے تھی کہ جلسہ کی تمام تقریریں اب بھی لازماً میں رکھی جائیں نیز وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ کاش وہ بتلائیں کہ اس میں کیا مصلحت تھی؟

اہل بحث

اب ہم چاہتے ہیں کہ اہل بحث یعنی مجوزہ بورنورٹی کی نسبت بھی کچھ اپنے دیرینہ خیالات ظاہر کر دیں۔ لیکن اس سے پہلے مجبوراً ایک مرتبہ

گزشتہ حالات پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ ناظرین طول بیان سے نہ گھبرائیں کہ ایک مرتبہ تفصیل کے ساتھ ہم اپنے خیالات کو ان کے سامنے کر دینا چاہتے ہیں

قوم میں حرکت ہمیشہ پیدا نہیں ہوتی، اور دریا میں ہر روز طوفان نہیں آتے۔ یونیورسٹی کے لئے تمام ہندوستان میں جو عام صحیح جوش پیدا ہو گیا تھا وہ ایک غیر معمولی اور ہماری روزمرہ کی افسردہ زندگی کا ایک مستثنیٰ واقعہ تھا۔ یہ کس کو اسید متھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کسی دن ایسی جنبش بھی پیدا ہوگی؟ لیکن یہ خیال کس درجہ درد انگیز ہے کہ اثنا قیمتی جوش محض ایک وجود بے روح اور لفظ بے معنی کے پیچھے غارت کر دیا گیا۔ اور قومی حرکت کی بہترین فرصت جو نہیں معلوم پھر کتنے دنوں کے بعد ہاتھ آئے بھی یا نہیں بیکار ضائع ہو گئی

اور قومیں جس جوش سے ملی آزادی و حریت جیسے عظیم الشان مقاصد کا کام لیتی ہیں آپ نے اس سے اور زیادہ اُسرو غلامی کی زنجیریں بھاری کر دینے کا کام لینا چاہا اور قروں کے رہنما جماعتوں کو بیدار کرنے میں تاکہ اٹھ کر چلیں، آپ نے ہمیں پیٹھے سے اٹھایا تاکہ اور سلا دیں۔

آج تک مسلمانوں میں کوئی بھی تحریک ایسی پیدا ہوئی ہے جو شہر وں کے لئے کر قصبوں اور دیہاتوں تک پھیل جائے؟

جس کا دلولہ ان پڑھ دیہقانوں اور جاہل دیہاتیوں تک کے دلوں میں پیدا ہو جائے، ہر گھر میں اس کا چرچا ہو اور ہر جگہ اس کا جوش و خروش

کوئی طبقہ اور کوئی فرقہ اس سے خالی نہ ہو، نیردوں پر اس کے لئے وعظ
 کہا جائے اور خاتقاہوں میں اس کے ذکر پر حال و قال ہو۔ پرانے خیال
 کے دنیا سے بے خبر حلقے جو یونیورسٹی کے لفظ کا صحیح تلفظ تک نہیں کر سکتے
 دیہاتوں اور قصبوں میں مولود اور وعظ کے لئے چندا کر کے روپیہ جمع کر دیں
 اور پھر اسی روپیہ کو مولود کی جگہ یونیورسٹی فنڈ میں بھیج دیں۔ یونیورسٹی کا قافلہ
 جہاں جہاں سے گزرے، لوگ جوش و نشاط سے سنبھڑ ہو کر اس طرح قدم لینے
 کو دوڑیں، گویا ملائے اعلیٰ اور قدوس بیان عام بالا عرش الہی کو چھوڑ کر
 دنیا میں اتر آئے ہیں تاکہ اپنے ہر دے کے سایہ نورانی میں لے کر مسلمانوں کو
 پھر دونوں جہاں کی بادشاہت بخش دیں۔ الہی نہ ملنی والی یونیورسٹی ملی بھی نہ تھی
 لیکن کروڑوں انسان اس طرح خوش ہو ہو کر لوٹتے تھے گویا ہندوستان کی
 سلف گورنمنٹ کے (سیگنچر) پر شہنشاہ انگلستان کے دستخط ہو گئے
 ہیں یا ترکی میں پارلیمنٹ کے قائم ہونے کا پہلا روز مسرت طلوع ہوا ہے
 ہم رو سکتے ہیں مگر اپنے آنسو ہر شخص کو دکھانے میں سکتے۔ جب سوچتے
 ہیں کہ بد بخت ملت کا اس درجہ قیمتی جوش کس بے دردی سے ضائع
 کر دیا گیا تو ”وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ“ ”وَلَا تَكْفُرْ“ ”وَلَا تَكْفُرْ“ کہ ہمارے دل
 کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور حیران رہا جاتے ہیں کہ رہنمایان ملت
 کی اس غلط روی کی نسبت کیا نہیں؟ ہمارے ہمدرد واضح نصیحت کرتے ہیں
 کہ نرمی اختیار کر دو لیکن انھیں ہمارے دل کی سوزش کیا معلوم؟ باتو ہماری
 آنکھ ہم کو دھوکہ دیتی ہے اور یا پھر صاحبان بصیرت دنیا میں ناپید ہو گئے۔

بنیادی گمراہی

لیکن مسجد کی محراب کا بنار اگر سیدھا نہیں تو پہلے اس کی بنیاد کو دیکھنا چاہئے۔ افسوس کہ ہمیں یونیورسٹی کا معاملہ پیش آجانے کی وجہ سے بہت نہ لی اور مسلمانوں کی پوزیشن پالیسی پر ابتدا سے سلسلہ وار بحث کرنے کی جگہ ایک درمیانی باب شروع کر دینا پڑا۔ یہاں مختصر اشاروں سے کام لیں گے درحقیقت مسلمانوں کی گمراہیوں کی ابتدا اسی وقت سے ہے جب انھوں نے چلنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ بنیادی غلطی یہ تھی کہ اپنے تمام کاموں کے لئے گورنمنٹ پر اعتماد رکھنے کا راستہ اختیار کیا اور بغیر اس کے بیٹھنے کی عادت ہی نہیں ڈالی۔ جب مرغ دام میں آنے کے لئے مضطرب ہو تو ضیاء کیوں غفلت کرے؟ اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ابتدا سے لے کر آخر تک محض ایک کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔ جس کی ڈوریں پردے کے اندر تھیں اور بچانے والا اپنی بازی گری کے مصاح کے مطابق جس طرح چاہتا تھا ان کو بچاتا تھا۔

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ بالکل ایک نئے قسم کی دفتروں کو اپنے سامنے پاتی تھی۔ ایک طرف وہ "لارڈ مکالے" کی تعلیم دینے سے انکار نہیں کر سکتی تھی، دوسری طرف تعلیم کے قدرتی نتائج اس کے سامنے تھے ملک ابھی حکومت کے خواب کو بھولانہ تھا، اور آگ بجھ چکی تھی، مگر جنگاریوں کے بھڑکنے کا ہر وقت خوف تھا، ایسی حالت میں وہ یہاں کے باشندوں میں سے کسی ایک عنصر کی امانت کی ضرورت محتاج تھی جو اپنے ملکی فوائد کو اس کی

حکومت کے فوائد پر قربان کر دئے مسلمانوں نے اس مقصد کے لئے اپنے
تئیں پیش کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ اڑ گئے کہ ہم کو اس قربانی سے محروم
نہ رکھا جائے۔ یہ مسلمانوں کے (ذبیح اللہ) کی قربانی تو مہی نہیں کہ :

آمد بزمیر تیغ و شہیدش نمی کنند

نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ہندوستان میں تمام حقیقی ترقیات کے لئے
ایک سخت روک، اور درمیان راہ کا پتھر بن کر رہ گئے اور از سر تا پا
ان کا وجود ملک کے لئے ایک بد بھیبی ہو گیا۔ گورنمنٹ کو اپنے ملکی مصالح
کے لئے جب کسی آلہ عمل کی ضرورت ہوتی وہ ان کے وجود کو ایک پتھر کی
چٹان کی طرح ہاتھوں میں اٹھا لیتی اور ملکی خواہشوں کے بیٹھے پر ٹکارتی۔

سب سے پہلے یہ ہوا کہ ملک میں کام کرنے والی اہلی جماعت یعنی
ہندوؤں سے مسلمان الگ ہو گئے اور اس طرح عرصے تک کے لئے ملکی
مطالبات کی قیامیابی سے گورنمنٹ مطمئن ہو گئی۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت تھی
کہ ان کو بیکار نہیں رہنا چاہئے، ورنہ بیکاری سے اکتا کر راستے کی تلاش میں
ضرور نکلیں گے۔ کوئی مشغلہ ایسا ہونا چاہئے جو عرصے تک ان کو اپنے میں
اُبھائے رکھے اور اہلی کاموں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دے
تعلیم کو مسلمان پہلے سے لئے بیٹھے تھے (اور یہ خیال فی نفسہ غلط نہ تھا)
اس لئے اسی اعلیٰ تعلیم کے بال و پر کو پھیلا کر ایک ایسا القندیل کا عجیب اخلقت
پر بند بنا دیا جو اپنے پردوں کو کھول دے، تو سورج کو زمین کی طرف چھانکنے
کے لئے کوئی سوراخ نہ ملے۔ مسلمانوں نے اس عجیب و غریب مرکب کو

ہماری سمجھا اور یقین کر لیا کہ ہمارے سفر معراج کے لئے آسمانی سواری اتری ہے۔ چالیس برس گزر گئے مگر اب تک اس مرکب کی لگام دیسی ہی ڈھیلی ہے جیسی پہلے دن تھی اور منزل لامکانی کا پتہ نہیں۔ قوم کی وہ قوتیں جو یقیناً زمانے کے قدرتی اثرات سے متاثر ہو کر ملی تحریکوں میں صرف ہوئیں، تمام تر صرف ایک اعلیٰ تعلیم کے شور و داد بلا کے پیچھے مٹا دی گئیں اور جب کہ ہم سے ایک دیوار کے فاصلہ پر ملک کی جائز آزادی، ملکی حقوق کے مطالبات، اعلیٰ قوانین کی تیئج و ترسیم، ملکی نظم و نسق کے مباحثہ انگا کی سرگرمیوں میں ہمسایوں کے جذبات و امیال صرف ہو رہے تھے، ہم اپنی کافر نسوں، اپنے بڑے بڑے مبھوں، اپنی شاندار تقریروں، اپنے قومی اخباروں کے صفحوں کے اندر صرف ایک افسانہ، تعلیم کی سرد لاش اٹھائے ہوئے پھر رہے تھے۔

ہمارے جذبات کے اشتعال کے لئے اگر کوئی تحریک تھی تو یہی تھی۔ اشار و ملت پرستی کی دعوت کا پیام تھا تو اسی دسترخوان پر۔ جوش و ہنگامے کا ظہور تھا تو صرف اسی کے لئے۔ قوت نفوذ کی نمود و نمونہ تھی تو اسی افسانے کے دہرانے کے لئے۔ قوی اگر وطن پرستی کے نئے میں جو رقص تو ہم تعلیم کے خماریں انگریز امیال پہنے تھے۔ ہمارے اگر ملکی آزادی کے آفتاب کے نیچے کھڑے تھے تو ہمارے سر اور چہرے تعلیم کی شبنم سے میگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اگر خود فردوسی و قربانی کے انگارے تھے تو ہم تعلیم کی سرخ گولیوں سے کھیل رہے تھے۔ ساری

دنیا اس تعلیم کے اندر تھی یہی اعلیٰ پالیسی تھا۔ اسی سے قومیں بنتی اور بگڑتی ہیں
 انگلستان نے اسی کے برتنے بر پارلیمنٹ لی۔ خزانہ میں جو لوگ راستوں میں
 آزادی کا گیت گاتے ہوئے پھرتے تھے، وہ اعلیٰ تعلیم کی سندیں اپنے سینوں
 پر لگائے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی تعلیم ہی نے انقلاب کرایا۔ ترکی کو جب
 یورپ کے تمام درجے کر چکی اس وقت عبدالحمید نے یلدیز میں بلا کر
 خود پیار و محبت سے کہہ دیا کہ اب پارلیمنٹ لے لو پس ہندوستان
 میں بھی ہم کو یہی کرنا چاہیے !
 گمراہی کا دوسرا مشغلہ

اعلیٰ تعلیم کی گرہ سلجھانے میں ہم نے چالیس برس سے زیادہ صرف کردئے
 اور یہ ایک ایسا مشغلہ ہمارے لئے رہا جس نے کسی دوسری طرف نظر اٹھانے
 کی اہلیت نہ دی، لیکن انسان جو سونے اور جاننے، دونوں کے لئے بنایا گیا ہے
 ممکن نہیں کہ سوتا ہی رہے۔ چالیس برس کے مہینے انوم کے بعد اب خود بخود
 طبیعتیں کر دہیں لینے لگیں، سونے کے رات دن کے منظر سے کہاں تک آنکھیں
 بند رہیں۔ بالآخر تعلیم کے افسانے کی خواب اور قوت گھٹنے لگی، اندر مسلمان بڑے
 اب اس مشغلے سے اکتا گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ ہندوستان کے آئینوں
 پر پھٹنے کے لئے رفارم اسکیم کا رومال جیب سے نکال رہی تھی اور ملک میں ایک نیا
 انقلاب ہونے والا تھا۔ اس وقت ممکن تھا کہ مسلمان چالیس برس سونے کے
 بعد ہشیاری کی آنکھیں کھول دیتے اور ہندوستان کی مسلسل جاگنے والی
 قوم، ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جاتے کیونکہ ہم نے مشغلہ تعلیم میں اب

زیادہ کچی باقی نہیں رہی تھی اور پولٹل کاموں کا اینجملک بھر میں صرف ایک کانگریس ہی تھا۔ پس ضرور ہوا کہ اب تبدیل ذائقہ کے لئے کوئی نیا کھانا ہماری گرد میں ڈال دیا جائے اور کچھ دنوں اس کے ساتھ کھینے میں کاٹ دیں یہ کھانا ہماری نئی فضالت یا غفلت بیداری نہ "مسلم لیگ" تھا، جو زمانے کے نئے تغیرات کا لحاظ کر کے پائٹکس کے ہم سے منسلک پذیر ہوا اور اس کی ابتدا یوں کرائی گئی کہ ہم ایک نئے لیڈر کی رہنمائی میں ڈیپوٹیشن لے کر شملہ کی طرف روانہ ہوئے۔

مومن جلاہے کہے کہ ایک پارسا کے ساتھ

مسلم لیگ

اتر اب زمانے نے بلٹا کھا یا ہے اور تم پائٹکس میں آنا ہی چاہتے ہو تو یہ کیا ضرور ہے کہ تم کو سونے کی اشرفی ہی دی جائے؟ تمہارے پہلانے کے لئے پینٹل کا ایک فلکروالچی بہت ہے۔ تم ہر چھیلی چیز کو سونا سمجھنے کے لئے کے لئے تیار ہو تو تم کو سونا کیوں دیا جائے؟ اب مسلمانوں کو کھینے کے لئے ایک دوسرا کھانا مل گیا اور زمانے کے تغیرات، قدیمی افسانے کی بے مزگی اور تعلیم کے نتائج نے طبیعتوں میں جو حرکت پیدا کی تھی اس کو گردش کے لئے باہر جانا نہ پڑا، خود اپنے گھر کے اندر اسی نام کا ایک دائرہ مل گیا۔

افسوس کہ ہم مدتوں کی غفلت کے بعد پائٹکس میں آئے بھی تو اپنی قوت اور دن کی انگ سے نہیں، بلکہ

آنہم بسی غمرۃ مردم شکار دوست

نئے پائینکس کی تعلیم

گو (مسلک) کا قیام کسی پائینکس بیداری و تلاش کا نتیجہ نہیں تھا، اور کوئی ملکی یا ملی قوت اس کے اندر نہ تھی، لیکن تاہم پائینکس کی حرمت کا فتویٰ منسوخ ہو چکا تھا اور کم از کم جمود میں ایک حرکت ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کو اگر کوئی ہاتھ پکڑ کر باغ میں پہنچا دے تب بھی آپ اسی طرح پھولوں کی بو باس لے سکتے اور پھولوں کو توڑ سکتے ہیں، جیسے وہ شخص جو خود اپنی خواہش سے چل کر پھولوں کے عشق میں آیا ہو۔ اہل شے باغ میں پہنچا ہے اگر مسلمان لیڈر قوم کو چھوڑ دیتے تو عجب نہیں کہ یہی کھیلنے کا پتلا زندگی کی طرح حرکت کرنے لگتا مگر جس مرکب کی لگام خود اپنے ہاتھوں میں نہ ہو اس کی نسبت یہ سوچنا لاعمل ہے کہ کس طرف لے گیا؟ یہ کیسی بد بختی کی بات ہے کہ پائینکس میں آئینے بعد ہی ہم کو پائینکس کی لذت پہنچی ایک دن کے لئے نصیب نہ ہوئی پائینکس میں آنے کے بعد اولین شے ملکی حقوق کا مطالبہ اور حکومت میں اپنا حصہ لینے کا سوال تھا۔ ہم اس راہ کے کنارے ضرور آگئے تھے لیکن کار فرماؤں کی یہ عیاری عقلوں کو حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ مٹا اس خوبی کے ساتھ وہاں سے ہٹا دئے گئے کہ خود ہم کو تو بیٹھنے کا حس تک نہ ہوا مگر شاہراہ مقصود اور ہم میں ایک تا پیدائش راتیاؤں کا مال ہو گیا۔ ہم کو سمجھا یا گیا کہ آج سے تیس برس پہلے جو اسباب پائینکس سے علیحدہ رہنے کے تھے، آج پائینکس میں آنے کے بعد بھی بدستور قائم ہیں۔ اس سبق کہنہ کو پھر دہرا لو! تعلیم کی کمی، تعداد کی قلت، محارثی کا فشار، عناصر کی مسابقت، ان تمام دائمی اور ابدی موانع میں سے

کون سی چیز دور ہو گئی ہے؟ اس لئے اگر ملکی حقوق کے میدان میں آؤ گے تو ہمسایہ قومیں تم سے بازی لے جائیں گی۔ پس تمہارا پالیٹکس یہی ہے کہ پہلے اپنے حقوق ہندوؤں کے مقابلے میں تو حاصل کر لو۔ انھوں نے اپنے غلبہ تعداد و تعلیم سے تمہاری ترقی کی راہیں ہم پر بند کر دی ہیں اور تمہارے قومی حقوق چھین کر غصب کر لئے ہیں۔ پہلی پالیٹکس یہی ہے کہ ان راہوں کو ہمسایوں کے حلوں سے محفوظ کر لو جو حقوق حکومت سے مل چکے ہیں ابھی وہی تم کو نصیب نہیں ہوئے نئے حقوق کے مطالبات کا کیا موقع ہے؟ یہ داروئے بے ہوشی کا ایک نیا چہرہ تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ حقوق طلبی کی جس طاقت کا نشانہ گورنمنٹ ہوتی نہایت آسانی کے ساتھ اس کا رخ ہمسایوں کی طرف پھیر دیا گیا، اور اس طرح ایک پوری قوم کے پالیٹکس میں آجانے کے بعد بھی اس کی پورے بیداری سے گورنمنٹ کے لئے کوئی خدشہ باقی نہ رہا۔

ہمارا انتخاب صرف ان تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ہے جو الحمد للہ اب اپنی حالت محسوس کرنے لگے ہیں۔ وہ خدا کے لئے انصاف کریں کہ یہ کیسی شدید غلطی؟ اور کیسی درد انگیز حالت تھی؟ جب کہ ہمارے ہمسائے ملکی فلاح و بہبود کی تدبیروں میں مصروف تھے، ہماری آنکھیں تمام ملک کی طرف سے بند تھیں۔ ہمارے ایک کروڑ بھائیوں کو اگر صرف ایک ہی وقت کا کھانا میسر آتا تھا، اگر تمام ملک کے افلاس کے روبرو ترقی مرض سے زار و نزار ہو رہا تھا، اگر ٹیکس کا بوجھ اس کی قوت برداشت سے بڑھا ہوا، اور زیادہ بڑھ رہا تھا، اگر زمینداروں کے مصائب سے ملک کا قلب ضعیف ہو گیا تھا، اگر

مظلوم کا شکر رموت و ہلاکت کا شکار ہو رہے تھے، اگر فوجی مصارف کے
 بوجھ سے ملکی خزانے کی کمر ٹوٹ گئی تھی، اگر ہمارے سالانہ بجٹ میں ہماری
 تعلیم کے لئے کوئی امید افزا جواب نہ تھا، اگر ملکی انتظام کے تمام بڑے
 دروازے ہمارے لئے بند تھے، اگر ریلوے ترسیع کے ٹھیکے انگلستان
 کو مل رہے تھے اور ملک آبپاشی کے بغیر جاں بلب تھا اور اگر قانون بھی
 اور انتظام راحت بخش نہ تھا تو ان تمام چیزوں کے لئے ہمیں باوجود ہندستان
 میں رہنے کے در دسراٹھانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ جھگڑے صرف ہندوؤں
 کے لئے تھے، اور ان میں بڑا اضافہ جرم و عیساں اور حکومت سے بغاوت
 تھا، صرف تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی تلاش کی مصروفیت ہماری زندگی کا اصلی
 کام تھی !

خاموشی مانگت بد آموز بتاں را

انصاف کہنا پڑتا ہے کہ اس میں گورنمنٹ کا قصور نہ تھا، بلکہ خود ہمارا
 تھا۔ گورنمنٹ نے کبھی حقوق طلبی سے باز نہیں رکھا، کبھی فریاد کرنے والوں
 پر اپنا دروازہ بند نہیں کیا، کبھی تعزیرات ہند میں یہ دفعہ نہیں بڑھائی کہ
 پوچھنا اور مانگنا جرم ہے۔ اس نے معقولیت سے مانگنے والوں کی بااقت
 عزت افزائی کی اور اکثر ان کی جراتوں کو اور تیز کیا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ
 اس کی پہلی نظر اپنے مصالح پر تھی، اور اگر ایک قوم خود ہی اپنے تئیں اس کے
 فوائد شخصی پر قربان کر دینے کے لئے تیار کر دے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ قبولیت
 سے انکار کرتی، علی الخصوص ایسی حالت میں کہ اس کی ضروریات کسی نہ کسی

ایک جماعت کو اپنے فرائض کے لئے قدرتی طور پر ڈھونڈ رہی تھیں۔ مسلمان
اوپر راہ میں کھڑے ہو گئے کہ اس خدمت کیلئے ہمیں کو منتخب کیا جائے۔ وہ
کیوں اس سے روکتی اور کیوں فائدہ نہ اٹھاتی؟

عود الی المقصود

گذشتہ تہید سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ ہمارا قدم جب کبھی اٹھا، غلط راہ
پر اٹھا جس زمانے نے ہندوؤں کا ہاتھ پکڑا تھا، اس کو ہماری رہنمائی سے
انکار نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح ضرور ہم صحیح راستے پر چل نکلے، مگر ہمارے لیڈروں
نے ہمیشہ ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی کھلونا ایسا ڈال دیا جس کے مشغلے میں ابھ کر
ہم کو اصلی کاموں کے اختیار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ پہلے اعلیٰ تعلیم میں
چالیس سال بسر کر دیئے، پھر جب اس سے اکتا گئے اور دیکھا کہ قابو سے نکل
رہے ہیں تو ”مسلم لیگ“ کا طلسم کھڑا کر دیا۔

مسلم یونیورسٹی

اس زنجیر کی آخری کڑی ”مسلم یونیورسٹی“ کی تحریک تھی، جو عین ایسے
موقع پر شروع کی گئی جب کہ ملک کے در و دیوار سے تغیر و تبدل کی صدائیں
اٹھنے والی تھیں اور ہندوستان خرد گورنمنٹ ہی کی جرات افزائی سے
ایک نئے دور میں اپنے تئیں دیکھنے والا تھا۔ اتنے طویل عرصے کی غلط روئی
کے بعد اب شاید صحیح راستہ کی تلاش شروع ہو جاتی، لیکن ”مسلم یونیورسٹی“ کی ایک
ایسی طویل داستان شروع ہو گئی جس کے بیچ در بیچ قصوں کو سنا کر اور ہر
طرف سے کان بند کر دئے گئے۔

نشتہ نیم شبی کا صبحِ خمار

(۱)

یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھوں میں اس وقت پہنچے گا، جبکہ لکھنؤ کی صحبتوں کو ڈیڑھ ہفتہ گزر چکا ہوگا، تاہم یقین ہے کہ لندن کی صلح کانفرنس کے بعد اگر کوئی تذکرہ ان کی صحبت میں ہوگا تو وہ لکھنؤ کی گزشتہ کانفرنسوں کی ”معرکہ آرائیاں“ ہوں گی۔
اطلاقی عقائد کی بہت سی گمراہیاں ہیں جن کے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، اور ہر موقع پر ان کا استعمال نہایت کثرت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ من جملہ ان کے ایک یہ خیال بھی ہے کہ صلح جنگ سے، اور امن شورش سے، بہتر حال بہتر ہے۔

لیکن غور کیجئے تو اس خیال میں جس قدر پتہ ہو، شاید اس سے کسی قدر زیادہ

مقدار میں جھوٹ بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ شورش سے سکون بہتر ہے، مگر کس شورش سے؟
 سمندروں کے تلاطم، اور ہواؤں کی خوفناک موجوں کی شورش سے نہ کہ اس زندگی
 کی شورش سے، جس کے جانے ہی موت کے سکون کا پیام آجاتا ہے!
 صلح بھی اچھی چیز ہے، مگر شاید وہ صلح اس سے مستغنی کر دی جائے، جس کے
 منیر (سرایڈور ڈگرے) ہوں۔

لکھنؤ کے ان جلسوں میں بھی امن کم اور شورش زیادہ تھی، صلح کا خیال محدود تھا
 اور جنگ کی طلب وسیع۔ امن و سکون اسٹیج کے کنارے تک ہی خالص نہ تھا، مگر جنگ کے
 دلوے سے ہال کی پوری فضا گونج گونج اٹھتی تھی۔

پس اس میں تو شک نہیں کہ یہ شورش بھی ادرا من شورش سے بہتر ہے۔ اس
 میں بھی کوئی دھوکا نہیں کہ یہ ایک جنگ کی سرگرمی تھی، اور صلح فی نفسہ جنگ کے اچھی
 ہے۔ لیکن چونکہ اس شورش سے پہلے جو سکون تھا، وہ دریا کا سکون تھا، جس سے
 مسافروں کی زندگی اور کشتیوں کی سلامتی وابستہ ہو بلکہ سکون تھا اس خواب غفلت
 کا، جو انسان کو زندگی کی حرکت سے محروم کر دیتا ہے، اور اپنے اندر موت کی ایک
 مثال کامل رکھتا ہے۔ (وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ) بلکہ وہ سکون تھا، اس جمود و مات
 اس نعش بے حرارت، اور اس جبر بے روح کا، جس کے لئے موزوں جگہ زمین کے
 اوپر نہیں، بلکہ اس کے نیچے ہے۔ اس لئے اگر بیداری، ہشیاری سے جینش، بھوشی
 سے، اور زندگی موت سے بہتر ہو، تو یقیناً یہ شورش بھی امن سے، یہ جنگ بھی صلح
 سے، اور یہ ہنگامہ دغوغا بھی خاموشی سے بہتر تھا۔ فَأَتْلُحْمُدُ لِلَّهِ الَّذِي بَعَثَ
 اِمَامَنَا (پس تمام حمد و تقدیس ہو اس قدیر و حکیم کے لئے، جس نے

ہم کو بیماری کی زندگی عطا فرمائی، حالانکہ ہم غفلت کی موت میں ساکن و ساکت پڑے تھے، لیکن اس عجیب سرائے بونفلوں میں ایک ہی دقت کے اندر سب کو خوشی نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ شادی و غم میں باہم تضاد رہا ہے، اور ایک کی خوشی دوسرے کے لئے غم ہی ہے۔ اور غور کیجئے تو ایسا ہونا قدرتی ہے۔

دینا میں رنج و خوشی اور شادی و غم کی حقیقت یہ ہے کہ پہلے میں "حاصل" کی منت ہوتی ہے، اور دوسرے میں رفتہ رفتہ "کافوس غم" کی تمام مثالوں کو ایک ایک کر کے ذہن میں لائیے، ہر مثال میں آپ دیکھیں گے کہ کوئی نہ کوئی شے آپ سے جاتی رہی ہو اور جانے ہی کا نام غم ہے۔ مفلس ادا اس رہتا ہے، اس لئے کہ دولت چلی گئی۔ بیمار ٹیکس ہوتا ہے، اس لئے کہ صحت جاتی رہی۔ یا لوسی میں سب سے زیادہ غم ہوتا ہے، کیونکہ ایک چیز "امید" تھی، جو اس سے چن گئی۔ اسی طرح خوشی کے تمام موانع یا دیکھئے۔ آپ ایک بڑے کھل محل یا کسی قیمتی موٹر پر بیٹھ کر خوش ہیں، اس لئے کہ دوست ہاتھ لگئی۔ بیمار کے لئے غم صحت کا دن کم از کم عید نہیں، کیونکہ اسے صحت مل گئی۔ پس شادی و غم کی تعبیر اگر زیادہ واضح لفظوں میں کی جائے تو یہی ہوگی کہ حاصل ہونے کا نام خوشی ہے، اور کھو دینے کا نام غم، بھرا کر یہ سچ ہے کہ خوشی، کسی شے کے حاصل ہونے کا نام ہے، تو آپ کو جب کبھی کوئی چیز ملے گی، ضرور ہے کہ وہ کسی کے ہاتھ سے نکلی ہو۔ عالم کائنات میں کوئی چیز بھی بیکار پڑی ہوئی نہیں ہے کہ آپ اٹھا لیں گے، ہر چیز کسی نہ کسی جگہ جڑی ہوئی ہے، آپ کو اٹھا لینے سے نہیں ملے گی بلکہ توڑنا پڑے گا، اور توڑیے گا تو آپ کا دامن بھرے گا مگر کسی کی آستینیں صاف خالی ہوں گی۔ آپ پھولوں کی ریح بر لوٹ کر خوش ہوتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ

کوئی نہ کوئی باغ اجڑا ہے، جب کہیں جا کو آپ کا بستر آباد ہوا ہے۔
(عرفی شیرازی) جو بجائے شاعر ہونے کے ایک اسرار شناس عظیم تھا، اس نکتے کو
کہہ گیا ہے:-

زنانہ گلشن عیشے کرا بہ نینسا داد؟

کہ گل بدامن مادرستہ دستہ می آید

(مرزا غالب) نے ایک دوسری بات کہی ہے، مگر آپ اسی نظر سے دیکھیں:-

ہر جادہ کہ از نقش پئے نت بہ گلشن

چاکیت بجیب ہوس انداختہ ما

پس دنیا میں آپ کا ہر نفع کسی دوسرے کا نقصان ہوا، آپ اپنے نفع
سے خوش ہیں تو دوسرا اپنے نقصان پر ماسف۔

لکھنؤ کے جلسوں میں جو کچھ ہوا، وہ دراصل ایک ابتدائی معرکہ جنگ تھا جس
نے مسلمانوں میں سب سے پہلے ایک نئے حریف مقابل کو دنیا سے روشناس کیا۔
قوم خوش ہو کہ اس نے طاقت حاصل کی، لیکن جن سے چھین کر حاصل کی، ضرور ہے
کہ وہ غمگین ہوں۔ آپ کو اگر اپنے بننے کی خوشی ہے تو کسی کو اپنے بجھنے کا ماتم
ہے۔ پھر اس کا کوئی علاج نہیں کہ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ قوم کی مت اب تک ایک
ہجاء داد منقولہ تھی جن پر چند اسخاص کا قبضہ تھا:- لائسل عامل فعل۔ یہ پہلا موقع ہے
کہ ایک نیا دعویٰ دار پیدا ہوا اور طاقت دکھلا کر اپنا حق لینا چاہا۔ آپ کسی کے
قبضے سے اس کی مقبوضہ ریاست چھیننا چاہیں گے تو وہ ضرور روئے گا۔ ضابطہ
و خود دار ہو گا تو کسی گوشہ مکان میں روال سے آنکھیں چھپا کر روئے گا، بے

اور بے قابو آدمی سڑکوں پر جھج جھج کر ماتم کریں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر معترض ہوں۔

دل ازمن، دیدہ ازمن، آستیں ازمن، کنارا ازمن

(۲)

حزنی سادہ دل امروزدگر چوں ہر بار
بہ سخن ہائے غریب تو قتل شد و رفت

فی الحقیقت ان جلسوں کے ذکر میں پہلی چیز جو سامنے آتی ہے، وہ لیڈروں کے اس اجباری و رہمبائی اقتدار کے طلائی بت کا پارہ پارہ ہونا ہے، جس کی مشرکانہ پرستش کے برسوں سے مسلمانوں کے اجتہاد فکر اور آزادی رائے کو فنا کر دیا تھا اور جس کے رعب و ہیبت کے آگے آج تک قومی قوت کو ظاہر ہونے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ قومی رائے اور آزادی خیال کی یہ ایک قوت تھی، جس نے پوری قوم کو ایک بے جان لاش بنا کر رکھ دیا تھا، لیکن لکھنؤ کے جلسوں میں اس لاش نے زندگی کی پہلی کروٹ لی۔ اور غالباً ہمارے لیڈروں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ چاندی سونے کی قوت کے علاوہ دنیا میں اور قوتیں بھی بستی ہیں۔

لیڈری کے اقتدار کا یہ بت عجیب الخواص تھا۔ یہ طلائی تھا، اس لئے جب کبھی شعلے کی چوٹیوں سے آفتاب نکلتا، تو اس کا جسم ایک شعلہ جوالہ کی طرح چمکنے لگتا، اس وقت دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں، لیکن تاریکی میں اس کی صورت مہیب تھی، اور دیکھنے والوں کے لئے خوفناک لکھنؤ کے جلسوں میں اس نے اپنی دونوں صورتیں دکھلائیں، وہ چمکتا بھی تھا اور مہیب بھی بنتا تھا،

لیکن نہ تو آنکھیں خیرہ ہوئیں، اور نہ لوگوں کے دل ہلے۔ بالآخر عاجز اگر مجبور ہوا کہ ایک عظیم انسان بت کا معبودانہ اقتدار و جلال چھوڑ کر، عام انسانوں کی طرح عاجزانہ کمزوریاں کی کوششوں سے کام لے، اور جس فوج کو میدان جنگ میں شکست نہ دے سکا اس سے سازش کے خیموں میں عہدہ برا ہو:۔ کَذَلِكَ نَبْطُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ہم اس امر کو انہی مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ اب دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے بارہا لکھا ہے کہ قومی کاموں میں تنظیم اور تشکیل کے لئے جس درجہ لیڈروں کی ضرورت ہو، اس سے کہیں زیادہ ان کا خود مختارانہ اقتدار ضرور اور مہلک بھی ہے۔ اسلام دنیا میں صرف اس لئے آیا، تاکہ انسانوں سے ان تمام اقتداروں کو چھین لے، جن کے ذریعے وہ تحکم اور جبر کے ساتھ غیر سولانہ حکومت کرتے ہوں۔ اور پھر خواہ یہ اقتدار دنیوی رؤسار کے ہاتھوں میں ہو، خواہ مذہبی بیٹواؤں کے حکومت کے ہاتھ میں ہو، یا کسی بت خانے کے پوجاریوں کے قبضے میں، کہیں ہو، اسلام اس کا دشمن ہے، اور اسکو شرک فی الصفات قرار دیتا ہے، کیونکہ اس کے نزدیک غیر مسئول ہونا اللہ کی صفت ہے پس جو شخص اس صفت کو اللہ کے سوا کسی اور طاقت میں تسلیم کرتا ہے، وہ خدا کی صفت میں دوسرے کو شریک کرتا ہے: مَا كَانَ لِوَجُلِ أَنْ يَتَّخِذَ اللَّهُ لِكُتُبِ رَحْمَتِهِ وَالْمَبُتَّةِ ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُفُّوا عِبَادَتِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳: ۷۳) وہ اس طرح کے اقتدار کو صرف "اللہ کے ساتھ مخصوص کر دیتا ہے:

(ان الحکم الا للہ) اور اسی کو دین قیم قرار دیتا ہے: ذَلِكَ الدِّينُ الْقَیْمُ بھرا اگر اس اقتدار کا حق دینی امور میں کسی شخص کو ہے، تو وہ صرف فوج "شوری" یا جماعت کا اجماع و مشورہ ہی، اور وہ بھی اپنے تمام اعمال میں احکام الہیہ کے تابع رہتے پر مجبور

پس یہ ایک شرک جلی تھا، جو ایک کھلی بت پرستی کی صورت میں تمام پیر واپن توحید پر مسلط ہو گیا تھا۔ ہر شخص (جو علی گڑھ) کو چند مہینے کے لئے روپیہ رکھنا ہو، ہر شخص جس کے پاس علم کی جگہ چاندی سونا ہو، ہر دولت مند جو کسی اجتماع کے موقع پر ایک ہر تکلف ڈر دے سکتا ہو، ہر رئیس جس کے پاس سازشوں کے لئے بہت سی ہوڑ کاریں ہوں، ہر قیمتی پوشاک جس کی جیب بھاری ہو ہر آواز جس کے گرد ایک مطلقہ تحمین ہو، غرض کہ ہر وہ شے جس کا وزن بھاری، اور رنگ سنہری ہو، اس امر کا قدرتی حق رکھتی تھی کہ سات کروڑ انسانوں کا اپنے تئیں معبود و سجدہ ظاہر کرے۔ اور قومی رائے، آزادی خیال، حق و صداقت، علم و فضل، تجربہ و دانشمندی، غرض کہ دنیا کی ہر شریف قوت سے جبراً اپنے آگے سجدہ کرائے۔ اس کی رائیں حکم ہوں، اس کا حکم شریعت ہو، اور اس کی شریعت غیر منسوخ ہو: **يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ**۔

ہم نے لکھا تھا کہ اولین منزل لیڈرس کی لیڈری کا نہیں، بلکہ اس کی ہیبت و سطوت کے تسلط کا بت ہے۔ ایک مرتبہ بھی اگر یہ دیونا گرا دیا گیا، تو پھر اس لبطا پیشوائی کے تمام مہرہ ہائے اصنام خود بخود سرنگوں ہو جائیں گے۔ پس لکھنؤ میں جو کچھ ہوا، وہ اس امر کا ثبوت بتین تھا کہ کم از کم اس مشرکانہ ہیبت کا بت تو قومی رائے کے گزر گراں سے مجروح ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ گزشتہ ایک سال کے عرصہ میں موسم کی تبدیلی کے آثار بالکل واضح اور ظاہر تھے، تاہم یہ پہلی شکست ہے، جو قوم نے افراد کو دی۔ توقع سے زیادہ اور امیدوں کے برخلاف، اور قومی زندگی کی یہ پہلی آواز ہے، جو مسلمانوں کی مجلس میں اٹھی، امید سے زیادہ قوی اور توقع سے زیادہ بلند، زنجیریں بہت بھاری تھیں، اور پاؤں مدتوں سے مقید، صیاد کا پنجرہ سخت تھا،

اور صید بظاہر کمزور، لیکن احمد اللہ کے رہائی کی پہلی کوشش کا تجربہ بے اثر نہ رہا، اور نہ
گو ٹوٹے نہیں مگر ڈھیلے ضرور ہو گئے:-

قائل تو ہو گئے ہیں وہ تاثیر عشق کے
موقع نکالنا سو یہ حکمت کی بات ہے

ہمارے عقیدے میں یہ انقلاب حالت ایک الہی کاروبار تھا، جو صرف اس
لئے تھا تاکہ عبرتوں اور بصیرتوں کا موجب ہو، تاکہ بہرے سنیں، اور اندھے بینا ہوں
تاکہ اس ابدی و ازلی قانون کا ایک نیا معجزہ تم دیکھو کہ حق اور صداقت کی آواز کو
کوئی قوت روک نہیں سکتی، اگرچہ شیطان کے بڑے بڑے مظاہر جمع ہو جائیں۔
اور سچ ہمیشہ سے ایک ابھرنے والا جوہر ہے، اگرچہ جھوٹ کی بڑی بڑی جٹانوں کو
اسے دبا دیا جائے۔

درخت سب جاتے ہیں، لیکن ہر شخص کی نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل بھی کھائے
پس نہایت مبارک ہے وہ ہاتھ، جو تخم پاشی کے بعد ہی اپنے دامن میں اس کے
پھلوں کو بھی دیکھے۔ مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منوخی سے شروع
ہوتی ہے۔ اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے، جن کو کانگریسی، باغی
بے وفائے قوم، مفید، اور اسی طرح کی بعض بعض اصطلاحات خاص سے یاد
کیا جاتا تھا، مگر قوم کی قوم صرف اس شریعت پر عامل تھی کہ لیڈروں کی گاڑی کھینچنے
ان کے ہر حکم پر سیمٹھنا و اطاعت کہہ کر سر بسجود ہو جائیں اور مسلمانوں کے لئے
غلامی و استبداد کی جو شریعت (بالیسی) انھوں نے مقرر کر دی ہو، اس سے سرو
تجاوز نہ کیجئے کہ:- ”بے حکم شرع آب خوردن خطاست“

پھر غور کیجئے کہ اس نئی حرکت کے بیچ کو جگہ پکڑنے، پھوٹنے، اور ابھر کر بلند ہونے کے لئے کتنی قربانی؟ اسباب ظاہری میں سے کیا سامان تھا، جو اسے میسر ہوا؟ زمین بظاہر ناموافق تھی، اور چند آوازوں کے سوا، جن کے دہانے کے لئے دولت اجتماع سازش، اور ریاستہ و حاکم نہ اقتدار، تمام قوتیں مستعد تھیں، کون تھا جس نے آبپاشی کی ہو؟ اعزاز ظاہری اور رسوخ و نبوی جن ہاتھوں میں ہے، ان میں سے ایک شخص بھی نہ تھا جس نے ساتھ دیا ہو مگر ایسے ہمہ آپ نے نکھڑیں دیکھا کہ درخت پیدا ہو چکا ہے، اور اس کی شاخیں فوخی اور نمند ہیں۔ پس یہ فی الحقیقت ایک بہت بڑی نعمت و احسان الہی ہے، جس کے شکر میں گردنوں کو سر بسجود اور زبانوں کو خرم و مسخ تحمید و تقدیس ہو جانا چاہیئے۔

ایک بڑی بصیرت جس کی صدا اس انقلاب حالت سے نکلتی ہے، یہ ہو کہ جو کوشش حق اور سچائی کے اعلان کے لئے کی جائے، خواہ زمانہ کتنی ہی ان کی مخالفت کرے، لیکن وہ دریا کے پانی کی طرح اپنی راہ خود نکال لیتی ہیں، اور کبھی لوگوں کی محنت ضائع نہیں جاتی، جو ادریں کی معیت چھوڑ کر حق و صداقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ کار ساز قدرت کا وعدہ ہو کہ: **رَافِعِیْ لَا اُظْلِمُكُمْ عَلٰی عَامِلِیْ مِنْكُمْ مِّنْ شَيْءٍ** (میں کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع ورائگاں نہیں کرتا، قرآن کریم میں ہر جگہ ”وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ“ فرمایا گیا ہے، اور اس کے بعد ہی معنی میں کہ دنیا میں انجام کار کی کامیابی صاحبان حق و معروف ہی کے لئے ہے۔

پس ہم ان تمام حامیان حق و معروف کو مبارک باد دیتے ہیں، جنہوں نے پچھلے سال قوم میں آزادی خیال اور طلب حقوق کی تحریک پیدا کرنے میں حصہ لیا۔

اُس نصرت فرمائے حق نے کس قدر قلیل عرصے کے اندر ان کی سچی مشکور کے نتائج حسنہ ان کو دکھلا دیئے۔

حق و صداقت کا اعلان کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے بہت بڑی صبر و انتظار اور تحمل و ضبط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتنی پاک ہمتیاں ہیں، جنہوں نے دنیا میں اس کے منہج بوتے، اور اپنی بڑی بڑی زندگیاں اس کی آبپاشی میں صرف کر دیں پھر کتنے جانفروشان حق و صداقت ہیں، جنہوں نے اپنے اشک ہائے امید اور خونِ ہمتِ حسرت و آرزو سے اس منہج کے پودے کو سیخا، مگر بایں ہمہ ان کی آنکھوں کو اس کے برگ و بار کا منظر دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نسلوں پر نسلیں گزر گئیں، جب کہیں جا کر وہ منہج بار آور ہوئے۔

آج مسلمانوں کی اعمال زندگی کی ہر شاخ میں جو حالت ہو رہی ہے، وہ جاننا حق و صداقت سے ایسی ہی قربانیوں کی طالب ہے، جو صبر و انتظار کی انتہائی قوتیں اپنے اندر رکھتی ہوں، اور نتیجے کے لئے بے صبر نہ ہوں، بلکہ اپنے کام میں منہمک و مشغول ہوں۔ ہم ایک پوری قوم کو چاہتے ہیں کہ از فرق تا بقدم بدل دیں۔ انسانی اعمال و معقولات کا ایک نقشہ ہمارے سامنے ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کو یکسر اُلٹ دیں۔ ہمارے سامنے ایک سر بفلک عمارت ہے، جس کی دیواریں پہاڑوں کی چٹانوں سے، اور جس کی چھتیں لوہے کی سلاخوں سے بنائی گئی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ اس کو مسمار کر دیں، اور ایک ایسی نئی عمارت بنائیں جس کی چھت ہی نہیں، بلکہ بنیاد بھی نئی ہو۔ پھر اگر یہ ارادہ عظیم ہے، تو ضرور ہے کہ انتظار کی قوت بھی شدید، اور صبر کا پیمانہ بھی بڑا ہو۔ اس راہ کے مسافر کی تسکین کے لئے یہ بس کرتا ہے کہ راہ صحیح اور موصل الی المقصود

ہے۔ کچھ ضرور نہیں کہ ہمارے ہی قدم منزل مقصود تک پہنچیں۔ ہم نہ ہوں گے، مگر ہمارے
نقش قدم پر چلنے والے منزل مقصود تک پہنچیں گے، اور جو سفر کا خط ہم نے کھینچ دیا ہے۔
وہ ان کی کامیابی کے آخری نشان تک رہنمائی کرے گا۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ !
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ !

جب حالت یہ ہو، تو پھر اس انقلاب کے ظہور کو کیوں نہ ایک غیبی نصرت اور
ایک احسان الہی سمجھا جائے، جس کی کوششوں کے نتائج ایک سال سے بھی کم
عرصے میں ظاہر ہو گئے، اور جو بیچ سا لہا سال کے انتظار کی برواشت کے بعد رگ بار
لاتے ہیں، انہوں نے چند مہینوں کے اندر ہی اپنی ٹہنیاں پھیلا دیں؟ البتہ یہ جو کچھ ہوا
محض ایک ابتدائی منظر نصرت، اور مستقبل کا پہلا نمونہ تھا، پھر بغیر صرف ایک محدود دائرہ
کے اندر ہوا، اور ابھی ہمارے اعمال و مقصدات کے وہ اصل اصول باقی ہیں، جن کے
مقابلے میں جماعتوں اور گروہوں کے متفقہ جہاد کی ضرورت ہو۔ میں اس تغیر کو اس
محاذ سے یقیناً اہمیت دیتا ہوں کہ وہ تغیر تھا، اور مسلمانوں کی حالت مدقوں سے
غیر منفیر ہو رہی تھی۔ پس تغیر خواہ کتنا ہی ابتدائی اور ضعیف ہو، مگر جہاد کی شکست کا تجربہ
ہے۔ ورنہ اس بارے میں میرے خیالات بہت وسیع، اور پیش نظر مقاصد بہت بلند
ہیں۔ مشکل ہے کہ اس وقت آپ کی نظریں وہاں تک پہنچ سکیں۔ میں صرف اس نقطہ پر
توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ کام کرنے والے اپنے کاموں کے لئے اس تغیر کے تذکرے
سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی کوششیں اگر ابھی سا لہا سال تک ایک ادنیٰ سا تغیر بھی
پیدا نہ کر سکتیں، جب بھی ان کو مایوس نہ ہونا تھا، چہ جائیکہ اس قدر جلد ایک سخت

دنیا میں تغیر ان کو کامیابی کا مزدور دے رہا ہے، اور یقین دلا رہا ہے کہ محنتوں کے نتائج کے لئے زیادہ صبر و انتظار کی آزمائش نہیں ہو، پس وہ اپنی ہمتوں کو اور قوی کریں، عمل کی رفتار تیز کر دیں، اور اپنے ایمان و یقین میں محکم تر ہو جائیں۔ کل سعی کی اس لئے ضرورت تھی کہ بہر حال سعی کرنی چاہیئے، لیکن آج اس لئے ضرورت ہے کہ خود نتائج بھی سعی کی دعوت دے رہے ہیں، کل تک لوگ غافل تھے، پس ضرور تھا کہ غفلت ہو سار کیا جائے، مگر اب لوگ آنکھیں مل رہے ہیں، پس ہم کو بھی اٹھنے والوں سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

بایں کہ کعبہ نمایاں شود ز بامشیں

کہ نیم گام جدائی ہزار فرسنگ ست

اگر ہوا موافق نہ ہو، دریا مہربان نہ ہو، اور تارے رہنمائی نہ کریں تو کشتیان کیا کر سکتا ہے؟ لیکن تاہم اگر کشتی سلامت جائے تو نشی چلانے والے کا حق تعریف کوئی جہین نہیں سکتا جو تغیرات اس وقت مسلمانوں کے خیالات میں ہوئے ہیں، وہ ایک قدرتی نتیجہ ہے ان تغیرات کا، جنہوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا ہے، تاہم جن لوگوں نے ان تغیرات کا ساتھ دیا، اور ان کی صدا کے سننے کے لئے دلوں میں استعداد پیدا کرائی، ضرور ہے کہ اس معلول کے "علل" میں ان کو بھی شمار کیا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے نواب وقار الملک بہادر قبیلہ کے اس مضمون کا ذکر کرنا چاہیئے جو انھوں نے دربار دہلی سے آگے علی گڑھ گزرتے میں لکھا تھا، اور جس میں گو کسی اصول کی طرف دعوت نہیں دی گئی تھی، مگر مسلمانوں کے "مسلمہ قومی پالیسی" کے بت پر یقیناً اس سے ایک ضرب کاری لگی۔

اس کے بعد شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے بعض مضامین مسلم گزٹ میں لکھے اور اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ انہوں نے تغیر خیالات میں سب سے زیادہ مدد دی اسکے ساتھ ہی مسلم گزٹ کی اشاعت بھی قابل ذکر ہے، جو الحمد للہ کہ بدستور خدمت ملت میں سرگرم، و قلع قمع استبداد سیاست میں مصروف پیکار ہے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے يشوہ آفرین دوست مشر محمد علی کو بھی نہیں بھول سکتے، جنہوں نے فی الحقیقت یونیورسٹی کے معاملے میں آزاد خیالی کی تعلیم متصل اور پیہم رکھی، اور جس نے موجودہ حرکت کی تشکیل میں بہت زیادہ مدد دی۔

اس موقع پر یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہوا، محض سیاسی اعتقادات کا تغیر ہے، اور میں اس وقت کا منظر ہوں جب کسی صحیح مذہبی تبدیلی کا ثبوت بین نمایاں ہو، کیونکہ بغیر اس کے کوئی ہنگامہ تغیر میرے لئے تشفی بخش نہیں ہو سکتا۔ البتہ چونکہ نئی گرفتاری کے لئے کچھلی گرفتاری سے آزاد ہونا ضروری ہے، اس لئے اس تغیر کو بھی اس سلسلے کی ابتداء سمجھتا ہوں۔

یہاں تک تو ہم نے لکھنؤ کے جلسوں پر اس حیثیت سے نظر ڈالی ہے، جہاں تک ان کا تعلق تغیر خیالات، اور قومی رائے کے اظہار قوت سے ہے، لیکن اب اس نتیجے پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے جو اس معرکہ آرائی کے بعد پیدا ہوا۔

انفوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معرکہ ابتدائی، اور حریف نو آموز تھا، جنگ میں علانیہ ہتھیاروں ہی سے نہیں، بلکہ سازش و خدع کے چھپے ہتھیاروں سے بھی کام لیا گیا۔ اس لئے بایں ہمہ اظہار قوت و مقاومت قوم کو شکست ہی قبول کرنی پڑی۔ تاہم اس شکست کو شکست نہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ دراصل قوم نے اپنے حریفوں

سے شکست نہیں کھائی، بلکہ اس دھوکے میں آکر تلوار رکھ دی کہ اب مقابل حریف نہیں بلکہ خود اسی کے تیغ آزمائیں۔ حریفانِ شاطر نے جب دیکھا کہ دست و بازو مثل ہو گئے ہیں، اور آئندہ جنگ کی طاقت نہیں، تو پھر یہ تجویز کی کہ صلح کی ایک سازش گاہ منعقد کی جائے، اور قوم کو خود قوم کے بھیس میں آکر شکست دی جائے۔ بے خبروں نے یکایک ایک صدائے صلح سنی، خدا دان سمجھے کہ ہماری آواز ہی، حالانکہ اب ولہجہ بدلا ہوا تھا مگر آواز انہی کی تھی جو اب اس ظاہر کا باطن ہو گئے تھے۔

وہ حلقہ ہائے زلف کس میں ہیں اے خدا رکھ بیجو میرے دعوتِ دارنگی کی شرم اس اجمال کی تفصیل اب کیا کریں کہ وقت گزر گیا:-

تو خود حدیثِ مفصل بخوان ازینِ محل

تاہم نواب صاحبِ قبلہ نے یہ مضمون لکھ کر گزرا ہوا درق پھراٹ دیا ہے۔ نوٹڈین کیٹی کا پہلا دن فی الحقیقت "بزرگانِ قوم" کے لئے ایک "یوم الفزع الاکبر" تھا لوگوں نے دیکھا کہ الحاق "اور مسلم" کے انتساب کا جھگڑا چکانے آئے تھے، یہاں میجر حسین بگڑامی نے اختیارات کی ایک نئی بحث چھوڑ دی:-

یہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

جلے کے دفعوں میں اس تجویز کے استرداد و ترمیم کی پوری کوششیں کی گئیں۔ اور اسٹیج کے میدان میں جس قدر حربے دکھلائے جاسکتے تھے، ایکایک کر کے سب سے کام لیا، مگر معلوم ہوا کہ ڈھال چرٹے کی نہیں بلکہ پتھر کی ہے۔ نہ دور کے تیر کام دیتے ہیں نہ سامنے کی تلواریں۔ لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ تجویز کے خلاف تمام ہال سے ایک آواز بھی اٹھنے والی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر اس وقت

دوٹ لئے جاتے تو نتیجہ معلوم تھا کہ کیا نکلتا۔ اس لئے مصلحت نے سرگوشی کی کہ ایک دن کے وقفے کے بعد بقیہ کارروائی دوسرے دن پر ملتوی کر دی جائے، یہی وقفہ قیامت کا وقفہ تھا۔

کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

یہ جوش عام لوگوں نے طبقہ مسبذین کے خلاف جیسے میں ظاہر کیا تھا، اس میں شک نہیں کہ اس میں بے اعتدالی اور تعزیط ضرورت تھی، لیکن چونکہ گیند بہت زور سے زمین پر پٹکا گیا تھا، اس لئے اس کے دور تک اچھل کر بلند ہونے کی بھی شکایت نہیں کی جاسکتی۔ قدرتی امنگوں اور قوتوں کو دبا دیئے گا تو اور زیادہ اچھل کر نمودار ہوں گی۔ پھر جن لوگوں نے برسوں پھیلے پکوانوں سے اپنی اونچی دوکانوں کو سجایا تھا، اگر آج ایک وقت کے لئے ضرورت سے زیادہ نمک کھانے میں پڑ گیا، تو کم از کم ان کو تو شکایت نہ کرنی چاہیئے۔ اگر یہ بے اعتدالی بھی تھی تو بے اعتدالی ہی کے جواب میں:-

مختب خم شکست دمن سداد

سن بالسن والجر مروح قضا ص

دوسرا دن گذشتہ کے ماتم اور آئندہ کی فکروں میں بسر ہوا اور بالآخر اس "شام بلا" کی تاریکی قیصر باغ کی برجیوں پر نمودار ہو گئی، جس کی پردہ پوش تاریکی میں نہیں معلوم کیا کیا کچھ ہونے والا تھا۔ یاران شاطر نے اس تاریکی کی فرصت کو "مطلب براری" کے لئے غنیمت سمجھا کہ رات بھر کی مہلت میں کسی کی حریف نوازی اور نرم دلی جس قدر جرأت دلائے، منتہی و کامیاب ہو رہیئے، ورنہ پھر صبح ہجران کا

مطلعِ محشر نمودار ہونے کے لئے سر پر کھڑا ہے۔

کہ درِ تاخیر آفتہا، و عاشقِ رازیاں دارد

اسنے میں خبر اڑی کہ دہز آڑ کے ہاں (ڈنڈ) ہی۔ ہم نے کہا کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف، اور ان تقری چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف، حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہیے اس نادر کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟ جواب ملا کہ نہیں، شکست کا اعتراف ہی۔

چشم اگر اینست، و بار و اس، و ناز و عشوہ این،

الفراق لے ہوش و نقوی! الوداع اعقل دوس

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطباء نے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹہ کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح اٹھ بجے ہے، اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی، کہ صبح تک معدے میں فزوس رہے، اور آوازیں نکلیں تو خلق کی جگہ معدوں سے!

مگر انفس کہ دوسرے دن ہماری طبی معلومات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا۔ طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جتنی نفیس و لطیف ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے نیز اگر بغراط بھی کہیں ملیں، تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کے لئے تیار ہیں کہ "شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔"

(۳)

وہ شیفہ "کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی!"
میں کیا کہوں کہ رات بچھے کس کے گھر لے

مرغ اسیر کی گرفتاری اور صیاد بے مہر کی تغافل شعاری کا مرثیہ ہمارے شعرا
کی بدولت ایک دلچسپ داستان بن گئی ہو۔

فرض کیجئے کہ کوئی قیمتی چڑیا آپ نے ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں سے
پکڑی ہو، اور اس کا مضغہ ضعیف آپ کی مضبوط ٹھٹی میں اس طرح دبا ہوا ہو، کہ
ذرا انگلیوں کو اور سخت کیجئے تو غریب کی کاغذی پسلیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

لیکن یکایک آپ کو ایک ٹھوکر لگی، اور اب جو دیکھتے ہیں تو ہاتھ خالی ہو،
اور وہ صید ستم سامنے کے کسی درخت کی بلند ہٹنی پر بے فکر دبے پروا بیٹھا ہوا چھپا
رہا ہے، گویا اس طرح آپ کو جلجلیج دے رہا ہے کہ صیادی کا دعویٰ ہے، تو یہاں اگر
گرفتار کیجئے! آپ حسرت سے دیکھتے ہیں اور انقلاب حالت پر خوبا رہیں! اللہ
اللہ! اب سے چند لمحے پہلے جو مشتہر و بال اپنی زندگی و موت کے لئے ہمارے رحم
کا محتاج تھا! اب ہماری اس بے بسی لاپرواہی پر اپنی آزادانہ پرفشائیوں سے
طعنہ زن ہے!

بعینہ یہی حال فونڈیشن کمیٹی کے پہلے اجلاس کا تھا وہ صیادان سخت بوجہ
جنھوں نے قومی آزادی اور جماعتی رائے کی سنہری چڑیا کو رسول اپنی آہنی انگلیوں
میں دبا کر مقید کر رکھا تھا اور استبداد گرفت کا یہ حال تھا کہ ان کرنے کی بھی اجازت
نہ تھی، اب چشم تر اور نگاہ خوبا رہے دیکھ رہے تھے کہ ایک ہی جت برق رفتار

میں ان کے قبضے سے نکل گئی ہے، اور وہ ہاتھ، جو کل تک کسی کے پردِ بالِ مقدسے بھرے ہوئے تھے، اب خالی ہیں تاکہ جی بھر کے اپنی محرومی اور بے بسی پر ماتم کر لیں۔

ناکامی سے بڑھ کر ناکامی کے طعنوں کی تکلیف ہوتی ہے۔ ستم یہ تھا کہ یہ بے بہر

چڑیا اذکر چلی نہیں گئی تھی، بلکہ سامنے کے ایک درخت پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی اپنے پردوں کو ہلا ہلا کر بادِ دلالتی کہ بھی پرستے، جن کو آپ کے قبضے میں حرکت کی بھی اجازت نہ تھی، لیکن اب کس طرح ہوا میں پھیلائے جا رہے ہیں؟ کبھی گردن ہلا ہلا کر چھیپاتی اور اس میں یہ دلہ روز طعنہ مضمر تھا کہ کل تک ہی زبان تھی جو کسی کے خوف و ہمت سے ہلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی آج آپ کی زبان بھی اس کے سامنے کھلتے ہوئے کٹ جاتی ہے۔ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ۔

بہر حال انقلابِ حالت نے یذروں کے کیمپ میں ایک تہلکہ مچا دیا، پھیلی جنگ کی ہزیمت سامنے تھی اور آئندہ کی خوفناک ہزیمتوں کے تصور سے اس یذریٰ کے سومات "کاہریت لرزاں و ترساں تھا:

فَأَقْبِلْ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ
يَسْتَلْزِمُونَ، فَتَأْتُوا
يَا وَيْلَيْنَا إِنَّا لَكَا طَاغِثِينَ

پس آگے آپس میں ایک دوسرے کو ملامت
کرنے، اندر آخر کار سب بول اٹھے کہ ہائے
ہماری کم بختی! بے شک ہم بڑی نافرمانیوں
اور گمراہیوں میں مبتلا تھے!

(۲۸۰:۶۸)

تاہم ایک ہی رات درمیان میں باقی رہ گئی تھی، اور جو کچھ ہونا تھا، ضرور تھا کہ طلوعِ آفتاب کی روشنی سے پہلے ہی انجام پا جائے۔ پس جب سومات کے جھوٹے بتوں نے دیکھا کہ ہمارا عمل السحر کچھ کام نہیں دیتا، تو:-

قَالَ اَوْسَطُهُمْ، اَلَمْ اَقُلْ
لَكُمْ لَوْ لَا تَسْبِحُوْنَ (۱۸:۶۸)

ان میں سے جو سب سے بہتر آدمی تھا، کہنے لگا

کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ اپنے

(اس آخری) مبعودہ کی تسبیح و تقدیس کیوں نہیں کرتے (جو تمام مشکوٰۃ کو حل کرنے والا ہے؟)

یہ اس طرف اشارہ تھا کہ طاقتوں اور قوتوں کے اس "بت اعظم" سے کیوں نہیں

خواستگار اعانت ہوتے، جس کی سحر کار آنکھوں کی برقی بخشی سے اس مندر کے تمام

جھوٹے بڑے سنگی بت طاقت حاصل کرتے ہیں؟

اَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَ

الْعُزَّىٰ، وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ

الْاُخْرَىٰ؟ (۱۹:۵۳)

جس کا نام "مناٹ" ہے؟

وعامتجواب ہوئی اور بالآخر اعمال و اشغال مخفیہ کی یہ عظیم الشان رات اس

طرح شروع ہوئی کہ سب سے پہلے اس مقدس عمل تسخیر کو انجام دیا گیا، جس کا ظاہری

وسادہ نام ظاہری لوگوں کی زبان میں (ڈنر) ہے، اور ہماری اصطلاح میں :-

بَلْ هِيَ فِشْنَةٌ، وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

روایان صداقت شعرا، اور ناطقان عدالت آثار روایت کرتے ہیں کہ یہ

"عمل" ساڑھے بارہ بجے تک مجمع شرائط جاری رہا :-

اور جو کچھ کہ ہوا، قابل اظہار نہیں

"تسخیر کو اکب" کے عمل کی مشکلات آپ کو یا ہم کو کیا معلوم؟ ان سے پوچھئے

جنہوں نے اس فن کے علم و عمل، دونوں میں دستگاہیں حاصل کی ہیں۔ پھر مقصد

جیسا اہم ہوتا ہے، اتنا ہی عمل بھی قوی ہوتا ہے۔ اس عمل میں بڑی مشکل یہ تھی کہ قرآنِ اقدس نہیں بلکہ قرآنِ الفصدین کا سامان کرنا تھا، مرتخ اور زہرہ، دونوں کو جمع کرنا تھا، اور مشتری کے گرد حلقہ کھینچنا تھا تاکہ زحل کے فرمان سے باہر قدم نہ نکلے۔ بہر حال عامل کا پنجہ سخت تھا، مرتخ اور زہرہ، دونوں کو ایک دائرے میں جمع کر ہی کے چھوڑا، یہاں تک کہ زہرہ سے بائیں ہمہ ناز و عشوہ، وعدہ لے لیا گیا کہ میں حضرت مرتخ کے برج کے سامنے، اپنا رقص ہوش انگن نظارہ گیان ارضی کو دکھلائے گی۔ اس صحبت فکلی میں تو یہ عجائب و غرائب انجام پا رہے تھے، اور ادھر مین کے بنے والوں کی قسمت سرپیٹ رہی تھی:-

بگذر ز سعادت و نحوست، کہ مرا

ناہید بہ غمزہ کشت و مرتخ بفرہ!

اصل یہ ہر کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آوران آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں، ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہری ٹکڑوں کے لئے آگ کی آزمائش باقی ہے۔ ۲۰ دسمبر کے جلسے میں جبکہ لفظوں کی جگہ زبان سے نکلے نکل رہے تھے، تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کر کے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے:-

مجلس طرازیوں کے چکھاؤں کا سب مرنے

تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے!

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی، اور بہت جلد تنہائی کا "گوشہ خلوت" ہاتھ آگیا خلوت کے اسرار و نیاز محرابِ مجلس تک تو پہنچے نہیں، ہم ایسے غیروں کو کیا خبر؟

تاہم یہاں تک تو نام رادی متفق ہیں کہ (راجہ صاحب) نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور کہا کہ اگر ہر انہی چاہتے تھے تو ہمارے جانے کا اقرار کرتے ہیں۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟
 بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است!

کہا جاتا ہے کہ (راجہ صاحب) نے کہا تھا کہ "جب تک مسٹر محمد علی رام نہ گئے جائیں گے، کچھ نہیں ہوگا،" یہی سبب ہے کہ اس "خلوت شب" کی بارات کا دو لہا انہی کو نیا گیا، اور رات بھر سہرے کی تزیین و آرائش میں صرف ہو گئی۔ خیر، ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ رات بھر کی بیداری خلوت میں کیا کچھ کیا گیا؟ ہم تو صبح کی چشم خمار آلود، اور زلف پریشان کی ادائیں دیکھنے والوں میں تھے، اور یہ جواب دہنے میں آیا: تو اب پر شاکی بھی نہیں۔ ہمارے دوست کہ ہم وطن بلکہ ان کے سابق رئیس (یوسف علی خاں ناظم) کا فلسفہ اس موقع کے لئے ہمیں یاد دہنایا:-

ادائیں شب کی تو سب لوگ دیکھتے ہیں، مگر
 ہم ان کی گہری ادائیں محسوس کر دیکھتے ہیں

خیر! یہ تو اس شب وصل کی شام تھی، اس کے ذکر کو کہیں جلد بٹھائے کیونکہ اصلی پر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے، جبکہ رندان بادہ گسار نے "جملہ نمشی آراستہ کیا، اور موٹر کاریں بھیج بھیج کر ایک ایک شریک پیماں کی قسمتِ خفہ کو مزہ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا:

وقت آں نیست کہ در جرہ بخوابی تنہا!

"ذکر عیش بہ از عیش" یعنی:-

ذکر مصیب کم نہیں وصلِ مصیب سے!

جہنم تصور سے کام لیجئے کہ دسمبر کے آخری ہفتے کی سرد راتیں ہیں، یلاسے شب کی زلف کمر سے گزری چکی ہے، ایک کینچ خلوت میں صحبت بادہ پرستی گرم ہو اور گرم گرم سازشوں کی:

دھری شراب ہے، بیٹھے ہیں جا بجا سامانی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زہد کو الزام دیں، آپ ہی کو منصف بناتے ہیں کہ پہلا ایسی تو بہ شکن اور ولولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی دوست "کی تو بہ نے لغزش کھائی، اور اس جام عہد فراموش کو منہ سے لگاتے ہی بنی، جو کسی کے دستِ طلائی" نے پٹن کیا تھا، تو انصاف کیجئے، آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے؟ اور پھر یہ تو وہ مقام ہے کہ ہاروت و ماروت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے تھے:-

ساقیا مریخ از من، عالم جو اینہا ست!

خود صحبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ یہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی تھی۔ اللہ اللہ! جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی پراسرار صحبتیں! آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور رات کے دو بجے کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے کیسے خیالات میرے دماغ میں گزر رہے ہیں؟ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، زندانِ خاطر و کہنہ مشق کا ہجوم، اور بعض نوجوان دنو آموز مدعیانِ حریت، بھر شغل سے پرستی کا یہ عالم اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں؟

مست بر بستر من افتد و زندانِ داند

حالت مست، کہ بر بستر ہو نثار افتد

آپ ادھر کی سنئے۔ یہاں تو شب زندہ و اندانِ بادہ گساری مجمعِ خمار کی اعضا شکنوں میں کر دہیں بدل رہے تھے، اور ادھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس کا

ہاں تماشایان بزم سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصول مقصد کے لئے جو تدابیر گونا گوں و
 بوفلوں اختیار کی گئی تھیں، منجملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسہ کے لئے ٹکٹ مقرر
 کر دیا گیا، اور یہاں تک ہمیں بھی اتفاق تھا، کیونکہ آج اسٹیج پر پردے سے جو نیلیاں
 نکلنے والی تھیں، وہ تھیں اسی کے آموختہ یاد کئے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے
 سے زیادہ نہ تھیں، اس لئے ضرور تھا کہ رہا اصطلاح غلام، اس تماشہ گھر کے لئے
 ٹکٹ بھی مقرر کیا جائے۔ لیکن اس پر طرہ یہ تھا کہ ٹکٹ کے لئے پہلے تو یہ شرط لگائی
 گئی کہ صبح آٹھ بجے سے پہلے لے لئے جائیں مالا نکہ جاڑوں میں آٹھ بجے تک رات
 کی کھر سے فضا بھی صاف نہیں ہوتی۔ پھر ٹکٹ کے لئے تھیں گھر کے صدر دروازے
 پر ٹکٹ گھر کی کھر کی کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا
 جانا تھا کہ راجہ صاحب کے ہاں جائیے۔ راجہ صاحب کے ہاں سے صدا اٹھتی تھی کہ
 جہاں سے آئے ہیں، اسی طرف پچھلے پاؤں پھریئے۔

پاں سے داں، داں سے یہاں حکم ہوا اصل کی شب
 ہم اٹھاتے ہی بچھانے رہے بستر اپنا

اس سے غالباً مقصود اصلی یہ تھا کہ ان مشکلات کی وجہ سے آزاد خیال طبقہ
 کی مجاری میں جمع نہ ہو سکے۔ یہ بھی خبر اڑی کہ ایک جماعت کل کے لئے باہر سے ٹیکے
 بدلتی گئی ہے ایک جماعت رادی ہے کہ پولیس کی قوت سے بھی کام لینے کا ارادہ کیا
 گیا تھا۔ لیکن صبح کو پھر ان تمام انتظامات کے عمل میں لانے کی ضرورت باقی نہیں رہی
 کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے، کہ جب خیوں میں باہم
 صلح کر لی ہے، تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف؟ ناظم پاشا جب ساتھ

لگ گیا تھا، نو کامل پاشا بے فکر ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ فوج کی اصلی قوت اس کے ہاتھ میں ہو یا نہ ہو، لیکن اس وقت تو ضرور ہو۔

غرض کہ آٹھ بجے سے جلسہ منعقد، اور صاحبان حل و عقد کا منظر تھا، لیکن کسی بزرگ کا پتہ نہیں، اور اب پتہ لگے تو کیونکر؟ جس جنگ کے لئے یہاں فوج جمع تھی اس کی صلح رات کے دو بجے کی تارکی ہی میں انجام پا چکی تھی۔ اب جلسے میں شرکت کے لئے کیا ایسی جلدی آپڑی تھی، جو جلدی کی جانی؟ بہر حال ادھر رونمائی میں دیر، ادھر مشتاقان دید کی بے صبری، عجیب کش کش تھی:

ہوتا ہے از دحام تنہا اسی قدر!

ہوتی ہے صبری دیر کشود نقاب میں

خدا خدا کر کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بطور مقدمتہ الجیش کے تشریف لائے۔ گو خود ان کا آنا جلوۂ یوسفی نہ تھا، لیکن اپنے ساتھ نیم پیراہن کی بشارت ضرور رکھتا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے صحبت نیم پشی کا اعلان کیا، اور جھل میں منادی کرنے والے ”یو خا“ کی طرح خبر دی کہ ”راہ صاف کرو، کیونکہ آسمان کی باد شاہت اب قریب ہو!“

یہاں تک کہ دس بجے۔ صدفانظر ہائے منتظرہ، اور صدہائے مضطرب کی صفوں سے گذرتی ہوئی، ارباب حل و عقد کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور جملہ سازش

سازش کا لفظ شاید پہلے ہی کہیں گذر چکا ہو، لیکن یہ میری جانب سے نہیں ہو، بلکہ بحجۂ نواب صاحب قبلہ کا لفظ ہے، جو انھوں نے اپنے مضمون میں دو جگہ استعمال فرمایا ہے۔ منہ۔

کے تمام "عروسانِ شب زندہ دار" ایک ایک کر کے نظر نواز بزمِ داغ بن ہوئے۔ بہروں نے پہلی ہی نظر میں اربابِ نظر سے رمزِ فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں۔

شب تو شراب خوردہ، باتو صدنا بہاست

انہی میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے، صحبتِ نیم شبی کا خمار آنکھوں میں، اور شبِ بیداری کی افسردگی چہرے پر، جی میں آیا کہ بڑھ کے پوچھیں :-

تو شبانہ می نمائی، بربر کے بودی امشب ؟

کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خسار دارد !

لیکن ہمارے دوست نے اپنی ایک رات کی تریف پر درِ اداؤں کے لئے دوستوں کا ایسا حصارِ جوم پیدا کر لیا تھا، کہ اب اس کا موقع ہی کب باقی رہا تھا ؟

جو کام میں غیر کے ہو میں صرف

افسوس وہ دل رُبا ادائیں

در اصل اب فونڈیشن کمیٹی کی تمام بحث اگر اس پر ختم ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر میجر سید حسن بلگرامی کا رزولوشن منظور ہو یا غیر منظور۔ تمام دیگر مسائل طے پا چکے تھے اور اصلی پتھر جو اربابِ کار کو حصولِ یونیورسٹی کی راہ میں نظر آتا تھا، یہی رزولوشن تھا۔

اس رزولوشن کا مقصد فی الحقیقت کسی قومی یونیورسٹی کے لئے اصل

مبنی، اور بمنزلہ بنیاد کار کے تھا، یعنی گورنمنٹ کے اختیارات کا مسئلہ رزولوشن

کے الفاظ یہ تھے

”قوانین کالج کی دفعہ ۴۴ ضمن ۵۔ میں جو اختیارات اس وقت پیٹرن کو حاصل ہیں، ان سے زیادہ اختیارات یونیورسٹی کی صورت میں، حضور و السرائے کو بحیثیت چانسلر نہ دے جائیں۔“

بمحر صاحب نے اس تجویز کو بعد از ہزار سی و مجاہدت پیش کیا، اور تمام آزاد خیال طبقے نے (جو قوم کو قومی یونیورسٹی کے دھوکے میں ایک گورنمنٹ یونیورسٹی خریدنے سے بچانا چاہتا تھا، اور جس کی قیمت میں علی گڑھ کالج بھی ہاتھ سے جاتا تھا) ساتھ دیا اور آخر تک ساتھ دینے کے لئے تیار تھا۔ اب جو وہ تشریف لائے، تو اسٹیج پر آئے نہی میں نے ان سے پوچھا: فرمائیے کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ: صلح کاری کہ ساتھ کام کرنا بہتر ہے، اور مجھ کو یقین دلایا گیا ہے کہ بحالت موجودہ میرا رزولیوشن پاس نہیں ہو سکتا (حالانکہ آخری خیال درست نہ تھا)

میں نے اسی وقت ”اناللہ“ کا جو پرسوں کی شام کو زبان پر گزرا تھا، اعادہ کیا کہ اپنے قیاسات کی پوری تصدیق ہو گئی۔ اب صلح کی خواہش ہے، کو تمام یورپین ٹرکی ہاتھ سے جائے۔

بمحر صاحب کا نفرنس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے اور فی الحقیقت جس قابلیت اور صداقت کے ساتھ انھوں نے اپنے فرض کو ادا کیا، وہ ان کی عظمت کے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ پس بہتر تھا کہ وہ فونڈیشن کمیٹی کے اس بلاس میں حصہ نہ لیتے اور اس رزولیوشن کو پیش ہی نہ کرتے۔ وہ نئے نئے قوم کے سامنے آئے اور آتے ہی اپنے تئیں ایک آزمائش میں ڈال دیا، حالانکہ آزمائش کی راہ

دوسری ہے:-

عاشقی شہیدۂ زندان بلاکش باشد

۲۶ کی سہ پہر کو ہمیں خیال ہوا کہ کہیں بحر صاحب کی انتقامت :- ارباب مل و عقدہ کے مقابلے میں مرعوب نہ ہو جائے، ہم نے خیال کیا تھا کہ اگر وہ اپنی تجویز میں ترمیم پسند کریں گے، یا واپس لے لیں گے تو مٹا کوئی دوسرا شخص اس کو پھر پیش کرے گا۔ لیکن انہوں نے ۲۸ کی صبح کو حالت بدل گئی ہم ایک شعر یاد کرنے لگے جس کا پہلا مصرعہ یاد نہیں آتا تھا دوسرا مصرعہ یہ تھا:-

اگر ماند بنے ماند، بنے دیگر نمی ماند!

باوجودیکہ مجلس ”نیم شبی“ کے قول و قرار صلح سے دل مطمئن اور منہ سہلے ہوئی تھے، لیکن پھر بھی جنگ کے اجزا کا خوف دلوں میں باقی تھا اس کے لئے علاوہ اور بہت سی تدابیر مختلفہ کے جو بارہ دری کے دروازے اور خود اندر ہی کی گئی تھیں، ایک خاص تدبیر خود اسٹیج پر بھی ارادوں کی بخبری کر لی تھی۔ دو قطاروں کی مصعف پلیٹیں، پریڈنٹ کی کرسی اور میز کے چاروں طرف فرش پر بٹھائی گئی تھیں، اور ہمیں معلوم اس بغاری محاصرے کا (انڈیا فیل) کونسا تھا؟ بعض اشخاص جو کل تک جلوں میں اپنی پگڑیوں کے ذریعے ممتاز تھے، ہم نے خاص طور پر دیکھا کہ آج کے پیش آنے والے واقعات سے متنبہ ہو کر ترکی ٹوپی یونی فارم سے لیس ہو کر آئے تھے، شاید اس لئے کہ اردوں کے چکر ہائی انارٹے سے پہلے خود ہی انارٹیں یا اس لئے کہ جنگ کے موقعے جس متعدد جہتی اور چالاک کے خواباں ہوتے ہیں، ان کے لئے چوڑی کے ذریعہ گسل بیچ مناسب حال نہیں۔

ہم نواب (دوقار الملک) بہادر کے پیچھے ہی بیٹھے ہوئے تھے ہم نے دیکھا کہ اس حالت کو بطور خود نواب صاحب قبلہ نے محسوس فرمایا، اور ان لوگوں سے باصرہ کہا کہ اس طرح نہ بیٹھیں، غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ اس سے لوگوں کو شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ (مگر یہ آخری جملہ یعنی طور پر یاد نہیں ممکن ہے کہ کسی اور نے کہا ہو) لیکن وہ نبرد آزما یاں جنگ، جو آج اپنے دست و بازو کے جوہر دکھلانے کے لئے جمع ہوئے تھے، بھلا ان نصائح و احکام کی کب پروا کرنے والے تھے؟

اس ہجوم و حصار سے ایک خاص مقصود نظر ہر یہ نظر آتا تھا کہ اگر کوئی شخص مخالفت میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ ہو تو اس کو بروقت اس کا موقع ہی نہ ملے کیونکہ اول تو مقرر کے لئے گھڑے رہنے کی کہیں جگہ ہی نہ تھی، دوسرے اس محاصرے کی صفوف کی وجہ سے راہ مرور اس طرح بند ہو گئی تھی، کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے کئی منٹوں کی جدوجہد مطلوب تھی۔ خود ہم اور خواجہ غلام الثقلین اگر اتفاق سے بالکل اسٹیج کے کنارے پیشتر ہی سے بیٹھے ہوئے نہ ہوتے، تو تقریر کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہوتا، کیونکہ قطعی دیر میں مخالفت اٹھ کر کرنا رستے تک پہنچنے کی کوشش کرتا، اتنی دیر میں مذولیونشن پاس ہی کر دیا جاتا (جیسا کہ بعد کو بہ جبر کیا گیا)

ایک اور تدبیر خاص وہ تھی، جس کے ذریعے موافقت کے چیریز اور مخالفت کا شور و ہنگامہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی، یعنی اسٹیج پر بیٹھنے والی جماعت کا ایک طبقہ بچے مجلس کی مختلف قطاروں میں متفرق ہو کر بیٹھ گیا تھا، تاکہ وقت ضرورت مجمع کے ہر حصے سے ایک ایک صدائے موافقت اٹھ کر شور مچائے، اور علوم ہو کہ ہر طرف سے صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ اس انتظام کا سلسلہ آخر جمع تک

موجود رکھا گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے کی تمام کرسیوں پر بھی شریکان راز اشخاص بٹھائے گئے تھے، تاکہ اگر کوئی مخالفت میں تقریر کرے، تو معائنہ سے آوازیں اٹھنا شروع ہو جائیں، اور اس کے ہنگامے میں مجمع کی مخالف صدائیں مدغم ہو کر مفقود ہو جائیں۔ چنانچہ جو نہی آریہ بل خواجہ غلام الثقلین نے ترمیم پیش کی، گو وہ مخالفت میں نہ تھی، بلکہ صرف ترمیم تھی، تاہم شور و غل کی آوازیں معائناتی دینے لگیں۔

ہم نے یہ بھی سنا تھا (وللعهدة علی الملوی) کہ رات کے پیمان و عہد کے بعد بعض ممتاز آزادی خواہ اشخاص نے ایک کاغذ اپنی تمام جماعت میں بھرا دیا تھا، جس میں صحبت نیم شبی کے صلح نامے کا ذکر تھا، اور لکھا تھا کہ اب ۲۶ کے جلسے کے تمام آزاد خیال لوگوں کو اسی کی تائید کرنی چاہیے، اور کسی مزید مخالفت کی ضرورت نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک یہ درست ہو؟ مگر بارہ درمی کے دروازے پر جب ٹکٹ دیکھنے والوں اور آنے والوں میں ہاتھ پائی ہوئی تھی، تو ہم شور و غل سن کر باہر نکلے تھے۔ ہم نے اپنے ایک دوست کو دیکھا تھا، جن کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا، اور ایک حلقہ اجاب میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ہم نے آئندہ ارادوں کی نسبت پوچھا مگر وہ ٹال گئے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

قصہ مختصر یہ کہ بڑے بڑے سامان کئے گئے تھے، اور چونکہ صلح ہو چکی تھی اس لئے اب انتظامات خود اہنی کے ہاتھوں انجام پا رہے تھے، جو ۲ کی شام تک خود فریق جنگ اور آزاد خیال جماعت کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ اور دراصل افسوس بھی اسی کا ہے :-

نیم بزل اس نے گر جھوڑا، تو کچھ پروا نہیں پر یہ غم ہے، اعتبار دوست قاتل اٹھ گیا

بہر حال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا، اور اس تماشے کا ایک ہی ایکٹ شروع ہو گیا
 سب سے پہلے ہمارے عشوہ فرادوست مسٹر محمد علی باہر نکلے اور رزولوشن پیش
 کیا۔ وہ بیٹھے تو میجر (سید حسن) بلگرامی اٹھے اور نائیند کی ہر
 یکے بدزدی دل رفت و پردہ داری کے!

اب نہ ۲۶ کے محرک تھے اور نہ دیدار۔

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار!
 شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا!

۲۶ کی سہ پہر کو ہمارے دوست کا مزاج بہت گرم تھا، ان کی تقریر اتنی
 پر جوش تھی کہ اس کی بے اعتدالی ہم کو بھی ناگوار گزری اور ان کے کان میں کہا کہ
 ضدار اذرا لب و لہجہ زم کیجئے۔ علی الخصوص، یہ بات، ہمیں کچھ اچھی نظر نہیں آتی کہ سارے
 ”جوش محمد“ اور ”مین اللہ“ کے ضلع پر وہ صرف کر رہے تھے اور تقریر صرف صاحبزادہ
 آفتاب احمد خاں صاحب برنحی ارادت کرنے میں جاری تھی، حالانکہ بہتر تھا کہ بغیر
 تشخص و نقیص کے وہ سب کچھ کہتے۔ ہم کو اعتراف ہو کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں
 نے اس وقت قابل تعریف ضبط و تحمل سے کام لیا، اور اپنی تقریر میں ایک لفظ بھی
 نہیں کہا، اگر جلد ان کا مخالف تھا، مگر غصہ تو وہ شے ہے کہ موقع شناسی کی ہمت
 ہی کب دیتا ہے؟

لیکن آج ان کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ پرسوں جن لوگوں نے ان کے جوش
 کے انگارے اپنی آنکھیں روشن کی تھیں، آج ان کو آغاز تقریر ہی سے
 جمائیاں آنے لگیں۔ پرسوں ہمارے دوست کے ہاتھ میں شامپین کے جام تھے

آج انہوں نے چاہا کہ ٹھنڈے پانی ہی کو دان گلاس میں بھر بھر کر تقسیم کر دیں۔ سوڈا بھی نہیں۔

ہم نے تقریر کا پہلا لفظ ہی جکھڑا کر اپنے قریب کے بیٹھے ہوئے اجناس سے کہہ دیا تھا کہ آج یا تو صرف پانی ہے، یا پانی اس قدر ملا دیا ہے کہ بلوادر ذائقہ دونوں کا پتہ نہیں :-

مرا اے مئے فردش آں بخود می نیت

مگر در بادہ آبے کردہ باشی !

سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پر خدا کے لئے اعتماد کیجئے، لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی گو اچھی علامت ہو:

قسم سچی سہی، پھر بھی ضرورت کیا ہر کھانے کی

ہمارے دوست کو معلوم نہیں کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ قسموں اور عہد و پیمان میں نہیں ہے، بلکہ کسی اور ہی چیز میں ہے۔ سچا اعتماد پیدا کرنے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں، بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دینا سے لی ہیں۔ اس نکتے کو غائبانہ نے سمجھا تھا :-

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکارست

نجاہ اہل محبت تمام برگسندست

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بِیْلِ اللّٰهِ یُزَکُّیْ مَنْ یَّشَآءُ

قل اس کے کہ کوئی کچھ کہے، خود انھی کے ڈیوٹیشن کی تجویز کو سادی چک بک سے تعبیر کیا، اور ہجو آفیمز ابا اللہ جھڈا بکھا کا سلسلہ شریع ہوا، کیا یہ اس کا ثبوت نہ تھا کہ خود ان کا ضمیر بھی اس وقت عالم اضطراب میں ہے، اس لئے خود ہی اپنے سے کھٹکتے ہیں، اور خود ہی جواب دیتے ہیں؟ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آج جو کچھ زبان سے نکل رہا ہے، اس سے ہمارے دوست کو خود بھی حیا آرہی ہے :-

میں اپنی جہنم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

غرض کہ دودن کی فریقہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا؟ اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ بہتہ کیجئے کہ خیر الامور او سہلہ کفر و اسلام، دونوں کو اختیار کیجئے۔ اہرمن اور یزدان دونوں کو رام کیجئے ایک ہی طرف کیوں جھکئے جب دونوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے؟ صرف کہئے ہی کے کیوں ہو رہتے جب بت کمرے سے بھی رسم و راہ رہ سکے ایک ہاتھ میں زنا برہمن لیجئے اور دوسرے ہاتھ میں بختہ زاہد یعنی ایک اللہ ایمان سے ملائے اور دوسرا وقف معافہ نفاق، یعنی ایک ہاتھ میں جام غلامی دوسرے میں سندان حریت

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان بافتن

مَدَّ بَيْنَ بَيْنَ ذَلِكْ، لَا إِلَى هَوْلًا، وَلَا إِلَى هَوْلًا

مستحق بالشیوہ ہر کس موافق است
باماشرب خورد و بزاهد مناز کرد

تَوَافِقُ بَعْضٍ وَتَنَافُرُ بَعْضٍ، وَ
يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ
ذَلِكَ سَبِيلًا (۴: ۱۵)

بعض باتوں میں راہ ایمان اختیار کریں گے
اور بعض میں راہ کفر۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان
دونوں کے درمیان کئی تیسری راہ اختیار کریں
حقیقت یہ ہے کہ اس جمع اضداد کی راہ نہایت مشکل ہے۔ ایک ہاتھ میں
جام باطل پرستی رکھئے، اور دوسرے میں سندان حق پرستی، اور دونوں کو باہم
زور زور سے ٹکرائیے، مگر شرط یہ ہے کہ باطل کے جام بلورین میں بال تک
نہ آئے، اور سندان حق پرستی بھی ہاتھ سے الگ نہ ہو۔

ہر ہر سنانا کے ندانہ جام و سندان فتن

ادروں کی خبر نہیں، مگر اپنی کمزوری کا تو ہمیں صاف صاف اعتراف ہو۔
اس شعبہ بازارہ چابک دستی کی مشق کے لئے بڑی بڑی قابلیتوں کی ضرورت
ہے، یہ مقامات عالیہ ہم تہی دسترن کمال کو ابھی حاصل نہیں ہوئے۔

بمجر صاحب کی تائید کے بعد میں نے تقریر کرنی چاہی، لیکن خواجہ
غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ وہ رزولوشن کی نسبت ایک ترمیم قلمبند کر چکے
ہیں، اس کو پیش کریں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے
ساتھ تقریر کی اور دانشمندانہ طریقے سے بعض اختیارات مہمہ کے محفوظ رکھنے
کی ضرورت واضح کی۔ لیکن انتظامات مخفیہ سرگرم کار تھے۔ مخالفت کی آواز
اٹھنا شروع ہو گئیں۔

اس عرصے میں میں کیا سوچ رہا تھا؟ تمام قیاسات کی تصدیق ہو چکی تھی اور معلوم ہو گیا تھا کہ آزاد خیال پارٹی کی قوت کو شکست دینے کے لئے ایک مختصر مرکب سے الگ کر لیا گیا ہے۔ پھر اور جو تندرست ۲۴ کے مدعیان آزادی اور ہنگامہ فرمایا ان حریت کو اپنے قابو میں لانے کے لئے کی گئی تھیں، وہ بھی کامیاب ہو گئی ہیں۔ ایک پورا جال ہے جس میں سب کے پاؤں پھنس گئے ہیں۔ پھر کیا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر میں بھی خاموش ہو جاؤں؟

یہ ایک مفت کی ہر دل عزیز اور احسان مند ی تھی جو بغیر کسی نقصان کے حاصل ہوتی تھی، کیونکہ تمام مدعیان آزادی و حق پرستی سر جھٹکا چکے تھے اور اب اس حق و باطل کے مرکب و مہجوں ہی کا نام، حق خالص، تھا پس آزاد خیالی اور حق پرستی پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے اور ہر دل عزیز کی دولت ہاتھ آجاتی ہے حق بھی اپنے ہی حصے میں آتا ہے اور باطل کا دامن بھی نہیں چھوٹتا۔ پھر کیا معنی اگر جہد لمحے کی خاموشی سے مدتوں تک کام دینے والی کمائی پیدا کر لی جائے۔ یہ خیالات تھے جو اس موقع پر قدرتنا ہر دماغ میں گزر سکتے تھے۔ لیکن گو قوت کا ایک لمحہ کے لئے بھی دعویٰ نہیں تاہم ایسے ایسے نزعات ٹیٹا پنہ کے لئے تو احمد اللہ اپنے پہلو میں ایک قوت رکھتا ہوں۔ ہر دل عزیز کی خواہش سب سے بڑا شیطان "ہے جس کی ایک نگاہ گرم کے ساتھ ہی ہمتوں اور استقامتوں کی بڑی بڑی جٹائیں پانی ہو کر بہ جاتی ہیں، لیکن جس دن میں نیا بنی پہلی آواز بلند کی اسی دن سے اپنے پاؤں کو راد حق گوئی کی اس اولین زنجیر سے آزاد کر لیا اور استقامت کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میرے عقیدے میں ہر دلعزیز کا زیادہ صحیح نام منافق ہے اور یہ محال قطعاً ہے کہ ایک شخص حق گو بھی ہو اور پھر بزم ایمان و کفر، دونوں میں ہر دلعزیز ہو جو لوگ جہننا چاہتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے سامنے صرف دو ہی راہیں ہیں حق و باطل، کفر و ایمان، نور و ظلمت اور خدا پرستی و شیطان دوستی، انہی دو راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیں۔ یہ بالکل فضول کوشش ہے کہ دونوں میں سے کوئی نئی درمیانی راہ پیدا کی جاوے۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے ظاہر و باطن کو ایک رکھوں گا اور جو دل میں ہوگا اسی کو زبان کے حوالے کروں گا۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا جلد مجھے کسی سخت آزمائش میں ڈالے اور مجھے اپنے دل کی اسفامت کے آزمانے کا موقع ملے۔

وَعَلَى اللَّهِ، فليمتوكل المتوكلون .

مجھ کو بعض صاحبوں نے روکا کہ اب مخالفت میں تقریر کرنا بے فائدہ ہے۔ نواب اسحاق خاں صاحب نے کہا کہ ایک بات پر اب سب متفق ہو چکے ہیں۔ مخالفت سے کیا فائدہ؟ لیکن درحقیقت ان بزرگوں کی غلطی تھی۔ مخالفت اس لئے نہیں کی جانی کہ موافقت کی صدائیں بلند ہوں، اور لوگ جبر کا ہنگامہ بپا کر کے خیر مقدم کریں بلکہ صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ ایمان اور ضمیمہ کا حکم ہوتا ہے کہ ایسا کرو۔ یہ حکم بالکل اس سے بے پردہ ہے کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ کوئی سچی بات اس لئے نہیں نوک کر دی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ، سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اس کا دوست نہ ہو، البتہ یہ حالات و واردات اور میں جن کے سمجھنے سے

اپنے بزرگوں اور دوستوں کو ابھی عرصہ تک مجبور و معذور سمجھتا ہوں

حریف کاوش مزاحمان خوں ریزش نئی ناصح

بدست آدرگ جان و نشتر انماش کن

جس چیز کو آپ لوگوں نے ایمان سمجھا ہے اپنے عقیدے میں وہی کفر ہے۔ حق کی پرستش کے لئے اولین شے قربانی ہے اور آپ کا دماغ ابھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ساری عمر نفس کی پرستش میں کٹی ہے، اب چند لمحوں کے اندر آپ کو خدا کیسے دکھلا دوں؟ اپنی اپنی راہ ہے، اور اپنا اپنا مذہب :-

وَلِلنَّاسِ فِيمَا يُعَشِّقُونَ مَذَاهِبَ

آپ لوگ مجبور ہیں لیکن میری راہ میرے لئے چھوڑ دیجئے اور جہاں جا رہے ہوں جانے دیجئے۔ آج نہیں مگر کل بلاؤں گا کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کا ہاتھ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور منقول سے بڑھ کر کوئی حج نہیں عنقریب کھل جائے گا کہ میں کس راہ پر تھا اور آپ کہاں جا رہے تھے اور وہ مقلب القلوب اپنے بندوں کے دلوں کو میرے لئے کھولتا ہے یا آپ کے لئے؟ البتہ جن دلوں کو خدا اپنے نور ہدایت کے لئے چُن لیتا ہے ان میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ آج جس چیز کو دیکھتے ہیں تم کل دیکھو گے اسی معاملے کو دیکھو! جلعے میں صرف میں ہی ایک مجرم تھا جس نے مخالفت کی اور سب خاموش رہے۔ یا سرشاری نفاق سے ہی جھوٹے رہے، لیکن آج سینکڑوں ہیں جو سر پیٹ رہے ہیں پھر یہ کیا ہے؟ کیا یہ ایک الہی نشان

نہیں ہے جو حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کر دہی ہے اور تبارہی
ہے کہ کس کی زبان اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اس کو کھلواتا ہے اور کس کے
دل نفس کے قبضے میں ہے، جو انھیں ہلے نہیں دیتا۔ بھر کیا کوئی آنکھ ہے
جو دیکھے! کوئی کان ہے جو سنے! اور کوئی دماغ ہے جو سوچے؟

(۴)

رات اور زلف کا یہ افسانہ

قصہ کوتاہ، بڑی کہانی ہے

صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس پر آزمائش و امتحان
کے ایسے ایسے ہلاکت خیز وقت آئے ہیں جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے
سوا اس کا کہیں نشین نہ تھا لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل
صداقت اپنی حایموں کی کثرت و قلت اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ
بے پردہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی وہ تھا بے پاس اس لئے نہیں آئی کہ تمھاری
محتاج ہے، بلکہ اس لئے کہ تم اس کے محتاج ہو۔ اگر تم نے اپنے نہیں اہل
ثابت نہیں کیا تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے گی اور کسی اور نے شغل دل کو
اپنا نشین بنائے گی۔ اگر ۲۶۔ کی شام تک یونیورسٹی کے بارے میں ہمارا
خیال حق تھا، تو ۲۷۔ کی شام کو (ڈنر) کے بعد اور دو بجے کی خلوت بنم شہی
کی صبح کو وہ باطل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ۲۶۔ کی سہ پہر کو سچ تھا اور صدا
آوازیں اس کا استقبال کرتی تھیں۔ تو ۲۸۔ کی صبح کو بھی وہ سچ تھا گو ایک
آواز بھی اس کی حمایت کے لئے نہیں اٹھتی تھی۔ سچ کی کوئی اس کے حایموں

کی کثرت نہیں ہے اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سچ ہے۔ حق کی پریش
 کے ایمان کبف مدعوں کی استقامت اگر متزلزل ہے تو کیا مضائقہ؟ حق کی
 قوت کا استحکام متزلزل نہیں ہو سکتا۔ حقیقی قوت اسی میں ہے، اور جن مبارک
 ہستیوں کو اس کے علم کے نیچے جگہ مل گئی ہے، انجام کار فتح یابی بھی انھی کے
 حصے میں آئے گی۔

وَتِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَاهَا
 لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا
 فِي الْأَرْضِ وَلَا قِسَادًا
 فِي الْعَاقِبَةِ لِلْمُتَّقِينَ .

اور یہ آخر کی کامیابیوں کا گھرانہ کسٹے
 ہے جو دنیا میں بڑائی اور پیشوائی نہیں
 چاہتے اور نہ فساد پھیلاتے ہیں، اور
 یاد رکھو کہ انجام کار اللہ سے ڈرنے
 والوں ہی کے لئے ہے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں ڈوبتا ہے
 وَالَّذِي تَغْتَمِي بَيَدِهِ "میں بھی بعینہ اسی طرح دیکھ رہا ہوں کہ سچائی غیبت
 وکس پہرے سے اٹھتی ہے، اور فتح و کامرانی کا علم بن کر لہرائی ہے۔ یہ
 میرا یقین اور میری بصیرت ہے۔ آپ کو نظر نہیں آتا تو میں دکھلا بھی نہیں سکتا۔
 بہر حال میں نے مخالفت میں تقریر کی، اور زرم و خوشنما، پر ایشالی و
 ذوجنیں، اور معنی زہر آلود و الفاظ شہد نامہ کی جگہ، صاف صاف نفظوں میں
 اس کا ردوائی کو ناقابل اعتماد بتلایا۔ یہ پیشتر سے معلوم تھا کہ اس کا نتیجہ کیا
 ہو گا؟ مگر اظہار حق اور امر بالمعروف نتیجے کے خیال سے بے پروا ہو۔ وہ
 ایک فرضی ایمان اور محض تبسّد الہی ہے، اور وقت کے بدلنے اور لوگوں

کے منہ پھیر لینے سے اس کا حکم نہیں پھر سکتا۔ میرے لئے اس قدر کافی ہے کہ آج جبکہ بعد از خرابی بیمار، بڑی بڑی آوازیں ڈیپوٹیشن کی مخالفت میں اٹھ رہی ہیں اور طرح طرح کے لقب اس کو دئے جا رہے ہیں۔ الحمد للہ کہ اپنے نسیم اور ایمان سے شرمندہ نہیں ہوں اور دلوں کی عبرت اور نگاہوں کی بصیرت کے لئے یہ نشانی بس کرتی ہے کہ جس جگہ لوگوں کے قدم آج پہنچے ہیں، وہ عین اس وقت ہی میرے قدموں کے نیچے تھی، اور جو روشنی وقت گزر جانے کے بعد ان کو آج نظر آئی ہے، وہ عین وقت پر میں دنیا کو دکھلا رہا تھا۔ اس وقت تم نے نہیں دیکھا، اور اب اپنی آنکھوں کو مل رہے ہو۔ بہتر ہے کہ سروں کو ہٹو۔
 اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ

میں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ اس قدر جوش و خروش، جمع و اجتماع، اعدا و شورش، اور ہنگامہ رستخیز کے بعد یوینر سٹی کی سمت پھر چند شخصوں کے ہاتھوں میں دے دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ بھی کہا تھا کہ قوم کو اب اپنی قسمت کے فیصلے کے لئے کسی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔

اس آخری فقرے کی جچین بہت سخت تھی۔ بڑے بڑے کرسیوں کے وزنی بوجھ (جن کے لئے قرآن کریم نے بہت اچھی شبیہ دی ہے کہ "کاہنم خشب سندہ") لگے تمللا تمللا کر زانو بد لئے، اور مضطرب ہو ہو کے دیکھنے۔
 رَاٰتِ الَّذِيْنَ فِيْ فُكُوْبِهِمْ
 مَّرَمٌ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ
 نَظَرَ الْمُغْشٰى عَلَيْهِ مِنْ
 جن لوگوں کے دل مرض فکالت سے بیمار ہو رہے ہیں (اعلان حق کے وقت تم دیکھو گے، کہ تمہاری طرف مضطرب

الموت !

(۳۹ : ۴۰)

ہو ہو کے دیکھ رہے ہیں، جیسے کسی بڑے
کی بے ہوشی طاری ہو اور اس کی انگلیں
بھٹی کی بھٹی رہ جائیں۔

لیکن یہ بالکل بے فائدہ تھا:

مَنْ جَرَّبَ الْمَجْرُوبَ حَلَّتْ بِهِ النَّدَامَةُ

یہاں محض اشخاص پر اعتماد کا سوال نہیں ہے بلکہ حالات تبدیل اور اگر حالات
پر ہمیں اعتماد نہیں تو یہ کوئی بگڑنے کی بات نہیں ہے۔ اگر یونیورسٹی کی قسمت
کا فیصلہ ان اشخاص کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو ہمارے سامنے پیش کئے گئے
ہیں تو باوجود ان کی تمام کمزوریوں کے پہلا شخص میں ہوتا جو کہتا کہ اعتماد کر دو
اور راضی نامہ داخل کرو۔ یہ کہنے میں ہمارا کوئی ہرج نہیں کہ جناب سر (راجہ
صاحب محمود آباد) پر ہمیں اعتماد ہے۔ کون کہتا ہے کہ شخصاً میجر سید حسن بلگرامی
اور سر محمد علی لائق اعتماد نہیں؟ یہ تو ہمیں اس وقت معلوم نہیں تھا کہ نواب
وفار الملک بہادر ڈیپوٹیشن کی موجودہ صورت کے مجوزین میں شریک نہیں ہیں
ان کا نام ہی فہرست میں شامل تھا پھر قوم میں کون شخص ہے جو کہہ سکتا ہے کہ
نواب صاحب قبلہ لائق اعتماد نہیں؟ لیکن اصلی سوال یہ نہیں تھا۔ سوال یہ تھا
کہ کیا وہ حالات بھی قابل اعتماد ہیں جن میں یہ ڈیپوٹیشن مبتلا ہوگا؟ کیا اس فضائے
آسمانی پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں کی ہوائیں حوصلوں اور عزموں کی
چٹانوں کو سرمہ بنا کر اڑا دیتی ہیں۔

اور جب رایوں کی تبدیلی و تغیر کی ایسی مثالیں ہم کو دکھلائی جاتی ہیں

کہ ایک رات کے اندر جنگ کے خواستگار صلح کے آرزو مند ہو جاتے ہیں اور جو چیز شام تک سیاہ مٹی وہی صبح کو سفید بن جاتی ہے تو پھر ہمارا کیا قصور ہے۔ اگر ہم اعتماد و عدم اعتماد کے سوال کو جھپیڑنے ہیں؟ ہم تو اس قدر بے وقوف اور ہر فریب تازہ میں آجانے والے ہیں کہ چمک بک کی کیا حقیقت ہے ہم نے تو ایک جگہ ناز پر اپنے دلوں کو حوالے کر دیا ہے، لیکن آخر تاکے؟ کب تک نئی نئی آزمائشوں میں ڈالے جائیں گے۔

ہم زمانے کی یہ حالت دیکھتے ہیں کہ چار آدمیوں کی مجلس میں بھی کسی کو جرات نہیں ہوتی کہ جو کچھ دل میں ہے اس کو صاف صاف حوالہ زبان کرے، پھر ہم کو بتلایا جائے کہ خواستگاران اعتماد میں وہ نفوس قدسیہ کون ہیں، جو گورنمنٹ ہاؤس میں اس استقامت کو ظاہر کریں گے، جس کی مثال ۲۸ نومبر کو قیصر باغ کی بارہ درمی میں پیش کر سکے؟

ہم کو سب پر اعتماد ہے مگر اعتماد نہیں ہے اپنی بد بختی پر، اعتماد نہیں ہے اپنی محرومی پر، اعتماد نہیں ہے ان واقعات و حالات پر، جو اس ڈیپوٹیشن کو پیش آئیں گے، اور جن کے سامنے نہ کسی کی استقامت چلے گی اور نہ دھڑ عزم و آزادی۔ جماعت جتنی وسیع ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی اس کی قوت برہمنی جاتی ہے، اور جتنی کم ہوتی جائے گی، اتنی ہی رائے دینے والوں کے لئے دقیق برہمنی جاتی ہوگی۔ آپ ایک جلسے میں کھڑے ہو کر اور ایک بہت بڑی جماعت کے صدائے اتفاق سے قوی ہمت ہو کر جس طرح گورنمنٹ پر نکتہ چینی کرنے ہیں، کیا حضور دائرہ رائے کے سامنے بھی اسی طرح کر سکتے ہیں؟ ہاں

کر سکتے ہیں مگر وہ ہمتیاں اور میں، آپ نہیں ہیں :-
 ہر مدعی کے واسطے وارورسن کہاں
 جو لوگ جملے میں شریک تھے ان کو یاد ہوگا کہ ہمارے آخری الفاظ کیا
 تھے ؟ ہم نے کہا تھا :

”تم اس وقت نادانی اور غفلت کے ہاتھ تک گئے ہو مگر وہ وقت دور
 نہیں ہے جب اعتماد کی اس آخری آزمائش پر بھی تم کو متعصف ہونا پڑے گا
 ابھی وہ وقت نہیں آیا مگر تعصّف ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ
 العزیز اس کا اصلی وقت بھی آ رہا ہے۔ اس وقت ہم بھریک مرتبہ اپنے انھی
 الفاظ کو دہرائیں گے۔ وَ اِنْ اَذْرٰی اَقْرَبٰی اَمْ بَعِیْدًا مَّا تُوْعَدُوْنَ
 اور میں نہیں جانتا کہ جس وقت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا ابھی اس
 میں دیر ہے ؟ (۱۰۹:۲۱)

جملے میں اس وقت تین طرح کے لوگ تھے :- ”مجلسِ نمِ شبی“ کے مکرمان
 ان کے متبعین جو خود باریابِ محبت نہ تھے مگر ان کے نام احکام جاری ہو گئے
 تھے۔ اور کچھ نام لوگ جو اس ناگہانی انقلاب سے بالکل بے خبر تھے اور سادہ دل
 اور بے خبر حال ہونے کی وجہ سے کوئی آواز اور رائے نہیں رکھتے تھے۔

ان غریبوں کا عجیب حال تھا۔ ان میں بہت سے تعلیم یافتہ اور بہت
 سے سرگرم مدعیانِ آزادیِ حریت بھی تھے مگر یہ سب اس بیخِ تبر سے نہ خمی
 ہوئے کہ مسٹر محمد علی کو تحریک کرتے اور سچر صاحب کو تائید کرتے ہوئے
 دیکھا۔ ایک دن پہلے تک آزادی کا علم انھی کے ہاتھوں میں دیکھ چکے تھے۔

پس سمجھے کہ انھی حضرات کی طرف سے تحریک تائید ہو رہی ہے تو ضرور کوئی اپنے
 ہی مطلب کی بات ہوگی، گو ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

وہی کجخت مذاق تقلید جو کل تک پرانے ایڈیٹروں کی اندھا دھند اتباع
 کی صورت میں غامض سوز عقل و دانش تھا، آج آزادی کے عہد تازہ میں نئے
 لوگوں کے اتباع کی صورت میں فہم و دراست کی گردن کا طوق بنا۔ درودند
 کے ساتھ کہنا بڑا ہے کہ انہائے عصر کی غلامی بھی مقلدانہ تھی، اور اب آزادی بھی
 مقلدانہ ہے۔ کچھ حصہ نئے دور کا گزر جائے، اور مدتوں کے گرفتار تقلید و لغ
 (جو بالکل غل اور معطل ہو گئے ہیں) کچھ کچھ فکر و اجتہاد کے عادی ہو جائیں، تو
 پھر شاید ہر شخص اپنی سمجھ سے ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ وَمَا ذَلِكْ
 عَلَيَّ اَللّٰهُ بِعَزِيزٍ !

اب قدیم و جدید، اور مستبدین و احرار کی "متحدہ سازش" سخت بدحواس
 ہوئی کہ کہیں بنا یا کیل جگہ نہ جائے۔ ہر طرف سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔
 اِنَّمَا التَّجْوِيْ مِنَ الشَّيْطٰنِ
 يَحْزَنُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
 وَلَيْسَ بِصَٰدِرِهِمْ شَيْءٌ
 اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلٰى
 اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
 (۵۸)

رازدارانہ سرگوشیاں شیطان کے
 دوسے اندازی سے جوتی ہیں، تاکہ
 مسلمان اس کی وجہ سے آزرہ خاطر
 ہوں، حالانکہ بنیر مثبت الہی کے یہ
 سرگوشیاں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا
 سکتیں مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر طرف

سے ہٹ کر صرف اللہ ہی پر اعتماد کریں۔

منا خواجہ غلام اشعین صاحب کو بھی ڈیپوٹیشن میں شریک کر لیا گیا۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے اسٹیج کے اقصائے مغرب سے مشرق ادنیٰ کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہاں قسین کھا کھا کر اطمینان دلایا اور منتیں کیں کہ مان جاؤ کیا کرنا؟ مجبوراً ماننا ہی پڑا:-

اِشْتَدُّ دَا اَیْمًا نَهْمُ
خُصَّةً (۵۸: ۱۵۳)
انہوں نے بجائے اپنے قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔

گوئے بے تند تلخ، پہ ساتی ہے دلربا
لے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر
خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جب معاملہ یہاں تک پہنچا، تو میں نے بھی مناسب نہ سمجھا کہ اور زیادہ مخالفت کروں۔ عرصے کے بعد کانفرنس میں آیا تھا۔ لوگ کہتے کہ اسی نے پلٹی گھڑی میں روڑا اٹکا دیا۔
بہر حال بارانِ طریقت نے خواجہ صاحب کو بھی چپ کر رہی دیا۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہو
اس کا نہ دیکھنا، نگہ التفات ہو
اب خواجہ صاحب سے کیا گلہ شکوہ کریں؟ وہ کہتے ہیں کہ مجھے قسموں نے فرصت ہی نہ دی:-

ناز سے، غشہ سے، غمزہ سے لگاتے ہیں
وہ جے چاہتے ہیں اپنا بسا لیتے ہیں
خواجہ صاحب نے بھی دیکھا کہ کسی کی منتیں مفت میں ہاتھ آتی ہیں، یہ

خدا اور ہٹ کا موقع نہیں :-

بڑا زہ ہو جو مشد میں ہم کریں شکوہ

وہ فتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے

لے دے کے ایک خواجہ صاحب ہمارے ساتھ اٹھے تھے۔ ان کو بھی

ہمارے دوست اسٹیج کے پیچھے لے گئے ابے چارے (میر حسن) کو بھی یہی

شکایت تھی :-

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے

ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرگنے جائیں؟

ہم تو اس وقت غریب کر رہے تھے کسے معلوم کہ اسٹیج کے گوشے میں

کیا ہو رہا ہے ورنہ خواجہ صاحب کو پہلے ہی خبردار کر دیتے:

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات

اے دل سنبھل، وہ دشمن جاں مہرباں ہر اب

خیر بہتر ہے آپ لوگ اپنے سرمفت میں کیوں الزام لیں؟ صلح ہوتی

ہو تو جنگ کیوں کریں۔ الزاموں اور مخالفوں کے لئے تو ایک نیاں پسند

نفع فراموش محروم عقل و دانش دماغ مجھ دیوانے ہی کا بناسے اور کوئی کیوں

بدنام ہونے لگا :-

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل سے

جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

دنیا کو یہ عقل مندی اور دانش اور مجھ کو اپنا جہول و دفع و دشمنی مبارک

رہے، میں دعا مانگتا ہوں:

وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالِ اٰمِيْنَا!

(کامل پاشا) نے جب اپنے اعمالِ مخفیہ کو انجام دینا چاہا تو چاروں طرف نظر ڈالی۔ فوجی قوتِ صلح کی مخالفت تھی۔ اس نے سوچا کہ بغیر (ناظم پاشا) کے ملائے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ پہلے ناظم صلح کے اشد شدید مخالفت تھے اور جٹلجا سے تار پر تار دیتے تھے۔ لیکن جب ۲۲ جنوری کو سرائے درملہ (باغیچہ) میں قومی مجلس منعقد ہوئی تو اس تماشے کا ہر اکبڑ اپنے پارٹ کی مشق کر آیا تھا ناظم پاشا سب سے پہلے کھڑے ہوئے اور کہا کہ جنگ سے کیا فائدہ بہتری اس میں ہے کہ صلح کر لی جائے۔ اب کامل پاشا خاموش تھا اس لئے کہ ناظم کے اندر سے اسی کی صدا نکل رہی تھی اس کو لب ہلانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

یہاں بھی آج قومی مجلس تھی اور صلح کی سعی و اہمیت نے شدید نہ تو سر راجہ صاحب کو لب ہلانے کی ضرورت ہوئی نہ ان کے اعوان و انصار کو صرف ایک ہمارے دوست ہی کافی تھے:-

سر دوستاں سلامت کہ تو خیر آزمائی!

غرض کہ کہاں تک اس افسانے کو طول دیکھئے۔ زلف یار کی آجنگ کون پیمائش کر سکا ہے۔

ماجرایا ست بآں زلف نسوں ساز مرا

بالآخر وہی ہوا جس کا ہزاروں تناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ

انتظام کیا گیا تھا:-

یاں لعل فوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے بیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

مسٹر ممتاز حسن بیرسٹراٹ لا لکھنؤ نے بولنا چاہا، مگر اب کون بولنے دینا
ہے یا ان کا روبرو ایک ایک منٹ ایک ایک برس کا گزر رہا تھا۔ جلدی تھی کہ
نہیں معلوم کن کن اعمال مخفیہ اور وظائف نصف الیل کے بعد اپنا بخت خفتہ
بیدار ہوا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر غنودگی طاری ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ
ہو کہ ادھر ان کی آنکھ کھلے اور ادھر ان کی قسمت پھر چادر منہ پر ڈال لے۔

بہ ہزار شکل ان کو نہایت پنا تداقت دیا گیا، لیکن ادھر ایک نلف منہ
نے کھٹا تھا ادھر گھڑی دکھلائی جاتی تھی کہ وقت ہو گیا!

اس کی محفل کی دیکھنا تہذیب

بات کا انتظام ہوتا ہے!

تقریر کیا کرتے انھیں وقت کی حساب فہمی سے ہی فرصت نہیں ملتی
تھی مجبوراً خاموش ہو گئے۔

جن لوگوں کی کشت امید میں ۲۶ کی شام تک خاک اڑ رہی تھی آج
دیکھتے تھے تو گھٹائیں اڑی آرہی ہیں خوف تھا کہ یہاں کی فضا کا کیا ٹھکانا!
کہیں بھر موسم بدل نہ جائے۔ لیکر ایک غل مجا کہ رزویوشن پاس کر دو!
سر راہ صاحب نے حضار مجلس سے پوچھا کہ منظور ہے؟

ایں سخن راہ جواب ست تو ہم میدانی

یہاں خود ہی دست سوال تھا اور خود ہی زبان جواب:

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گھل کوزہ

بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی؟ اگر حلقہ نیم شبی کا بس چلنا تو اس سوال کا جواب زبان کی جگہ دل کے ٹکڑوں کی پیش کش سے دیتے کہ دل و جان سے منظور ہے کہیں خدا کے لئے پاس بھی کیجئے:

ساتی سے دے کہ اہل مجلس

پانی پانی پکار رہے ہیں!

یکایک شور اٹھا کہ منظور منظور منظور!!! اسٹیج اور اس کے ارد گرد جو حلقہ تھا وہی منظوری لینے والا تھا اور وہی منظوری دینے والا نہ سوال میں دیر لگی اور نہ جواب میں۔

رز دلوشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دئے تھے جن نوجوانوں نے پرسوں اپنی گلاب بازی سرگرم تفریروں میں دکھلائی تھی، آج ان کی گرج اس ہنگامے کے بجا کرنے میں کام آگئی چیخے چیخے گلاب بیٹھ بیٹھ جاتا تھا، مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہہ رہا تھا آواز اگلنے اگلنے منہ دکھ جاتے تھے مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلغاری محاصرہ کی پلٹیں اس بیکاری سے کچھ اتنا سی گہمی تھیں۔ اب انہوں نے ایک گھنٹے کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لئے بارہ درسی کے اسٹیج کو بزمین سرکس کا تماشا گاہ فرض کر لیا اور لگے بے تکان قلابازیاں کھلانے۔

دل از تکیں شود بے ذوق ز بہار
گہ طفلی شود مستانہ می رقص !

جن لوگوں نے ان عجیب و غریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہو کہ انہیں اس کی کیفیت سمجھائی جاسکے۔ چہرے جو خوش و بھان سے سُرخ گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدتِ شور و ہنگامے سے بڑے ہوئے ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں، اور پاؤں کو اضطرابِ رقص سے قرار نہیں۔ منہ سے کھٹ اڑ رہی تھی اور چونکہ قریب قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر بڑ رہی تھی۔ روباں نکال کر منہ پوچھتے اور بھر کھٹ اڑاتے۔ منتظرین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ درمی کے اسٹیج سے میدانِ رقص کا کام لیا جائے گا ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے نتیجہ یہ تھا کہ جو خوش و اجداد میں گردشِ رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی، اس لئے جو رقصاں جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیس تختوں کو کوٹ رہا تھا !

یہ ایک رقصِ مغلوبہ کا اصلی ایکٹ تھا۔ اگر (سرہنری اور رنگ) زندہ ہوتا اور اس مجمع کو دیکھتا تو یقین ہے کہ ان پر جوش و خروشوں کی ایک کھیمپ تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتا۔

لیکن اس عجیب المخلقت تماشے کا ایک خاص منظر تو رہ ہی گیا۔
جونہی رزولوشن کے پاس کرنے کا غل چاہم نے دیکھا کہ معاً سر راجہ صاحب محمود آباد اپنی کرسی سے مضطربانہ اٹھے اور نواب وقار الملک بہادر کے ہاتھوں کو بے اختیارانہ چوم لینا چاہا۔ نواب صاحب قبلہ کی جو سچی عظمت

قوم کے دل میں ہے اس کے لحاظ سے اگر راجہ صاحب ان کے قدم بھی چوم لیتے تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن رزولیوشن کے پاس کرنے کے ساتھ ہی اس مضطربانہ اور بیخودانہ تعظیم کا ہم مطلب نہ سمجھے کہ دست بوسی کی قیمت نقد کے لئے کوئی متاع نقد بھی ہونی چاہیئے۔ مگر اب خود نواب صاحب قبلہ کی تحریر گرامی سے یہ عقدہ حل ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ واقعی اس وقت راجہ صاحب اپنی بے اختیارانہ اظہارِ ممنونیت میں حق بجانب تھے۔

یاد ہو گا کہ نواب صاحب قبلہ نے اپنی تحریر میں ایک جگہ ارقام فرمایا کہ بعض معزز دوستوں نے پرائیویٹ طور پر مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ رزولیوشن کی تائید کریں گے؟ میں نے عرض کیا کہ میرے مرتبہ مسودہ اور اس میں اختلاف ہے۔ اس لئے میں ترمیم پیش کروں گا۔ اس پر مجھ سے بہت اصرار کیا گیا کہ میں ایسا نہ کروں ورنہ جیلے میں بہت گرٹ بڑھ جائے گی۔ مسٹر محمد علی نے رزولیوشن پیش کرتے ہوئے کہا کہ رات کو بڑی رات گئے۔ تک اس رزولیوشن کے متعلق مشورہ ہوتا رہا اور فلاں فلاں صاحبوں کے اتفاق سے (جن میں میرا نام بھی انہوں نے لیا) اس کا مسودہ مرتب ہوا ہے (حالانکہ یہ صحیح تھا کیونکہ نواب صاحب کے مجلس سے چلے آنے کے بعد بعض لوگوں کو موٹر کاریں بھیج کر بلوایا گیا اور خود ہی اس رزولیوشن کا مسودہ اور ممبران ڈیپوٹیشن کی فہرست مرتب کی۔ نواب صاحب قبلہ کے سامنے یہ بات قرار پائی تھی کہ صبح کو خود ایک مسودہ رزولیوشن مرتب کر کے پیش کریں چنانچہ بقیہ رات جاگ کر ادھر سخت تکلیف و مشقت برداشت کر کے انہوں نے

مرتب فرمایا لیکن صبح کو کسی نے پوچھا تک نہیں کہ وہ مسودہ کہاں ہے۔
 اس پر میں نے ان معزز دوست کو جھٹوں نے خاموش رہنے کی تاکید کی
 مگر توجہ دلائی کہ اس رزولیوشن کی ذمہ داری اب میرے اوپر بھی آتی ہے
 مگر انہوں نے اس وقت سکوت فرمایا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت میں نے
 اپنے آپ کو سخت مشکل میں پایا۔ جلسے میں ایک طرف تو میرا نام مجوزین فہرست میں
 خلاف واقعہ لیا گیا اور جلسے کو دھوکہ دیا گیا دوسری طرف اس بات کی کوشش
 کی گئی کہ میں جلسے میں بالکل سکوت اختیار کروں۔

اب اس "عقدہ دست بوسی" کا حل بالکل سامنے ہے۔ یہ مضطربانہ طلباً
 نعظم و تکریم اس لئے تھا کہ اگر آپ خاموش نہ رہتے تو یہ کشتی طوفانی کیونکر ساحل
 مراد تک پہنچتی۔ حریفانِ ضلوت نے صحبتِ نیم شبی کی مجلسِ خاص کے مزے
 لئے لیکن اس بادہ گسارانہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ صلح کی مجلس
 عام کو بھی سرشاری و بھجودی سے محروم نہ رکھا۔ کیونکہ بارہ دری سے نکل کر
 جو کچھ گزری اس کی ذمہ داری تو کوئی نہیں لے سکتا اور کیوں لے؟ لیکن
 اس میں شک نہیں کہ بارہ دری کے اندر تو سب ہی مست تھے:-

بھجود اس دور میں ہیں سب حاتم

ان دنوں کیا شراب سستی ہے؟

لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساتھی مآب دوست نے پلائی تو
 ضرور کوئی ایسی ہی شے جس کا رنگ سرخی مائل اور نظروں کے لئے دلولہ
 انگیز تھا، لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا،

کیونکہ ہم نے ۲۸ رہی کو دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور چہرے اکثر بے حال تھے۔ بارہ وری سے نکلنے کے بعد ہی چند مدعیان آزادی ملے، جن سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا، لیکن ”رزولیوشن کا مطلب بھی نہ بتلا سکے۔“ جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے بھی تو رقص مغلوبہ میں حصہ لیا تھا تو یکایک ان کے سر میں خارش شروع ہو گئی۔ حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں بلکہ پیشانی تھی۔

”کیا ہوسا نپ نکل اب لکیر پٹا کر“

عالم اسلام

- ۱- عظیم الشان ادرنہ
- ۲- سقوط ادرنہ
- ۳- تسخیر ادرنہ
- ۴- لفظ ادرنہ

الہلال ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء
 " ۴ اپریل " "
 " " "
 " ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء

عظیم الشان ادرنہ

مختصر حالات

نام اور حدود اربعہ

رویسی (یورومین ٹرکی) میں ایک صوبہ ہے جس کی حد بندی شمال کی طرف سے اینہ طارغ اور بلقان، مشرق کی طرف سے بحر اسود، جنوب کی طرف سے استنام علیہ، بحیرہ مرمرہ، دردانیال، جزائر ارضیل، اور مغرب کی طرف سے سٹیوٹاغ کرتا ہے۔ رقبہ ۶۲۷۸۸۔ کیلو میٹر ہے۔ ۳۶ ضلعے اور تینیں ہیں۔ قسمتوں کے نام یہ ہیں (۱) ادرنہ (۲) فلبہ (۳) اسلمہ (۴) تکفور طارغ (۵) گلی یولی۔

کل آبادی ۲۵۳،۰۵۹ ہے۔ صوبے کا دارالحکومت ادرنہ ہے۔ پہلے اس صوبہ کا نام ٹرافت (تھرافٹ) تھا، مگر اب یہ اپنے دارالحکومت کے نام سے موسوم ہے۔ مناظر طبیعی

یورپ میں یورومین ٹرکی، اور یورمین ٹرکی میں ادرنہ اُن مقامات میں سے ہے جن کے لیے قدرت نے کشادہ دستی کو زیادہ کام فرمایا ہے (دامنہائے کوہ جن

اس صوبہ میں کمی نہیں، لہذا میوؤں، عطریات پھولوں، اور خوش منظر درختوں کے کچ، اور لظرف کش و باصرہ افزا مرغزاروں سے معمور ہیں۔ پہاڑوں سے گرنے والے لطف انگیز و نعمت طراز آبشاروں کے علاوہ شیریں، خوشگوار، اور شفاف پانی کی نہروں کا ایک روپیلی جال ہے جو تمام صوبے میں بچھا ہوا ہے، اور ہر ہر گوشہ میں سیراب و شاداب کرتا رہتا ہے جو ابھی معتدل مگر لطیف و خوشگوار ہے مگر یہاں کہ یہاں کے مناظر طبیعی بے حد صحت پرور، فرحت انگیز اور لطف آگیز ہیں۔

پیداوار

خاک اور نہ جس طرح فرحت پرور اور نظر نواز ہے، اسی طرح مایہ دار اور زریز بھی ہے۔ نباتات میں روئی، انیون، بادام، فندقہ، کاپی، سیب، ناشپاتی، خرپڑہ، اور جادات میں پشمینہ، ٹوٹا اور سنگ مرمر برآمد ہوتا ہے۔ ان خداداد سرچشمہ کے دولت کے علاوہ یہاں تھول کا وہ ذریعہ بھی ہے جو گنچ عالم کی کلید اور قدرت کی فیاضیوں سے محروم ممالک کا ماز زندگی ہے۔ میری مراد اس سے صنعت ہے۔ اصناف صنعت ہیں سے یہاں پشمینہ و پنبہ بانی اور اسلحہ سازی زیادہ رائج ہیں تینوں قسم کے کارخانوں کی ایک تعداد موجود ہے جو کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ یہاں کی مصنوعات میں سے جانمازیں، پردے اور عجائیں اپنی نگکاری، خوش رنگی، اور پائیداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ غرض کہ اور نہ ایک شاداب، سیر حاصل، اور مایہ دار صوبہ ہے، اور اسی لیے یورپین ٹرکی میں قسطنطنیہ کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ شاید اب کہنا چاہیے کہ ”تھا“ اور نہ لہذا دارالحکومت بننے، نیز طبیعی اور صناعی دونوں حیثیتوں سے اس صوبہ کا واسطہ

العقمر - یہ قسطنطنیہ سے شمال و مغرب ۱۰۰ میل دور اس سنگم پر واقع ہے جہاں
 مرجع، طنجہ، اوداردا، تین نہریں ہم آغوش ہو کر ایک نظر رباغرضیض سطح آب
 پیدا کرتی ہیں۔ شہر کے گرد ایک پرانی شہر پناہ ہے جس سے سنگم کی وجہ سے ٹکراتی ہیں
 تمام شہر دلکش باغوں، اسلامی اور غیر اسلامی تاریخی عمارتوں سے معمور ہے،
 جو زبان خاموشی سے اسلاف کی جنگ آرائی، فحاست دوستی، رفت پندئی
 اور شکوہ منائی کی داستان سناتی ہیں۔ یہیں وہ قصر بلند ہے جس کو (اسکی سرے) کہتے ہیں۔
 اسی قصر میں میتہ کے عثمانی سلاطین ششہ ہجری میں "باب مسیحیت" پر جسے سب سے پہلے
 ایک صحابی نے اپنی شمشیر جہاد سے کھٹکھٹا باٹھا، جانا بنا زائد مسلسل حملے کرتے رہے
 یہاں تک کہ ششہ ہجری میں وہ کھل گیا، اور اسلام کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی
 شہر اور نہ میں چالیس سے زائد مساجد ہیں، جن میں نو خاص سلاطین
 عثمانیہ کی بنوائی ہوئی ہیں۔

جامع سلیم

ان مساجد میں سب سے زیادہ قابل ذکر جامع سلیم ہے جیسا کہ اس کے نام
 سے معلوم ہوتا ہے۔ جامع سلیم کا بانی سلطان سلیم ثانی تھا، جو خاندان عثمانیہ کا
 گیارہواں تاجدار تھا اور ششہ سے ششہ تک حکمران رہا۔ اس مسجد کی
 رفعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ جامع ایسا صوفیہ سے ۲۰ قدم بلند تر ہے
 میں ایک عظیم الشان گنبد ہے جو رنگ سماق کے دو کھنبوں پر ٹکرا ہوا ہے۔ چار ستارے
 ہیں، ہر ستارے میں ایک زینہ ہے، جس سے سوزن سرما زائد تک جانا ہو ممکن
 کے تین گوشوں میں قبة ہیں، جو مسجد کی عظمت و جلال کو افزوں تر کرتے ہیں۔

اپنی عظمت، استحکام، اور خوشنائی کے لحاظ سے جاسع سلیم کا شمار عثمانی فن تعمیر و تمدن کے بہترین نمونوں میں ہے۔

ان مساجد کے علاوہ دو بہت بڑے بازار ہیں، جن میں سے خوشما تر وہ بازار ہے، جس کو علی پاشا کہتے ہیں۔ یہ اس قدر طویل ہے کہ ایک متوسط رفتار آدمی ۱۵ منٹ سے کم میں پورے بازار کا چکر نہیں لگا سکتا۔

دیگر عمارات

ادرنہ میں بڑے فندق (ہوٹل) ۵۲ ہیں۔ نہر پنجہ پر ایک پل بھی ہے۔ ان عمارتوں کے علاوہ متعدد حمام، مدارس، قزو خانے اور شفا خانے ہیں۔ ایک مطبخ بھی ہے۔ سرکاری پارک بانی کے کئی کارخانے ہیں، جن میں ریشمی اور اڈنی کپڑے بنے جاتے ہیں۔

گلشن آباد عالم!

زمین نہایت درجہ سرسبز و زرخیز ہے، باغوں کی یہ کثرت ہے کہ ادرنہ گلشن آباد ہو رہا ہے۔ صرف نہر مرتج کے ساحل پر ۵۰۰ ہاغ ہیں۔ ان میں سے اکثر صرف گلاب کے لیے وقف ہیں۔ گلاب کی اس درجہ کثرت کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہاں عرق کشی کے کئی کارخانے ہیں، جن میں فقط عرق گلاب کشید کیا جاتا ہے، اور اس کے لیے ادرنہ مشہور ہے۔ یہاں کا عطر روح گلاب تمام دنیا میں اول درجہ کا تسلیم کیا جاتا ہے

آبادی

آبادی ۱۵۰۰۰ ہے، جس میں ایک تہ بلبغاری و یونانی، اور بقیہ ڈولت

میں یہود، ترک، ارمینی اور عام فرنگی ہیں۔
قدیم تاریخی معرکے۔

فن تاریخ کا یہ ایک راز آشکار ہے کہ جن ممالک پر قدرت کا ابرکرم زیادہ برستا ہے، اُن میں خون کی بارش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ صوبہ ادرنہ پر قدرت کی اس درجہ کرم گستری کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ وہ آماجگاہ جنگ ہوتا۔ روسیوں کے زمانہ سے اس وقت تک صد ہا ہولناک جنگیں ہوئیں، اور بارہا خون کے سیلاب، بکھرے ہوئے اعضا، اور خون آلود انسانی پیکروں سے ادرنہ کے دلکش مرغزاروں کو ایک ایسا لالہ گون نقش زار بنا دیا جسے دیکھ کے دل دھکار اور آنکھیں خوبا رہوتی تھیں۔ ۱۳۲۳ء میں قسطنطین اور لیسینوس میں ایک خونریز معرکہ ہوا، جس میں ہزار ہا انسان کام آئے۔ ۱۳۴۸ء میں پھر میدان کارزار گرم ہوا۔ فریقین جنگ گاتھ اور شاہنشاہ فالمن تھے۔ میدان گاتھ کے ہاتھ رہا۔ ۱۳۵۸ء میں پھر آتش جنگ روشن ہوئی۔ سلاوی اور بیزنطینی سپاہ معرکہ آرا بھی ہوئی۔ لیکن بیزنطینی فوج کو شکست ہوئی۔ ۱۳۵۹ء میں بلغاریوں نے فوج کشی کی اور بزور شمشیر شہر میں داخل ہو گئے۔ ۱۳۸۹ء میں انگریز داخل ہوئے مگر چلے گئے۔ ۱۴۰۵ء میں بورڈین نے حملہ کیا، اس وقت شہر ادرنہ بلغاریوں کے قبضہ میں تھا۔ میدان کا زار آراستہ ہوا، مگر حملہ آور فوج نے مدافع فوج کو شکست دی، اور بادشاہ کو قید کر لیا۔ ۱۴۱۱ء میں خاندان عثمانیہ کے تیسرے تاجدار سلطان مراد اول نے اس کو فتح کیا اور وہ مشہور محل شاہی بنایا، جس کا ذکر عمارات کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ ۱۴۳۵ء میں روسی فوج داخل ہوئی مگر بعد کو

معاہدہ اور نہ کے بموجب روسیوں نے شہر کو خالی کر دیا تھا۔
اب اس کا حسرت انگیز حال سامنے اور مستقبل مجہول ہے!

سقوط اور نہ

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا
أَنْتُمْ أَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ
مُؤْمِنِينَ إِنْ يَنْزِلْ سَكَنٌ
فَرَحٌ فَذَلِكُمْ فَتْرَةٌ
مِنْهُ وَلَئِنْ لَمْ يَنْزِلْ لَكُمْ
بِكُنُوفٍ الْمَكَاسِ

ہمت نہ ہارو اور نہ اس شکست کی خبر سن کر غمگین رہو شکست
جو آتی ہے کر کے اگر تم سچے مومن ہو، تو آخر کار تمہارا ہی جہل
بالآخر اگر تم کو اس لڑائی میں سخت زخم لگے، تو ہمت
نہ ہارو کہ طرٹ ثانی کی قوت بھی اسی طرح مجبور
ہو چکی ہے اور یہ وقت کے تاراج و حوادث میں جو نوبت
بہ نوبت سب لوگوں کو پیش آتے رہتے ہیں۔

إِنَّمَا النَّفْسُ جَزَعًا
فَإِنْ مَا تَحْذَرِينَ فَرَقًا

بالآخر یہ ریا تو پیل فتح ہو گیا اور واقعات و حوادث کے آگے انسانی مہمی
جیسی کہ ہمیشہ ناکام رہی ہے اس معرکہ میں بھی ناکام رہی اِنَّمَا النَّفْسُ جَزَعًا
لہٰذا اس میں جو کچھ شہور شہر ہو یعنی اسے نفس مخروں! اب رو نہ دے سو نامہ تو نہ کر کہو نہ کہیں
حادثہ کے خیال سے ڈرتا تھا وہ تو ہو چکا ۱۶۔

بہت سہی کیجیے تو مر رہے میر
 وَمَا تَشَاءُونَ اِنَّ يَسْأَلُ اللّٰهُ - اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۳۰:۶۷)

صبح تمنا اور شام حسرت

اس اُمید آباد عالم میں ہر لمحہ اور ہر آن کتنی اُمیدیں ہیں جو پیدا ہوتی ہیں
 اور کتنے ولولے ہیں جو اُٹھتے ہیں؟ پھر اُن میں کتنے ہیں جن کے نصیب میں فیروز مندی
 و کامرانی ہے، اور کتنے ہیں جن کے لیے حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں، بسکیں
 انسان جو آرزوؤں کا بندہ اور حسرتوں کے خیر کا پتلہ ہر شاید صرف اس لیے بنایا
 گیا ہو کہ نصف عمر اُمیدوں کے پالنے میں صرف کر دے۔ اور بقیہ نصف نامرادی
 کے ماتم میں کاٹ دے۔ یہی برکی نے صحرا میں ایک اعرابی کو دیکھا تھا کہ میدان
 سے پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے اور جب ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے تو پھر ایک
 ایک ٹکڑے کو اُٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا اسی طرف پھینکے لگتا ہے۔ کیا انسانی
 ہستی کی پوری تاریخ اس مثال میں پوشیدہ نہ تھی؟ ہماری زندگیاں جن کے ہر لمحہ
 حیات سے کارگاہِ عالم میں شورش و کشمکش کے طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، غور کیجیے
 تو ایک تاریک بکوت، اور حسرت کے ایک جلتے ہوئے تنکے سے زیادہ کیا ہستی
 رکھتی ہیں؟ ساری عمر وہی کاموں میں بسر کر دیتے ہیں، یا صحرائےِ دجلہ کے اعرابی
 کی طرح صبح تمنا میں اُمیدوں کے سنگریزے جمع کرتے ہیں، یا پھر شام نامرادی
 میں جہاں سے لائے تھے، وہیں پھینک دیتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے نہ فوں ہو جائیں
 مثال یہ میری کوشش کی ہے کہ مرغِ امیر
 کہے قفس میں فراہم خسِ آشیاں کے لیے

کار ساز قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں! کچھ خاکِ اُمید کی لی اور کچھ
 خاکِ حسرت کی، دونوں کی تمیزِ عشق سے ایک قیتلا بنایا، اور انسان نام رکھ
 کر اس ہنگامہ زارِ ارضی میں بھیج دیا۔ کبھی اُمید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہے کبھی اُمید
 کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے۔ کبھی دلوں کی بہاریں زمزمہ سازِ نعمتِ انسا ہوتا ہے
 اور کبھی حسرت و افسوس کی خزاں میں اُمیدوں کے پژمرہ پتوں کو گنتا ہے۔ کبھی
 ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے۔ کبھی رقصِ نشاط ہے اور کبھی سینہ ماتم، ایک لمحہ سے جمع
 کرتا ہے اور دوسرے سے کھوتا ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
 عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور افسوسِ حاصل

پس اے ساکنانِ غفلتِ آبادِ ہستی! دوائے رہروانِ سفرِ ہمیشی و فراموشی! مجھے
 بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو کچھ اور کیا ہے؟ اور اے نیرنگِ آرائے
 تماشا گاہِ عالم! کیا یہ ہنگامہ حیات، یہ شور و شِ زندگی، یہ رستخیز کشِ کشِ ہستی
 تو نے صرف اتنے ہی کے لیے بنائی ہے؟

مکنہ کو تہ و بازوئے سُست و بامِ بلند

بمنِ حوالہ و نو سیدیم گنہ گسیرند

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا

ہنیں معلوم آغازِ عالم سے آج تک یہ سوال کتنے دلوں کے اضطرابِ التباس
 کا باعث ہوا ہوگا؟ مگر کچھ یہ کہ اپنے کان ہی پرے ہیں ورنہ کاساتِ عالم
 کا ذرہ ذرہ اس سوال کا جواب نفی میں دے رہا ہے

محرم نہیں ہو تو یہی نواہی راز کا
یاں در نہ جو عجب ہو پر وہ ہو ساز کا

وَكَايْنِ مِنْ آيَاتٍ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ (۱۲: ۱۰۶)

یہ سچ ہو کہ مصائب و ناکامی کا هجوم انسان کے دل میں ایسے خیالات پیدا کر دیتا
ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صنعت نگاہ عالم کا یہ سادہ و سامان صرف اتنے ہی کے
لیے نہیں ہو سکتا وہ عالم انسانیت کبریٰ جو تاج خلافت الہی سر پر اور خلعت کرم
(وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ) اپنے روشن عظمت پر رکھتا ہو، کیونکہ ممکن ہے کہ صرف امیدوں
کے پالنے اور پھرن کی موت و احتضار کا تماشا دیکھنے کے لیے بنایا گیا ہو اُنْحَبِطُوا
أَنْتُمْ خَلْقُكُمْ عِبَادًا وَ أَنْتُمْ إِلَٰهِي لَا يُرْجَعُونَ ؟

الَّذِينَ يَدْعُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقَعُودًا أَوْ عَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَكَبَّرُونَ
فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنْتُمْ تَقَرُّونَ تَدْبِرُ كِي نَفْذُ الْإِلَٰهِ مِنْ
رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا كِي زَبَانُكَ تَدْبِرُ كِي نَفْذُ الْإِلَٰهِ مِنْ
مُبْتَخَاكَ فَقَدْ عَذَّبْنَاكَ بِالنَّارِ
صنعت تو نے بیکار و بے ثمر نہیں پیدا کی ہے۔ (۱۲: ۱۰۶)

بہار و خزاں اور اُمید و بیم

اس میں تو شک نہیں کہ جس قدر کائنات سے غور کیجیے گا، جذبات انسانی
کی تشکیل و تفہیم کے آخری عناصر ہی دو چیزیں اُمید و حسرت نظر آئیں گی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہوں

یا آئندہ کی اُمید ہو اور یا رفقہ پر حسرت، البتہ یہ ضرور ہو کہ اُمید و یاس کی تقسیم کو صرف افراد و اشخاص میں محدود نہ کیجیے بلکہ اس میں دراصل قوموں اور ملکوں کی تاریخ پوشیدہ ہو۔ باغ و چمن میں بہار و خزاں دو موسم ہیں جو یکے بعد دیگرے آتے ہیں اور اپنی اپنی آمد کے متضاد و مخالف آثار چھوڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح اُمید اور حسرت کو دو مختلف موسم تصور کیجیے، جو قوموں اور ملکوں پر بھی آتے ہیں اور وہ نامرادی و کامرانی کی تقسیم ہو جو اپنے اپنے وقتوں پر قوموں میں ہو جاتی ہے بعض قومیں ہیں جن کے حصّہ میں اُمید کی بہار آئی ہو اور بعض میں جواب صرف یاس و حسرت کے خزاں ہی کے لیے رہ گئے ہیں موسم بہار زندگی و شگفتگی کا موسم ہوتا ہو اور انسان کی رگوں کے اندر دوڑنے والے خون سے لے کر درخت کی شاخوں اور پھینکے تک ہر چیز میں جوش حیات اور ولولہ انبساط پیدا ہو جاتا ہے یہی حال ان قوموں کا ہوتا ہے جو اپنے دور اُمید سے گذرتی ہیں۔ تمام دنیا ان کے لیے ایک بہشت اُمید بن جاتی ہے اور اس کی ہر آواز ان کے کانوں کے لیے ایک نرا اُمید کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنے اندر دیکھتے ہیں اتودل کا ہر کونہ اُمیدوں اور ولولوں کا آئینہ نظر آتا ہے اور باہر نظر ڈالتے ہیں تو دنیا کا کوئی حصّہ عروس اُمید کی مسکراہٹ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس عظیم ذراہست و خست میں انسان سے باہر نہ غم کا وجود ہے اور نہ خوشی کا۔ زندگی کی تمام کامیابیاں اور مسرتیں دراصل دل کی عشرت کامیوں سے ہیں جب تک آپ کے دل کے طاق مخفی میں اُمید کا چراغ نہ بجے تو اس وقت تک دنیا بھی عیش و مسرت کی روشنی سے خالی نہیں۔ لیکن اگر باہر صبر نامرادی کا کوئی جھونکا وہاں تک پہنچ گیا، تو پھر خواہ آفتاب نصف النہار پر

درخشاں کیوں نہ ہو مگر یقین کیجیے کہ دنیا کا یہ تمام نظام منور آپ کے لیے ظلمت سرائے تاریک ہے۔

یہ وہ خوش نصیب قومیں ہیں کہ ان کے دل کے اندر امید کا چراغ روشن ہوتا ہے اس لیے جہاں جلتے ہیں اقبال و کامرانی کی روشنی استقبال کرتی ہے چونکہ ان کے دل کے اندر سلطانِ اُمید فقیہ ہوتا ہے، اس لیے زمین کے اوپر بھی نامرادی و ناکامی کی صفوں پر فتحیاب ہوتے ہیں جس ہاتھ میں اُمید کا علم ہو پھر دنیا کی کوئی قوت اس ہاتھ کو زیر نہیں کر سکتی۔ ان کی اُمید حسرتِ آرزو نہیں ہوتی جو محض ناکامی و نامرادی کے ماتم کے لیے ہے۔ بلکہ کامیابیوں کا ایک پیغامِ دعوت ہے جو دل میں اُمید بن کر اور دل کے باہر عیشِ مراد کی کامرانی و فیروز مندی کی صورت بن کر جلوہ آرا ہوتی ہے۔

لیکن اسی سطحِ ارضی کے اوپر جو اُمید کی کام بخشوں سے خوش نصیب قوموں کے لیے عیشِ مراد کا ایکسچین زار نشاۃ ہے وہ بد نصیب قومیں بھی بستی ہیں جن کے دامنِ حیات میں اُمید و یاس کی بخشش کے وقت، اُمید کے پھولوں کی جگہ صرف نا اُمیدی کے کانٹے ہی آئے ہیں جو خزاں کے افسردہ و افسردہ کن موسم کی طرح دنیا میں صرف اس لیے زندہ رہتے ہیں کہ بہارِ گزشتہ پر ماتم کریں اور خزاں کے جھونکوں سے اپنے درختِ اُمید کی پت جھڑ دیکھ دیکھ کر آنسو بہائیں، وہ دنیا جو اوردوں کے لیے اپنی ہر صدا میں ایک پیغامِ اُمید رکھتی ہے، ان کے لیے کیسے ماتم کدہ یاس بن جاتی ہے۔ جب مایوس ہو تو دنیا کی ہر چیز میں مایوسی ہے۔ ان کے دلوں میں اُمید کا چراغ بجھ جاتا ہے

دول کے باہر بھی کہیں روشنی نظر نہیں آتی۔ دنیا کے وہ وسیع صحرا جن پر قدرت نے طرح طرح کی نباتاتی نعمتوں کا دسترخوان چن دیا ہے، وہ خوشنما اور عظیم الشان آبادیاں، جن کو انسانی اجتماع اور مدنی محنتوں نے زمین کے عیش و نشاط کا بہشت بنا دیا ہے وہ عظیم الشان اور بے کناں سمندر جن کی حکمرانی کی طاقت حاصل کرنے کے بعد پھر خشکی کے ٹکڑوں پر حکمرانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غرض کہ اس زمین اور زمین پر نظر آنے والی تمام چیزیں ان سے اس طرح منہ پھیر لیتی ہیں گویا وہ اس زمین کے فرزند ہی نہیں ہیں۔ بلکہ بڑی بڑی آبادیاں توں اور جماعتوں کی ذاتِ تھانہ منگوں کا بولانگاہ ہوتی ہیں تو ان نصیبوں کے لیے صحراؤں کے بھٹ اور پہاڑوں کے غاروں میں بھی کوئی گوشہٴ عافیت نہیں ہوتا۔ صحراؤں کی فضائیت، ہوا کی سنسناہٹ اور دریاؤں کی صدائے روانی، اوروں کے لیے پیامِ اُمید ہوتی ہے، مگر ان کے کانوں میں ان سب سے نامرادی فنا کی صدائیں اٹھ اٹھ کر بلند زن ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا میں اگر بہار و خزاں، اُمیدِ یاس، شادی و غم، نعمہ و نوحہ، خندہ و گریہ، اور فنا و بقا دو ہی چیزیں ہیں جن کی زمین کے بسنے والوں میں بخشش ہوئی ہے تو مختصریوں سمجھ لیجیے کہ پہلی قوموں کو بہار و اُمید اور شادی و نشاط کا حصہ ملا ہے، اور دوسروں کو کیسرا یاس و حزن و نوحہ و ماتم اور گریہ و فنا کا،

ماخانہ رسیدگان ظلم
پیام خوش از دیارِ مایت
وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ

لیکن یہ حالات و نتائج کا ایک دور ہو جو نوبت بہ نوبت دنیا کی تمام قوموں

بلکہ کائنات کی ہر شے پر طاری ہوتا ہے، قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔
 وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُذَارٌ لِّكَأَوَّلِهَا أُمِيرٌ دِيَّاسٌ وَخَادِي دُغْمٌ أَوْ فُتُوحٌ وَشُكُوتٌ كَيْفَ يَكُونُ النَّاسُ فِي
 أَيَّامٍ هِيَ بَعْدَ نَوْبَتِ بَرْنَوْبَتِ نَسَاوُنِ پُغْذَرَتِ ہَتَّوْہِی
 دنیا میں کوئی غم نہیں جس نے غم سے پہلے اپنی شادی کے دن
 بھی نہ دیکھے ہوں، اور بارغ میں کون سا زندہ درخت ہے جس نے خزاں کے
 جھونکوں کے ساتھ کبھی نیم بہار کی لذتیں بھی نہیں لوٹی ہیں؛ دنیا عالم اسباب
 ہے اور یہاں کا ایک ذرہ بھی قوانین فطریہ و سلسلہ اسباب کی ماتحتی سے
 باہر نہیں۔ پس یہ انقلاب حالت بھی ایک قانون الہی اور ناموس فطری کے
 ماتحت ہے جس نے ہمیشہ اس عالم میں یکساں نتائج پیدا کئے ہیں اور ان
 میں تبدیلی ممکن نہیں۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلنَّاسِ عَلَى النَّاسِ مِلًّا فَمَنِ اتَّبَعَ مُلًّا مِنْهُمْ فَأُولَٰئِكَ يَحْمِلُونَ وِثْرَتَهُمْ
 تَبْدِیْلًا

بلغ وچمن میں بہار و خزاں کا انقلاب ہو، دریاؤں میں جزر و مد کا اتار چڑھاؤ
 ہی سمندروں میں سکون و ہيجان کا تغیر ہو، افراد حیوانی کی حیات و ممات اور
 شباب و کمولت کا ایاب و ذہاب، افراد کی صحت و علالت، اور اقوام کا
 عروج و زوال یہ تمام حالتیں فی تحقیق الہی قوانین الہیہ اور ناموس فطریہ
 کے ماتحت ہیں جن کو فطر السوائت و الارض نے اس عالم کے نظام و قوام کے
 لیے روز اول ہی سے مقرر کر دیا ہے۔ پھر جن افراد و اقوام نے ان قوانین کے مطابق
 راہ و سبب اختیار کی ہے، ان کے لیے امید کی زندگی ہے اور جنہوں نے اس سے

روگردانی کی ہر آن کے لیے نامرادی و ناکامی کی مایوسی ہے۔ قانون جرم کی ضرورت
ہے، پر مجرم کو جرم کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ پس شکایت کا رضاء قدرت
کی نہیں، بلکہ خود اپنی ہونی چاہیے۔ خدا نے اُمید کا دروازہ کسی پر بند نہیں
کیا ہر اور زمین کی راحت کسی ایک قوم کے ورثے میں نہیں دے دی ہر اس
نے پھول اور کانٹے دونوں پیدا کیے ہیں۔ اگر ایک بد بخت کا ہاتھوں پر چٹا ہر گر
پھولوں کو دامن میں جمع نہیں کرتا، تو اسے اپنی محرومی پر رونا چاہیے۔ باغبان
کا کیا قصور؟

فَمَا كَانَ اللَّهُ بِظَالِمٍ لَّهُمْ قَوْلًا
لَكِنْ كَانُوا أَكْثَرًا ظَالِمِينَ
انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ (۳۰:۱۸)

دوسری جگہ فرمایا:-

ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيِدِيكُمْ فَعَدَّ
أَنَّ اللَّهَ لَا يَسْرِ بِظُلْمٍ لِّلْعَالَمِينَ
یہ سب ہر بایاں تم نے خود اپنے ہاتھوں سے
کیا، ورنہ اللہ تو اپنے بندوں کے لیے کبھی
ظالم نہیں۔ (۵۷:۲۸)

اس نے دنیا کے آرام و راحت، اور عیش و کامرانی کو انسان کے ماتحت
نہیں بلکہ انسانی اعمال کا محکوم بنایا ہر، اور جب تک کوئی قوم خود اپنے اعمال
میں تبدیلی پیدا نہیں کر دیتی، اس پر زمین کی راحتوں کا دروازہ کبھی بند
نہیں ہوتا۔

ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا
ان قوموں کو نامرادی و مایوسی کی یہ سزا اس لیے

نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ دیکھ گئی کہ ایسا ہی اس کا قانون ہر جمعیت خدا نے
يُغَيِّرُ فِئَامًا بِأَفْئِسِهِمْ وَأَنَّ کسی قوم کو دی ہو پھر وہ کبھی وہ پس نہیں لیجاتی تا آنکہ
اللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۵۵:۸) خود وہ قوم اپنی صلاحیت اور قابلیت کو بدل نہ ڈالے
ماضی و حال

یہ اعلیٰ بات قدرتی ہیں، اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے دور قوموں اور
ملکوں پر اس کے گزر چکے ہیں! آج اُمید و کامیابی کے جس آفتاب سے غیروں
کے ایوان اقبال روشن ہو رہے ہیں، کبھی ہمارے سروں پر بھی چمک چکا ہے، اور جس
بہار کے موسم عیش و نشاط سے ہمارے حریف گزر رہے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے
بلوغ و جن ہی میں اس کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ اب کس سے کیسے کہہ سکتے
ہی چلا گیا!

گندپکی ہر فیصل بہار ہم پر بھی

ہم ہمیشہ سے ایسے نہیں ہیں، جیسے کہ اب نظر آ رہے ہیں۔ زمانہ ہم سے ہمیشہ گزشتہ
نہیں رہا۔ مدتوں اُمید کا ہم میں آشیانہ رہا ہے، بلکہ ہمارے سوا اس کا کہیں ٹھکانہ
نہ تھا۔ اب دنیا میں ہمارے لیے ماتم و نا اُمیدی، دو ہی کام کرنے کے لیے باقی
رہ گئے ہیں، لیکن زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہماری زندگی کے لیے اسی دنیا میں
اور بھی بہت سے کام تھے!

وَبَلَّوْنَا هُم بِالْحَسَنَاتِ اور ہم نے ان قوموں کو اچھی اور بُری اُمید اور مایوسی فتح
وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ اور شکست دونوں حالتوں میں ڈال کر آزما کہ شاید یہ
يَرْجِعُونَ (۱۶:۷) بد اعمالیوں سے توبہ کریں اور راہ حق اختیار کر لیں۔

وَأَنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ اور بیشک اس انقلابِ حالت میں عبرت و موعظت کی
وَمَا كَانَتْ أَكْثَرُهُمْ عُدُوًّا بہت سی نشانیاں ہیں مگر ان میں اکثر لوگ ایمان و یقین
مُؤْمِنِينَ (۶۸:۲۶) کی دولت سے محروم تھے۔

ہجومِ یاس و اختلالِ نظامِ اُمید

مَنْ كَانَ يَتَّقِ اللَّهَ لَجَأَ جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبتِ اِیماظن بد رکھتا ہو
يَتَصَرَّعُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَ کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اُس کی مدد کرے ہی گا
الْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبِ نہیں، تو پھر اُس کو چاہیے کہ اوپر کی طرف ایک
إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ رسی تانے اور اُس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی
فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُدْهِبَ لگا لے اور اس طرح زمین سے (جہاں اب وہ اپنے
كَيْدَهُ مَا يَغِیْظُ وَ كَذَلِكَ لیے مایوسی ہی سمجھتا ہے، اپنا تعلق قطع کر لے، پھر
أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَ دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کی وہ شکایت جس کی
أَنَّ اللَّهَ بِحَدِيثِ مَنْ مُرِيدَ وجہ سے مایوس ہو رہا تھا دور ہو گئی یا نہیں؟ اسی طرح
ہم نے قرآنِ کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں
(۱۵:۲۲)

اُماری ہیں کہ تم اُن پر غور کرو اور اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعہ سے ہدایت بخشتا ہے۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس

ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہو گئے

موجودہ جنگِ بلقان یا جنگِ اسلام و فرنگ کی اگر تاریخِ لکھی جائیگی تو

اس میں شاید سب سے زیادہ موثر اور درد انگیز باب مسلمانانِ عالم کے اضطراب

اُمید و بیم کا ہو گا یہ سچ ہے کہ میدانِ جنگ میں صرف مجاہدین ترکِ شیعہ، جن کی

لاشیں دشمنوں کی گولیوں سے تڑپتی تھیں، لیکن دنیا میں کروڑوں قلوب بھی تھے جن کی لاشیں نہیں، مگر پہلو میں دل ہمیشہ تڑپتے رہتے تھے۔

واقعات نے جلد جلد اپنے اوراق اُلٹے۔ اُمیدوں کو عموماً شکست ہوئی اور توقعات میں بالعموم ناکامی۔ جنگ کے التواء کے بعد صلح کے مہلک اور خانماں سوز شرائط سن کر وہ مضطرب تھے، مگر خود دار الخلفہ میں ایک جماعت آخری سعی و مجاہدہ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، اور دوبارہ اجراء جنگ نے پھر ایک شعاع اُمید دکھلائی۔ حالات گویہ بدستور تھے، نئی وزارت آئندہ کے لیے باوجود بے سرو سامانی کچھ نہ کچھ سامان کر سکتی تھی، مگر جنگ کے گذشتہ ایام میں اس کے پیشرو جو کچھ کچلے تھے، ان کی تلافی محال تھی۔ وہ محصور مقامات کو رستہ نہیں پہنچا سکتی تھی، اور محصور قلعوں میں نئی فوج بھی نہیں بھیج سکتی تھی۔ بایں مالی مشکلات کا انتظام کیا گیا، اور مذہاب تک اس جنگ کو جاری رکھا جس کو ایک ہفتہ اور جاری رکھنے کی قوت بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی!

اس عرصہ میں اُمید تھی کہ حالات میں اور تغیرات ہونگے، اور ایڈریانوئل کے محاصرہ میں دشمن کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اسباب و بداعث کی بحث کا یہ موقع نہیں ان کی تفصیل کسی دوسری جگہ پڑھیے گا، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ حالات عین مطابق مگر ہماری اُمیدوں اور آرزوؤں کے خلاف ایڈریانوئل بھی مفتوح ہو گیا اور بظاہر ہر شخص نے محسوس کیا کہ آخری رشتہ اُمید جو باقی رہ گیا تھا، اُس نے بھی بے وفائی کی۔

فان ماتخذہن قد وقعا

میں دیکھتا ہوں کہ ایڈریانوئل کے سقوط کی خبر نے ابناے ملت کی ہمتوں کو پست کر دیا ہے، لوگ عموماً ناامید ہو گئے ہیں اور اکثروں کے دل بیٹھ گئے ہیں۔ یاس و اضطراب کا لشکر جب آتا ہے، تو اس کا پہلا حملہ عقل و دماغ پر ہوتا ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ اور ایوس ہیں کہ اب کچھ نہیں کر سکتے مگر غالب نے اسی عالم کی تصویر کھینچی ہے۔

فرصت ز دست رفتہ و حسرت فشرده پای
کار از دو گدشتہ و افسوں نکرده کس

حس مصائب رحمت الہی ہے

مصیبت کا احساس غم و ماتم کی صورت میں جس قدر شدید ہو بہتر ہے کیونکہ زخم کی تکلیف جتنی سخت ہوتی ہے، اتنی ہی مرہم کے بنانے میں بھی جلدی کی جاتی ہے اور قدرت الہی کی نیرنگیوں نے اکثر ایسا دکھایا ہے کہ یاس و ناامیدی جب حد انتہا کو پہنچ گئی ہے تو اسی کی زمین میں امید کی سرخونچم ریزی ہوتی ہے۔

پس موجودہ مصائب کا جس جس قدر درد انگیز ہو، اس کو فال نیک سمجھنا چاہیے، اور دراصل سچ پوچھیے تو ہماری زبانوں کے آہ و فغاں دیکھتے ہوئے جس درجہ درد و الم دلوں میں ہونا چاہیے تھا، افسوس ہے کہ نہیں ہے۔ ہم میں کتنے ہیں جنہوں نے چند لمحوں کے اضطراب و تشویش سے زیادہ اپنی زندگی اس غم میں تلخ کی ہے؟ اور پھر کتنے ہیں، جن کے حلق سے ایک وقت کا کھانا بھی کسی بے حسینی کے بعد اترا ہے؟

میں سفر میں محتاج سقوط اور نہ کی خبر آئی مجھے اس کے بعد متعدد مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا، اور میں نے مسلمانوں کے مختلف طبقات و درجات کی بہت سی آبادیاں دیکھیں۔ میں نے دیکھا کہ جو گزرنا تھا گزر گیا لیکن ہماری غفلت و مدہوشی کے اعمال، اور عیش جوئیوں اور راحت پسندیوں کے اشتغال بدستور جاری ہیں یہ کہتے ہوئے خود اپنے تئیں ندامت اور تکلیف ہوتی ہے مگر افسوس کہ کہنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ دلوں کی بے چینی میں شک نہیں، اور ایک مٹس جو پہلے نہ تھی اب شاید لاکھوں پہلوؤں میں محسوس ہو رہی ہے اگر ہزاروں ہیں جنہیں خواب غفلت سے ہلکت نہیں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں جو گواہ تک بستروں پر لیٹے ہیں مگر اضطراب کی کروٹیں بھی بدل رہے ہیں، اور یہ یقیناً کارفرمائے قدرت کی ایک سب سے بڑی توفیق بخشی ہے۔ اگر موسم کے بدلنے کا وقت آگیا ہے تو اتنے آثار بھی کم نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے آتشکدوں اور توروں کو دیکھا ہے کہ ان کے اندر سے آگ کے ہیبت شعلے اٹھ رہے تھے، حالانکہ چند گھنٹے پیشتر ان کی تہ میں چند کچھی ہوئی چنگاریوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہی خاکستر کے تودوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو جب باد تند و تیز کے چند جھونکے میسر آ گئے، تو چشم زدن میں دکھتے ہوئے انگاروں اور اچھلتے ہوئے شعلوں سے تنور بھر گیا۔ پھر کیا عجب ہے کہ سوز و تپش، جو چنگاریاں اس وقت دلوں میں بجتی ہوئی نظر آرہی ہیں، توفیق الہی کی باد شعلہ افروز انہی سے اس آتشکدہ حیات کو گرم کر دے جو افسوس ہے کہ روز بروز خاکستر سے بھرتا جاتا ہے!!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوَفِّيُ الْوَعْدَ الَّذِي
 فِي التَّهَارُوتِ وَيُوَفِّيهِمُ الْوَعْدَ الَّذِي
 فِي الْاَيْلِ وَانَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ
 بَصِيرٌ (۲۲:۶۰)

یہ امید اس لیے ہر کہ قدرتِ الہی کی نیرنگیوں سے
 ایسا ہونا کچھ بعید نہیں۔ وہ رات کی ظلمت سے دن کی
 روشنی کو اور دن سے رات کو پیدا کرتا ہے اور ہماری حکم
 امیدوں کو دیکھتا اور وعادوں کو سناتا ہے۔

لیکن مایوسی پیام موت ہے

لیکن ساتھ افسوس ہے کہ موجودہ جس مصائب اور استیلائے غم و اندوہ
 کا رخ تباہ و اعتبار کی طرف نہیں ہے، بلکہ عموماً مایوسی اور ناامیدی کی صورت
 میں ہے جس طرف دیکھتا ہوں، سقوط ایڈریانوپل کے حادثہ پر یا سرقند کے
 جذبات کو احاطہ کیے ہوئے پاتا ہوں لوگ کہتے ہیں کہ اب کیا باقی رہ گیا ہے
 جس کے لیے امید کی جائے؟ اور قسمتیں نے کیا چھوڑا ہے، جو مہنتوں میں
 مستعدی پیدا کرے؟ اب یا تو ماتم کی صفیں کچھائیے یا سیلابِ بدبختی کی رو
 پر اپنے تئیں چھوڑ دیجیے کہ جب ڈوبنا ہی ہو تو لہٹھ پاؤں ہلانے سے کیا فائدہ؟
 پھر کیا آخری سوالات کا وقت آگیا؟

بہتر ہے کہ اس بارے میں میری زبان پر صاف صاف سوالات ہوں،
 پھر کیا وقت آگیا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جائیں؟ کیا ہم یہ سمجھ لیں
 کہ امید و یاس کی تقسیم میں اب ہمارے لیے صرف یاس ہی رہ گئی ہے، اور
 تکمیل فنا میں جس قدر وقت باقی رہ گیا ہے، اُس میں صرف رفتہ کا ماتم، اور
 آئندہ کی ناامیدی دوہری کام کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں؟ کیا یہ جو کچھ ہو رہا
 ہے، ہماری زندگی کی آخری ساعات اور موت کے احتضار کی آخری حرکت ہے؟

کیا چرغ میں تیل ختم ہو گیا اور بجھنے کا وقت قریب ہی؟ اور سب سے آخر
یہ کیا اعداد اسلام اور اسلام کا آخری مقابلہ ہو چکا، اور دیسوع کی مصلوب
اور مردہ لاش نے خدائے حی و قیوم پر فتح پالی؟

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات مختلف شکلوں میں آج بہتوں کے سامنے
ہونگے، ممکن ہے کہ مایوسی کا غلبہ میرے اعتقاد کو مغلوب کر لے اور اس لیے
ممکن ہے کہ میں تسلیم کر لوں کہ ہمارے بٹنے کا وقت آ گیا ہے، مگر میں نہیں سمجھ
کہ کوئی مسلم قلب، جس میں ایک ذرہ برابر بھی نور اسلام باقی ہے، ایک منٹ
ایک لمحہ، ایک دقیقے اور ایک عشرِ دقیقے کے لیے بھی اس کو مان سکتا ہے کہ
اسلام کے بٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

انسانوں ہی نے ہمیشہ انسانوں کو مغلوب کیا ہے اور نئی قوموں نے
ہمیشہ پرانی قوموں کی جگہ لی ہے۔ اس کا حریف اس عالم میں دیو نہیں بلکہ
انسان ہی ہے پس یہ کوئی عجیب بات نہیں اگر ہم کو ہمارے سیزدہ صد سالہ
دشمن آج مغلوب کر کے فنا کر دیں، مگر اے خدا کی رحمت کی توہین کرنے والو!
میں یہ کیونکر مان لوں کہ ایک مصلوب لاش حی و قیوم خدائے ذوالجلال کو مغلوب
کر سکتی ہے؟ اور مایوسی خواہ کتنی ہو، مگر کیونکر تسلیم کر لوں کہ انسان نے گروہ خدائے
قادر و ذوالجلال کی جبروت و کبریا کی شکست دے سکتے ہیں؟

حیران ہوں کہ آج مسلمان مایوس ہو رہے ہیں، حالانکہ میں تو کفر
مایوسی کے تصور سے کانپ جاتا ہوں، کیونکہ یقین کرتا ہوں کہ مایوس ہوتا
اُس خدائے ذوالجلال و الاکرام کی شانِ رحمت و ربوبیت کے لیے سب سے بڑا

انسانی کفر اور اس کی جناب میں سب سے بڑی ذلیل آدم کی شورش جتنی ہو تم
جوان بر باد یوں اور شکستوں کے بعد مایوس ہو رہے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے خدا
اسلام کی قوت و رحمت کو کس پیمانہ سے ناپا کر؟ وہ کو کسا کا ہن الہیس ہر جس
نے خدا کے خزانہ رحمت کو دیکھ کر نہیں بتلا دیا ہر کہ اب اس میں مہربانی لے
کچھ نہیں؟ اَطْلَعُ الْغَيْبِ اَمْ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۸۲:۱۹) آہ
عِنْدَ هُمْ الْغَيْبِ فَهُمْ يَكْتُمُونَ (۵۲:۳۲) پھر تم کو کیا ہو گیا ہر کہ تم مایوس
ہو رہے ہو اور کہیں تم نے خدا کی طرف سے منہ پھیر لیا ہر؟ تم کہتے ہو کہ اب
ہمارے لیے مایوسی کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ایک مسلم دل کے لیے نانا امیدیں
سے بڑھ کر کوئی کفر نہیں ہر۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِذَا تَكَادُ
الْاَسْمٰوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ
وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ
هَٰذَا اٰل (۱۹:۹۳)
یہ تو تم نے ایسی بڑی سخت بات منہ سے نکالی
ہر جس کی وجہ سے عجب نہیں کہ آسمان پھٹ
پڑیں زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے
ریزے ہو کر زمین کے برابر ہو جائیں۔

امید و تم
وَمَنْ يَّقْنُظْ مِنْ سَخْمَتِ اِلٰہِ
الْكَافِرُوْنَ؟
خدا کی رحمت سے کافروں کے سوا اور کون
مایوس ہو سکتا ہر؟

انسان شاید یاس و امید کے بارے میں کچھ فطرتاً حاصل ہر اس کی
فطرت سادہ بچوں کی مثال سے واضح ہوتی ہر بچوں کا قاعدہ ہر کہ ہر حالت
کا اثر بغیر فکر و تدبر کے دفعۃً قبول کر لیتے ہیں روئے ہوئے بچے کو سٹھائی کا

ایک لکڑا پکڑا دیجیے تو ہنسنے لگتا ہے، اور چھین لیجیے تو فوراً چل جاتا ہے۔
 بعینہ یہی حال عقل و فکر کے نشوونما کے بعد بھی انسان کا ہوتا ہے۔
 البتہ تاثر و نتائج کی صورت بدل جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اسی فطرت انسانی
 کی محبت پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جبکہ کہا ہے کہ **خُلِقَ الْإِنْسَانُ**
مِنْ عَجَلٍ انسان کی خلقت میں جلد بازی اور تعجل کا ہے۔
 مصائب کے جس اور شادمانی کے غرور میں بھی دیکھیے تو اس کی
 یہی جلد بازی اور زود اثری ہر موقع پر کام کرتی ہے۔ وہ کس قدر جلد غمگین
 ہو جاتا ہے اور پھر ایک روتے ہوئے بچے کی طرح جس کے ہاتھ میں مٹھائی
 کا لکڑا دیدیا گیا ہو کس قدر جلد خوش ہو جاتا ہے؟ اس کی مایوسی اور امیداری
 دونوں کا یہی حال ہے۔ جب کبھی وہ اپنی کسی توقع میں ناکامی دیکھتا ہے تو فوراً
 مایوس ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور پھر جب کبھی کوئی کامیابی کی خبر سن لیتا ہے تو
 اُمید و مسرت کے ضبط سے عاجز ہو کر اچھل پڑتا ہے۔ حالانکہ نہ تو اس کو
 اُن اسباب کی خبر ہے جو غم و ناامیدی کے پیچھے ظاہر ہونے والے ہیں، اور
 نہ اُن عواقب و نتائج کی خبر ہے جو بشارت اُمید کے بعد پیش آنے والے
 ہیں۔ اس کی خدا پرستی بھی اس جلد بازانہ یاس و بیم سے شکست کھا جاتی ہے۔
 اگر کوئی خوشی حاصل ہوتی ہے تو سمجھتا ہے کہ خدا میرے ساتھ ہے، اور اگر نتائج
 حالات اور مشیت الہی کسی ابتلا و مصیبت میں ڈال دیتی ہے تو دیوانہ وار
 مایوس ہو جاتا ہے کہ خدا نے مجھ کو چھوڑ دیا۔ سوئے و الغر میں اسی حالت کی طرف
 اشارہ کیا ہے اور تمہارے اندر وہ کونسی شے ہے جس کی طرف قرآن نے اشارہ نہیں کیا؟

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ
وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۖ وَإِنَّمَا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ
فَعَتَدَ عَلَيْهِ سَيْئًا فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ (۸۹: ۱۵)
انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اس
کے ایمان کو اس طرح آزماتا ہے کہ اس کو دنیا میں عزت
اور نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ فوراً خوش ہو جاتا ہے اور
کہتا ہے کہ میرا پروردگار میرا اعزاز و اکرام کرتا ہے اور
جب اُس کے ایمان کو کسی آدمائش میں ڈال کر
اس طرح آزماتا ہے کہ اُس کا رزق اُس پر تنگ کر دیتا
یعنی مصیبت میں ڈال دیتا ہے تو پھر معافا یوس
ہو کر کہنے لگتا ہے کہ میرا پروردگار تو مجھے ذلیل کر رہا ہے اور میرا کچھ خیال نہیں کرنا

حیاتِ اُمید و موتِ قنوط

منجملہ اس حالت کے سب سے زیادہ خطرناک مگر اسی انسان کی
وہ مایوسی ہے، جو مصائب و آلام کا ہجوم دیکھ کر اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے
اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے مستقبل کے لیے نامرادی و ناکامی
کی بنیاد رکھ دیتا ہے۔

مایوسی سے بڑھ کر کوئی شر، انسانیت کے لیے قاتل و مہلک نہیں
اور دنیا کی تمام کامراناں صرف اُمید کے قیام پر موقوف ہیں۔ یہ اُمید
ہی ہے جس نے زمینوں پر قبضہ کیا ہے، پہاڑوں کے اندر سے راستہ پیدا
کیا ہے، سمندر کی قناری کو مغلوب کیا ہے اور جب چاہا ہے اُس میں اپنی
سواری کے مرکب چلائے ہیں اور جب چاہا ہے اس کے کناروں کو
میلوں اور فرسخوں تک خشک کر دیا ہے۔ پھر اُمید ہی ہے جس نے مردہ

قلوب کو زندہ کیا ہے، ہنتر مرگ سے بیماروں کو اٹھایا ہے، ڈوبتوں کو کناروں تک پہنچایا ہے، بچوں کو جوانوں کی تیزی سے دوڑایا ہے اور بوڑھوں کو جوانوں سے زیادہ قوی و طاقتور بنا دیا ہے۔

جبکہ تو قیں جواب دے دیتی ہیں، جبکہ زمانہ منہ پھیر لیتا ہے، جبکہ زمین کے کسی گوشہ سے صدائے ہمت نہیں آتی، اور جبکہ تمام اعضاء عمل جواب دیدیتے ہیں تو اُمید ہی کافرشتہ ہوتا ہے، جو مسکرا کر ہوا آتا ہے، اپنے پروں کو کھولتا ہے، اور اس کے سایہ میں لے کر قوت و طاقت، ہمت و مستعدی، جستی و چالاکی کی ایک روح تازہ دلوں میں پیدا کر دیتا ہے!

دنیا میں کامیابی اعمال کا نتیجہ ہے اور اعمال کے لیے پہلی چیز اُمید ہے۔ جب تک انسان کے اندر اُمید قائم ہے، مصیبتوں اور ہلاکتوں کے اگر غریت بھی سامنے آکھڑے ہوں، تو بھی اس کو شکست نہیں دیکتے۔ اگر خون اور اُس کا دوران انسان کی جسمانی حیات کے لیے ضروری ہو تو یقین کیجیے کہ اخلاقی و ادبی حیات کے لیے اُمید اُس کے اندر منزلہ روح کے ہے جب تک اس کا دوران دل سے اٹھ کر یا باصطلاح حال دماغ سے نکل کر جسم کے تمام گوشوں میں حرارتِ عمل پیدا کر رہا ہے اس کی قوتِ عمل زندہ، اس کے اعضاء کا متحرک اور بے مستعدی سرگرم ہو جائیں، لیکن جہاں یہ روح حیات دل سے نکلی، پھر جسم انسانی کے لیے قبر کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔

ایک شخص جب مایوس ہو گیا، جب اُس نے یقین کر لیا کہ اب

اس کے لیے دنیا میں کچھ نہیں، جب اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اب خدا
اُسے کچھ نہ دیگا، تو ظاہر ہے کہ اُس کا دماغ کیوں نہ سوچے؟ دل میں منگ
کیوں پیدا ہو؟ ہاتھ کیوں بے؟ اور پاؤں بڑھنے کے لیے بھیوں متحرک ہوں؟
قوموں کی زندگی کی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا
دل اُسد کا دائمی آشنا نہ ہوتا ہے، اور خواہ نا کامی اور مصائب کا کتنا ہی
ہجوم ہو مگر اُسید کا طائر مقدس ان کے دل کے گوشے سے نہیں اڑتا۔
وہ دنیا کو ایک کارگاہِ عمل سمجھتے ہیں، اور اُسید کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے
صرف تمہارے ہی لیے ہے۔ اگر آج تمہارا س پر قابض نہیں ہوں تو غم نہیں،
کیونکہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لیے ہونے والی ہے۔
مصیبتیں جس قدر آتی ہیں، وہ ان کو صبر و تحمل کی ڈھال پر روکتی
ہیں، اور غم و اندوہ سے اپنے دماغ کو معطل نہیں ہونے دیتے، بلکہ
مصیبتوں کو دور کرنے اور ان کی صفوں پر غالب آنے کی تدابیر پر غور
کرتے ہیں۔ نامرادی ان کے دلوں کو مجروح کرتی ہے، پر مایوس نہیں
کرتی، اور غم کے لشکر سے ہزیمت اٹھاتے ہیں، پر بھاگتے نہیں۔
دنیا ایک میدانِ کارزار ہے، اور جس چیز کو تم عمل کہتے ہو دراصل
یہ ایک حریفانہ کشمکش اور مقابلہ ہے جس طرح جنگ میں رہنے والے
سپاہیوں کو فتح و شکست سے چارہ نہیں، وہ کبھی زخمی کرتے ہیں اور
کبھی خود زخمی ہوتے ہیں، اسی طرح دنیا میں بھی جو مخلوق بستی ہے اُسے
کامیابی اور ناکامی اور فیروز مندی و نامرادی سے چارہ نہیں۔ کیا

ضرور کہ ہمیشہ ہماری تلوار اور دشمن کی گردن ہو؛ کیوں نہ ہم اپنے سر
سینے میں بھی زخم کے نشان پائیں؛ بستر پر آرام کرنے والوں کو رونا
چاہیے کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا، لیکن سپاہی گوزخموں پر زخم کھا کر بھی آف
نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس کی جگہ تو بستر نہیں، بلکہ میدان جنگ ہے۔

شکت و زخم کا خوف ہے تو میدان جنگ میں قدم ہی نہ رکھو،
اور تلووں کو بچانا چاہتے ہو تو تمہارے لیے بہتر جگہ پھولوں کی سیج ہے۔
چلو گئے ٹھوکر کھاؤ گے اور لڑو گے تو زخم سے چارہ نہیں پس اگر ٹھوکر
لگی ہے تو آنکھیں کھولو اور بیٹھ کر رکنے کی جگہ تیزی سے چلو، کیونکہ جتنی
دیر بیٹھ کر تم نے اپنا گھٹنا سہلایا، اتنی دیر میں قافلہ اور دور نکل گیا۔

پھر اگر دشمن کی کاٹ نے زخمی کیا ہے تو بھاگتے کیوں ہو؟ مایوسی
خودکشی ہے اور اُمید زندگی، اور زیادہ چابک دستی سے پیکار جنگ کے لیے
تیار ہو جاؤ، کیونکہ جب تک دوسروں کو زخمی کرتے تھے، زیادہ ہمت
مطلوب نہ تھی، لیکن زخم کھا کر تم نے معلوم کر لیا کہ دشمن توقع سے زیادہ
قوی ہے اور اب پہلے سے زیادہ ہمت اور مستعدی مطلوب ہے۔

میں نے کہا کہ قومی زندگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ اس
کا ہر فرد ایک پیکر اُمید ہوتا ہے، اور اپنے دل کو اُمید کی جگہ سمجھتا ہے نہ کہ
مایوسی کی۔ لیکن اتنا ہی نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زندہ قوموں کے
لیے مایوسی کے اسباب ہی میں اُمید کا پیغام ہوتا ہے اور مصیبتیں جتنی بڑھتی
ہیں، اتنی ہی وہ اپنی اُمید کو اور زیادہ محبت اور پیار سے پالتے ہیں

مصیبتیں ان کو مایوس نہیں کرتیں، بلکہ غفلت سے ہشیا رکھ دیتی ہیں اور عبرت و تنبیہ کی صورت میں ان کے سامنے آتی ہیں۔ وہ مصائب کے سیلاب کو دیکھ کر بھاگتے نہیں بلکہ اُس راہ کو ڈھونڈھ کر بند کرنا چاہتے ہیں، جہاں سے اُس نے نکل کر بہنے کی راہ نکالی ہو۔

پس مصائب اُن کے لیے رحمت ہو جاتے ہیں، اور نامرادی اُن کے لیے کامیابی کا دروازہ کھول دیتی ہے، وہ جس قدر کھوتے ہیں اتنا ہی زیادہ پلٹتے ہیں، اور جس قدر گرہ لگتے ہیں اتنا ہی زیادہ مستعدی سے اُٹھتے ہیں۔ وہی دنیا جو کل تک اُن کے لیے نامرادیوں کا دوزخ تھی یکایک کامیابیوں کا بہشت بن جاتی ہے، اور جس طرف دیکھتے ہیں، تحت فتحیابی بچے ہوئے اور انہار کا مرانی بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہی بہشت اُمید ہے جس کے بہنے والوں کی نسبت کہا گیا ہے کہ :-

مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ کامیابی و فیروز مندی کے تحت پر کیے لگے
لَا يَرْوُونَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا بیٹھے ہونگے، غم و اندوہ کی سوزش و تپش کا
ذَهَبًا انہیں حسرت ہوگا۔ (۷۱:۱۲)

کیونکہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، پس دنیا بھی ان کو مایوس نہیں کرتی۔

ہلاکت اُمید اور موت قنوط

لیکن اسی طرح قومی زندگی کے ایامِ حیات، اور انسانی ارتقاء کے حیات کا سد باب اُس دن سے شروع ہونا ہے جس دن کا شانہ دل

سے اُسید کا جنازہ اٹھتا، اور مایوسی کا لشکر فناء مند تاہر جس فرد یا جس قوم کو مصیبتوں اور ناکامیابیوں کے عالم میں مایوس دیکھو، یقین کرو کہ اس کا آخری دن آگیا مصیبتیں تو اس آیتے تھیں مگر غفلت کو شکست اور ہمت کو تقویت ہو، لیکن جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں، دنیا کے اعمال و تدابیر کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں، اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہمارے لیے دنیا میں کچھ نہیں رہا، وہ تو خود اپنے لیے زندگی کے بدلے موت کو پسند کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی کامیابی زندگی کو لوٹ کر لینے والوں کے لیے سڑک بن جاتے ہیں۔ مثلاً شیعوں کے لیے نہیں ہے دیکھو! قرآن کریم نے کیسے جامع الفاظ میں ایسے لوگوں کی حالت اور ان کی مایوسی کے نتائج کی طرف اشارہ کیا ہے اور اُس نے کس چیز کی طرف اشارہ نہیں کیا، مگر افسوس کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس کی صداؤں پر کان لگاتے ہیں!

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَبْذُلُ
اللَّهُ عَلَىٰ مَخْرَفٍ ذِيَانِ
أَهْلًا بِهِ خَيْرٌ أَطْمَآنَ
بِهِ ذِيَانِ أَهْلًا بِهِ فَنَنْتِ
الْقَلْبَ عَلَىٰ وَجْهِ خَسَرٍ
الذُّنْبَاءُ الرَّحْمَةُ ذِيَانِ
هُوَ الْحُسْنَانِ الْمُبِينُ ۝

اور انسانوں میں بعض ایسے ہیں جو خدا کی پرستش تو کرتے ہیں مگر ان کے دلوں میں استقامت نہیں ہوتی مگر ان کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو مطمئن ہو گئے اور اگر کبھی مصیبت آپڑی تو جلد صبر سے اُٹھ گئے اُلٹے پاؤں اُدھر سے کو لوٹ گئے (یعنی مایوس ہو کر ایمان سے ہاتھ اٹھایا) یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی دنیا بھی کھو لی اور آخرت بھی اور یہی سب سے بڑا اور مریخ

نقصان ہے۔

(۱۱:۲۲)

فرمایا کہ ”خسر الدنیا والآخرۃ“ کیونکہ مایوسی کے بعد انسان کی قوت عمل معطل ہو جاتی ہے۔ پھر نہ وہ صرف دنیا ہی میں ناکام و نامراد رہتا ہے بلکہ عاقبت کی خوشحالی سے بھی اسے ناامیدی ہی ملتی ہے۔

انسان کا فرض سعی و تدبیر ہے۔ اور وہ جب تک اس دنیا کی سطح پر باقی ہے، اس کو سعی و کوشش سے باز نہیں آنا چاہیے۔ ہمارا کوئی عزیز بیمار ہوتا ہے، اور اس کی حالت صحت کی طرف سے مایوس کر دیتی ہے، ڈاکٹر بھی جواب دے دیتے ہیں، تاہم سعی و علاج سے آخری ساعات نزع تک باز نہیں آتے جب افراد کے ساتھ ہمارا حال یہ ہے، تو تعجب ہے کہ قوم و ملت کے ساتھ نہ ہو؟ کس کو معلوم ہے کہ کب دروازہ رحمت کھلنے والا ہے؟ اور کب بارش ہونے والی ہے؟ دہقان کا کام صرف یہ ہے کہ تخم پاشی کرتا رہے

چوں دم بمدم عنایت تو فین ممکن است
در تنگنائے نزع نہ کوشد کے چسرا؟

فتح و شکست کا اصلی میدان

دل کے اندر ہے نہ کہ اُس سے باہر

یہاں تنگ میں نے جو کچھ لکھا، یہ عام انسانی حالت کے اعتبار سے تھا، لیکن اب سوچنا چاہیے کہ بہ حیثیت اسلام کے اس وقت ہیں کیا کرنا چاہیے؟

پھر میں نہیں سمجھتا کہ اگر موجودہ جنگ میں ہر طرف نتیجہ شکست ہی ہو

اور مسلمانوں کو اپنے آخری دنوں میں ایک سب سے بڑی نقصان رسا
 شکست اٹھانی پڑی تو اس سے فرزند ان اسلام مایوس کیوں ہو جائیں؟
 اگر ایڈریانو پل چھ مہینے کی عظیم النظیر مدافعت اور آخر کے محیر العقول مقابلہ
 و مقابلہ کے بعد بالآخر قدرتی اسباب و حالات کی بنا پر مفتوح ہو گیا تو پھر
 چالیس کروڑ فرزند ان اسلام کی حصن اُمید لشکر مایوسی سے کیوں مفتوح
 ہو جائے؟ یہ سچ ہے کہ ہمارے دشمنوں نے میدان جنگ میں ہمیں شکستیں
 دیں لیکن ابھی وہ اس اُمید کو تو شکست نہیں دے سکتے جو ہر مسلم دل کو اسلام
 کے خدائے قادر و قیوم سے ہونی چاہیے؟

ایک لاکھ سے زیادہ سروی و بلغاری لشکر توپوں کے دہانے
 کھول کر اگر ایڈریانو پل کی مٹی کی دیواروں کو ڈھک دیتا ہے تو یہ کونسا دنیا
 کا نیا اور عجیب واقعہ ہے؟

اُس قوم کے لیے کونسی شرم کی بات ہے جس نے سترہ ہزار فوج
 کے ساتھ ایک بے پناہ اور مٹی کی دیواروں سے بنے ہوئے مقام میں
 چھ مہینے تک مدافعت کی ہو؟ اس پر ہمیں ماتم لشین ہونے کی ضرورت
 نہیں ہم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں مان سکتے کہ بلغاری و سرویوں نے
 ہماری جرأت و شہامت کو شکست دے دی۔ او اُس خاندان اسلام کے
 ماتم گسارو! جس کے چالیس کروڑ فرزند اس وقت سطح ارضی پر جیتے پھرتے
 ہیں! اگر یہ سچ ہے کہ تمہارے دل بھی مایوس ہو گئے ہیں اور تمہارے دل کے
 اندر خدائے ابراہیم و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) نے جو چراغ امید روشن

کیا تھا وہ بھی بچھ گیا ہے، تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعی سردی اور
بخاری مجاہدین نے تم کو شکست دے دی، اور تیرہ سو برس کے اندر
دنیا کی ٹڑی ٹڑی طاقتیں اور انسانوں کے بڑے بڑے لشکر جس دشمن
کو گرانہ سکے تھے، آج واقعی بلقان کی چند ریاستوں کے اجراع نے اُسے
گرا دیا!!

ہاں اگر یہ سچ ہے تو بیشک تمہاری لافنا زندگی کو جسے قیصر روم
اور کسرلے فارس موت سے بدل نہ سکا تھا، اس نے مجروح کر دیا ہے۔
تمہارے ان آہنی جسموں کو جنہیں یرموک کے میدان میں متمدن رومیوں
کے لاکھوں تیروں کے نشانے زخمی نہ کر سکے تھے یقیناً اس نے خاک و
خون میں تڑپا دیا ہے اور تمہارے ان نشانہ مارے توحید اور علمہائے دین الہی
کو جسے آٹھ صلیبی حملوں کے لاکھوں نیزے بھی نہیں گرا سکے تھے، سچ یہ کہ
کہ سروبا کے شورچرانے والوں نے آج پارہ پارہ کر کے گرا دیا ہے۔ پھر اس
میں شک نہیں کہ تم مر گئے، تم جو کبھی نہیں مر سکتے تھے، یقیناً مر گئے تم، کہ
تمہاری رگوں کے اندر خدا کی روح جلال جاری رساری تھی، اور اُس کی
نسرت و حمایت کے ملائکہ مسوین تمہارے آگے دوڑتے تھے، یقیناً آج
مر گئے۔ پس جس قدر تم کو ماتم کرنا ہو کر لو، اور جس قدر جلد اپنی قبر گھود سکتے ہو گھود
لو، کیونکہ خدا کی رحمت اور دنیا کی زندگی صرف اُمید رکھنے والوں کے لیے ہے
اور مایوسی کا نتیجہ موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ خدا تم کو نہیں چھوڑنا پر تم سے
چھوڑ رہے ہو۔ وہ تمہاری طرف دیکھتا، لیکن تم نے نا اُمید ہو کر اس کی طرف

سے متنبہ ہوڑ لیا، تم کو معلوم نہیں کہ یہی مایوسی ہر جس کو تمہارے حذل نے کفر کی خود کشی سے تعبیر کیا ہو۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنَّ لَنْ
يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ
بَسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ
ثُمَّ لِيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ
هَلْ يُدْهِبُ كَيْدَهُ
مَا يَعْظُمُ وَكَذَلِكَ
أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ
بَيِّنَاتٍ وَأَنَّ اللَّهَ
يَهْدِي مَنْ يُوْرِيهِ

جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبت ایسا ظن بدرکھتا ہو کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اُس کی مدد کرے ہی گا نہیں، تو پھر اُس کو چاہیے کہ اوپر کی طرف ایک رستی تالے، اور اُس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگالے اور اس طرح زمین سے (جہاں اب وہ اپنے لیے صرف مایوسی سمجھتا ہے) اپنا تعلق قطع کرلے، پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کی وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوس ہو رہا تھا، دور ہو گئی ہو یا اسی طرح ہم نے قرآن کریم میں ہدایت و فلاح کی روشن دلیلیں اتاری ہیں، تاکہ تم اس پر غور کرو اور اللہ جس کو چاہتا ہو اُس کے ذریعہ سے ہدایت بخشا ہو۔ (۱۵: ۲۲)

ہنوز آں ابر رحمت در فشانست

سب سے پہلے تو ہم مایوسی کے اس حصہ ہی کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ دولت عثمانیہ اور ترکوں کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اس جنگ نے انہیں اب بالکل عضو معطل کر دیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے، ابھی اس کے بعد سمجھنے کے لیے کئی میدان باقی ہیں اور اگر عبرت اور تنبیہ کی یہ سب سزائیں بے اثر نہ رہیں اور رقیہ قوائے عالمہ کو ابھرنے اور کام کرنے کی توفیق

مل جائے تو اب بھی یہ قوم جس کی شمشیر آٹھ سو برس سے علم اسلامی کے لیے مدافعت کر رہی ہے، پنپ سکتی ہے اور حالات فوراً متغیر ہو جاسکتے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ واقعات کا مطالعہ کرنے کے لیے دو طرح کی نظریں رہی ہیں ایک اُمید کی اور دوسری مایوسی کی۔ حکمائے یونان کی نسبت سنا ہوگا کہ آثار و نتائجِ عالم پر بحث کرتے ہوئے ان میں دو مختلف مذاہب اُمید اور مایوسی کے تھے پھر جس طرح کی نظر سے تم دنیا کو دیکھو گے، وہ اسی رنگ میں نظر آئیگی۔ مایوسی کی نظر سے دیکھو تو اُس کے دلائل بے شمار ہیں، اور اُمید کا مذہب اختیار کرو تو اس کے پہلو مایوسی سے کم نہیں۔ اسلام ہم کو ہمیشہ اُمید کی تلقین کرتا ہے، پس کیوں نہ ہم اُمید کے پہلوؤں ہی پر نظر ڈال لیں؟

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو
 بایں ہمہ حالات ترکوں کی طرف سے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ اور اگر پھر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اب ترکوں کی قوت کا بالکل خاتمہ ہو گیا تو غم کو خدا کے لیے جواب دہ کر کیا تمہارے خدا کی قوت کا بھی خاتمہ ہو گیا؟ مان لو کہ ترکوں کی تلوار رنگ آلود ہو گئی تھی اور اب ٹوٹ کر ان کے ہاتھوں سے گر گئی ہے، لیکن کس کو معلوم ہے کہ ابھی خدا کے لازوال خزانہ قدرت میں اور کتنی غیر مستعمل تلواریں پڑی ہیں، جن کو وہ اپنے دین میں اور کلمہ محبوب کی ہدایت کے لیے چمکا سکتا ہے؟ اسلام ایک قوتِ اُمید ہے، جس کی زندگی انسانوں اور قوموں سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ قوموں کی

زندگی اس کی متابعت اور معیت وابستہ ہو۔ پھر قومیں مٹ سکتی ہیں اور انسان کے فانی جسم مٹ سکتے ہیں، پردہ نہیں مٹ سکتا وہ اپنے خدائے لازوال کی غیر فانی قوت کے ساتھ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ کیونکہ وہ صداقت ہے، اور صداقت کب نہ بھٹی اور کب نہیں رہیگی؟

اسلام کا ظہور ترکوں کے ظہور کے ساتھ نہیں ہوا ہے، بلکہ ترکوں نے اُس کے دم سے اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہے۔ کیا تیرہ سو برس پہلے جب غار ”حرا“ کے غاروں سے حق کی روشنی چمکی، تو اُس وقت ترکوں کا اُٹھنا اس کا محافظ تھا؟ کیا ”بدر“ اور ”حنین“ کے میدانوں میں ترک نکلے جن میں سے تین سو فائدہ مستیوں نے تین ہزار جواتان عرب کو خاک و خون میں ملا دیا تھا؟ کیا ”یرموک“ اور ”قادسیہ“ کے معرکہائے خونیں میں وہ ترک ہی تھے، جنہوں نے رومیوں اور ایرانیوں کی ہزاروں لاشوں سے صحرائے شام و مدائن کو بھردیا تھا؟ وہ قوم جس نے تخت کسریٰ کی ہزار ہا سالہ عظمت کا خاتمہ کر دیا تھا، ترکوں کی تو نہ تھی۔ جس نے سب سالار روم کے سامنے اپنے نیزے کو ریشمین قالین کے اندر سے زمین میں چھبھو دیا تھا، یقیناً کوئی ترک تو نہ تھا۔

پھر ”دمشق“ اور ”بغداد“ کے تخت پر کون تھا؟ اور کن کے گھوڑے تھے، جنہوں نے (بحر الکابل) کے مہلک طوفان سے گزر کر جبل الطارق پر علم توحید بلند کر دیا تھا؟ ترکوں کو تختِ خلافت اسلامی پر قدم رکھے کتنے دن گزرے ہیں؟ خدا کے لیے ان سوالوں کا جواب دو! ترکوں

سے پہلے جس قوت نے ہمیشہ علم توحید کی حفاظت کی ہو کیا وہ آج
 ترکوں کے بعد کسی دوسری قوم کو پہنچ کر نہیں کر سکتی؟ نادانوں! تم نے اگر
 اللہ کی بخشی ہوئی حکومت و عزت کو کھو دیا ہو تو غم نہیں، لیکن یہ کیسا
 بد بختی ہو کہ اپنے دلوں اور دلوں کی روح اُمید کو بھی کھو رہے ہو؟
 اس تیرہ سو برس کے اندر کتنی قومیں آئیں اور اپنی اپنی باری میں
 حفاظت اسلام کی خدمت انجام دے کر چلی گئیں۔ جب تک انہوں
 نے اسلام کا ساتھ دیا اور اپنے اعمال و اعتقادات میں اس سے منہ
 نہیں موڑا، اس وقت تک وہ بھی ان کے ساتھ رہا، لیکن جب انہوں
 نے اپنی صلاحیت اور قابلیت کھو دی، اور اس مقصد کو بھول گئے،
 جس کی انجام دہی کے لیے زمین کی وراثت ان کو دی گئی تھی، تو
 ان کا دور کار فرمائی ختم ہو گیا اور اللہ نے اپنے دین کی حفاظت کی اہمیت
 کسی دوسری جماعت کے سپرد کر دی۔ وہ اپنے کلمہ مقدس کی حفاظت
 کے لیے ہمارا محتاج نہیں ہو، بلکہ ہم اپنی زندگی کے لیے اس کے دین میں
 کی خدمت گزاری کے محتاج ہیں

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ
 اِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ
 الْحَمِيدُ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ
 وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ وَمَا
 ذَلِكُمْ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ
 اور لوگو! تم اللہ کے دروازہ فضل و توفیق کے محتاج
 ہو اور اللہ تو بے نیاز اور بے نیازی کی تمام صفات
 سے متصف ہو۔ اگر وہ چاہے تو تم کو چھوڑ دے اور
 تمہاری جگہ اپنی دوسری مخلوقات کو بے نیاز
 اور یا کرنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔

دوسری جگہ سورہ نسا میں ارشاد ہوا ہے۔

وَلَا تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ
مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي
الْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ غَنِيًّا
حَمِيدًا ۝ وَاللَّهُ عَلَى السَّمَوَاتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفَى
بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝ إِنَّ تَشَا
يُذْهِبْكُمْ أَهْلُهَا النَّاسُ
وَيَاتِ بِآخِرِينَ وَكَانَ
اللَّهُ عَلَى ذَلِكَ قَدِيرًا

اور اگر تم اس کے آگے نہ جھکو گے تو وہ تمہارا کچھ
محتاج نہیں ہے کیونکہ آسمانوں اور زمینوں میں
جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے زیرِ حکم ہے اور وہ بے
نیاز اور ہمہ صفت موصوف ہے۔ اگر وہ چاہے تو
ای مفرورانہ نوا تم سے اپنی زمین کو حائل
کر دے اور اُس کی جگہ دوسری قوموں کو لا
سکے اور وہ ایسا کرنے کی پوری قدرت
رکھتا ہے۔

لَا تَأْسُوا مِنْ سُرُوحِ اللَّهِ

نومید مشو، کہ نا اُمیدی کفر است

پھر یہ ممکن ہے کہ اس کائنات ارضی کا ہر مخلوق نا اُمید ہو جائے
یہ بھی محال نہیں کہ دنیا کی تمام قومیں اور تمام انسانی جماعتیں مایوسی کو
اپنا قبلہ مقصود بنا لیں لیکن جن لوگوں کے دلوں کو اسلام کی امانت
سپرد کی گئی ہے وہ تو کبھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ اسلام سترائے اُمید ہے، اور
اور وہ جب کبھی کسی انسان کا ہاتھ کپڑتا ہے تو پہلی چیز جو اسے دیتا ہے وہ
اُمید ہی ہے۔ اس کی اصطلاح میں ایمان اُمید کا نام ہے اور مایوسی کفر
کا سبب ہے۔ حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی کہ :-

لَا تَأْتِسُوا مِنْ تَرْفِجِ اللَّهِ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو اس کی رحمت سے کوئی
 إِنَّهُ لَا يَأْتِسُوا مِنْ دَوْجِ مایوس نہیں ہو سکتا مگر وہی بد بخت قومیں جنہوں نے اپنے
 اللَّهُ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ دلوں کو کفر کا آشیانہ بنالیا ہے۔ (۱۸: ۱۳)

اس کی پہلی آواز اپنے ہر پیرو کے لیے یہ ہے کہ ”لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ“
 وہ مایوسی کو کسی حال میں ایک مومن کے لیے جائز نہیں رکھتا اور کہتا ہے وَمَنْ
 يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ إِلَّا الْكَافِرُونَ دنیا میں مسلمان مایوسی کے لیے نہیں پیدا
 کیے گئے ہیں، وہ صرف امید کے لیے ہیں، اور جس نے اس کے لیے نہ ہوں،
 اس دن وہ مسلم بھی نہیں۔ یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے، مگر اس آیت کریمہ کو
 یاد کرو جس سے اس مضمون کا افتتاح ہوا ہے خدا نے مایوس ہو جانے والوں کی
 نسبت فرمایا کہ اگر وہ مایوس ہو گئے ہیں تو ان کے رہنے کے لیے میری پیدا کی
 ہوئی دنیا موزوں نہیں ”فليمد بسبب الى السماء فليقطع ان کو چاہے کہ
 رسی کا پھندا گلے میں ڈال کر خود کشی کر لیں، کیونکہ مایوسی کی دوسری منزل خود کشی
 ہے۔

”الہلال“ اپنی ہر شاعت میں اس صدائے الہی کو دہراتا ہے
 لَا تَقْنَطُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَلْزَمُوا الْأَعْلَىٰ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

تسخیرِ ادرنہ

صبحِ امید کہ بدستگفت پردہ غیب
گوبروں آئے کہ کارِ شب تارِ آخر شد

ادرنہ مسخر ہو گیا۔ فاتحانِ عثمانی شہر میں داخل ہو گئے۔ دُنیا نا اُمید ہو چکی تھی، یورپ سمجھ چکا تھا کہ ترک جاں بلب ہیں، اب وہ اقدام کے قابل ہی نہیں رہے، لیکن قدرتِ کاملہ کے دستِ اعجاز نے اسی بیار سے تندرستوں کو شکست دلائی۔ ترکوں کا اجتماع ہوتے ہی بلغاری مرعوب ہو کر بھاگ نکلے اپنے سچکامات جو بڑی کوششوں سے استوار کیے تھے، اور ان کو ناقابلِ تسخیر سمجھے ہوئے تھے، آپ ڈھادیے، اور خدا کا وعدہ پورا ہو گیا کہ قانونِ الہی کے حدود توڑنے والے اور تعلیمِ رسالت کی بے حرمتی کرنے والے انجامِ کار تباہ و برباد و خستہ و خراب ہو کر رہیں گے۔

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ
وہ خدا ہی جو جس نے اہل کتاب کی اس جہت کو کہ انتقامِ الہی کی منکر ہو چکی تھی، اس کے گھر

سے مسلمانوں کے پہلے ہی اجتماع میں نکال باہر کیا۔
مسلمان سمجھے تھے کہ نہ نکل سکیں گے اور خود ان کو بھی
گمان تھا کہ ان کے قلعے خدا سے ان کو بچا لینگے۔

آخر اس طرح غضب الہی نازل ہوا کہ ان کے دم
و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں پر رعب و
ہست چھا گئی۔ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں ہی
دیران کرنے لگے مسلمانوں نے بھی اس دیرانی
میں انہیں مدد دی جن لوگوں کے آنکھیں ہل
انہیں اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے
خدا اگر ان کی مستی میں اخراج نہ لکھ دے ہوتا تو
دنیا ہی میں ان کو عذاب دیتا، اور آخرت میں تو
ان کے لیے آگ کا عذاب ہو۔ سبب یہ کہ خداؤ
رسول کی تعلیم سے انہوں نے منہ موڑ لیے اور جو
اب کرتا ہوا سے یقین کر لینا چاہیے کہ خدا کا عذاب
ہنایت سخت ہو۔

لَا قَوْلَ الْحَشْرِ مَا طَنَّتُمْ أَنْ
يَخْرُجُوا، وَطَنُوا أَهْلَهُمْ تَأْتِيهِمْ
حُصُونُهُمْ مِنَ اللَّهِ فَأَتَتْهُمْ
اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَ
قَدَفَتْ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ
يُخْرِبُونَ بَيْوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ
وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ، فَاعْتَبِرُوا
يَا أُولِيَ الْبَصَارِ وَلَوْ لَا أَنْ
كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ
لَعَذَّبُكُمْ فِي الدُّنْيَا، وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ
ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُوا اللَّهَ
وَرَسُولَهُ، وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ
فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

(۲: ۵۹)

ایڈریا نزل کو جب بخاریوں نے فتح کیا تو اپریل کے فورٹ ٹائپلی ریویو
میں ایک مشہور انگریز مسٹر ہربٹ دیوین نے لکھا تھا کہ ”ایک لاسکی پیغام نامہ
کے صحرا جبل میں اس خبر کو مشہور کرتا ہوا گذرا کہ پڑانے حبیب فرمانروا (ترک)
کی ماکمانہ زندگی کا آفتاب دھل گیا، عجیب و غریب طلسماتی قلعہ ٹوٹ گیا، جہاد“

اسلامی اتحاد، اور بے شمار مسلمان جنگجو یوں کے غیظ و غضب کے دھوکے کھل گئے۔
 لیکن اب ان کو یقین کرنا چاہیے کہ اسلام کی طاقت کو فریب سمجھنے میں وہ خود
 دھوکے میں تھے۔ اسلام اپنی قہاری کے نتائج دکھانے میں کبھی ناتوان و ضعیف
 نہ نکلیگا۔ اس نے ایک مدت سے پیغام دے رکھا اور یہ پیغام پورا ہو کر رہ گیا کہ:
 سَيُضَارُّهُمْ النَّجْمُ وَيُؤْكَوْنُ الذُّبُرُ
 کفار کی جمعیت عنقریب منہزم ہو جائیگی اور وہ بٹ
 بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ
 دکھا کر بھاگینگے بلکہ ابھی ان کا وعدہ ہوا اور وہ گھڑی
 السَّاعَةُ آدْهَىٰ وَآمَرُ، إِنَّ
 بڑی مصیبت کی تلخ ترین گھڑی ہے۔ یہ گنہگار ہیں، یہ
 الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ
 گمراہی اور آگ میں ہیں، وہ نلنے والا ہے جبکہ منہ
 يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَى
 کے بل یہ آگ میں کھینچے جائینگے، اور ان سے کہا
 وَجْهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ
 جائیگا کہ عذاب دوزخ کا مزہ چکھو۔ ہم نے ہر چیز
 إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ
 کو انداز سے پیدا کیا ہے۔ ہمارے حکم کو ایک ذرا
 وَمَا أَمَرْنَا إِلَّا وَاحِدَةً تَلْجَمُ
 آٹکھ چپکنے کی طرح پہنچا ہوا سمجھو۔ دیکھتے نہیں کہ
 بِالْبَصَرِ، وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا
 ہم نے تمہارے حایموں کو ہلاک کر ڈالا، کیا اب
 أَمْثَلًا عَلَيْكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّذَكَّرٍ
 بھی تم میں کوئی غور و فکر سے کام لینے والا نہیں؟

بطل ادرنہ

ثبت ست بر جریدہ عالم دوام ما
 ایک چرغ سے ہزاروں چراغ روشن ہو جاتے ہیں، آگ کی ایک
 چنگاری بڑے بڑے آتشکدوں اور نمودوں کو شعلوں سے بھر دیتی ہے، ایک
 بیج صد ہا شاخیں اور ہزاروں پھل پیدا کر دیتا ہے، باران رحمت الہی کا ایک شاداب
 دن پوری فصل کو سرسبز کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے، موتی کا ایک بڑا دانہ پوسے
 ہار کی عزت بڑھا دیتا ہے، ہیرے کا ایک درخشندہ ٹکڑا پورے تاج کے حسن و
 جمال کے لیے بس کرتا ہے، کیوڑے کا ایک درخت پورے بلوغ کے معطر ہونے
 کے لیے، گلاب کا ایک قیمتی پھول پورے ایوان و منزل کی رونق کے لیے اور
 بتیشیل سادہ تر ایک چرغ پورے کمرے کی روشنی کے لیے کافی ہوتا ہے۔
 یہی حال قوموں اور ملکوں کا بھی ہے۔ قوموں میں جب زندگی آتی ہے تو
 ہزاروں افراد کے ذریعہ نہیں بلکہ ہمیشہ سرچشمہ حیات ایک یا ایک سے زیادہ
 چند نفوس قلیلہ و عدیدہ ہی میں ہوتا ہے۔ اس عالم کی زندگی قوموں سے ہے مگر
 قوموں کی زندگی صرف اشخاص کے دم سے وابستہ ہے۔ سرزمین انسانیت

میں جب ایک عمدہ بیج بار آور ہو کر سر اٹھاتا ہے تو اس سے صد ہا شاخیں پھوٹتی ہیں اور ان میں ہزار ہا تر و تازہ پھل لٹکنے لگتے ہیں۔

پس باغ کی زمین کی طرح اس سر زمین کی شادابی کے لیے بھی بہت سی خار دار اور بے ثمر جھاڑیوں اور درختوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایک ہی درخت کی۔

ایک ہی انسان چاہے جو انسان ہو اور ایک پوری قوم اور ایک پورے ملک کو زندہ کر دے۔ اس عالم کی رونق اقوام کے دم سے ہرگز اقوام کی زندگی و مرگ اشخاص ہی کے دم سے وابستہ ہے۔ قومیں مرتی ہیں اور زندہ ہوتی ہیں لیکن ان کی موت و حیات کے یہی معنی ہیں کہ پہلی صورت میں ان فوس عالیہ سے خالی ہو جاتی ہیں جن کے دم سے ان کی زندگی وابستہ تھی، اور دوسری حالت میں ان کے اندر ایسے وجود قدسیہ موجود ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کے سرچشمے سے پوری قوم کے کشت اقبال کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کتنے آدمی ہیں جن کا مرنا قوموں کا مرنا ہوتا ہے اور کتنے ہیں جو اپنے ظہور کے اندر ایک پوری قوم اور ملک کی زندگی کو پوشیدہ رکھتے ہیں؟

قیس سا پھر کوئی اٹھانہ بنی عالم سے
خبر ہوتا ہے گھرانہ کا سدا ایک ہی شخص

یہ ایک قاعدہ طبیعی ہے کہ کوئی زمین خواہ کیسی ہی بخر نظر آئے اور خواہ کتنی ہی اسباب و وسائل کشت کاری اور تربیت و پرورش زرعی سے محروم ہو لیکن اگر اس کی قوت نشوونما بالکل معدوم نہیں ہوگئی ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی

گوشہ سرسبز اور کسی نہ کسی کو نے میں کوئی بیج سر برآورد نظر آئیگا اور ایسا ہونا اس امر کی دلیل سمجھا جائیگا کہ گو اس زمین کو اپنے خزانہائے نباتاتی کے طور کے وسائل حاصل نہیں اور اسباب و ذرائع سے محروم ہو کر، بجز اور غیر شاداب سی ہو گئی ہو تاہم اس کی قوت نشوونما اب تک آمادہ ظہور و ارتقا ہو اور اگر دہقان کا ہاتھ اور باران رحمت کی نظر مہمیر آجائے تو فوراً اس کی حالت میں انقلاب عظیم ہو جاسکتا ہے۔

بصیہ یہی حال سرزمین حیات ملت کا بھی ہے۔ گو اس کی تمام سطح سرسبزی و شگفتگی کی جگہ خشکی و وحشت کا منظر ہوتا ہے اگر کسی ایک گوشہ میں بھی چند سبز شاخیں اور پتے نظر آ رہے ہوں تو نا اُمید نہ ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ اس کی قوت نشوونما ابھی تک فنا نہیں ہوئی اور دہقان کی محنت اور ابر کی بخشش اگر ساتھ دیں تو کچھ بعید نہیں کہ یہی وحشت کہہ ارضی ایک جنت سماجی بنجائے

آج صدیوں سے سرزمین اسلام پر جو تزل و اضطراب قلب و دماغ پڑھا رہا ہے، اس کا منظر یقیناً درد انگیز ہے لیکن اس مایوسی میں جو چیز اُمید لانے والی ہے وہ صرف یہ ہے کہ یا این ہمہ خشک سالی اور قحط کے آثار گو ہر طرف ہیں مگر زمین اب تک بجز اور شور ثابت نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ زمانہ شاداب اور وہ موسم نم و خیزاب چلا گیا جب ہماری سرزمین کے ایک ایک ذرے سے ناموران عالم اور ابطال ملت اٹھتے تھے، اور دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے صفحوں پر قابعن ہو جاتے تھے۔ تاہم اب بھی جب کبھی اسباب و وسائل ظہور جمع ہو جاتے ہیں تو کہیں نہ کہیں سے صدائے ابطال و امجاد کانوں میں آجاتی

ہر اور عالم اسلامی کا کوئی نہ کوئی گوشہ اوصاف و خصائل گرانمایہ کا نمود پیش کر دیتا ہو اور اس طرح یقین ہو جاتا ہو کہ زمین کی قوت نشوونما اب تک معدوم نہیں ہوئی، اور یاس و قنوط کے وقت میں ابھی دیر ہو۔ اب بھی اگر اس زمین کی درشکی کھجائے اور وسائل زراعت مہیا ہو جائیں تو اس کا چہ چہ گلجائے عطر نیز اور درختہائے شاداب سے لہلہا سکتا ہو۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُخَيِّلُ الْغَيْبَ ۚ لَمَّا كَانَتْ هُدًى لِّلْمُؤْمِنِينَ ۚ كَذَّابًا مَّنْ ذَاكَ الَّذِي كَذَّبَ عَنْكَ اللَّهُ وَأَنَّهُ يَسْخَرُ سَخِرَ لَكَ ۚ وَآلَهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ ۚ سَعَىٰ مَن يَدْعُوا ۚ لَا يَسْمَعُ دُعَاؤَهُمْ لَبِثَ لَظْفًا أَسْفَلَ ۚ

اس لیے کہ اللہ اور اس کی پراسرار قوتیں برحق ہیں اور اس لیے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہو اور نیز اس لیے کہ وہ ہر شکل و آئندہ علیٰ کُلِّ شئی سے مشکل بات پر قادر ہو۔

قدیر (۲: ۲۲)

فیضِ روح القدس اوباز مدد فرماید
دیگراں ہم بکنند انچہ مسیحامی کرد

موجودہ دور اسلام کا ایک ایسا ہی فرزند جلیل و دجود نبیل، سرنامہ صحیفہ عظمت و اجلال در ارفع منار المملکت والا سلام المرسل العالم بطل اور نہ غازی شگری پاشا (متع اللہ المسلمین، بطول حیات و حفظ وجودہ من شر اعدائہ) ہو جب کہ جنگ بقان کی پوری تاریخ ہمارے لیے درو انگیز و جانگاہ تھی جب کہ ملکوں پر ملکوں کے نکلنے اور شکستوں کے کھانے کی خبریں مسلسل و غیر منقطع تھیں، جبکہ مایوسی کی ایک گھاٹھی جس نے ہر طرف سے ہمیں گھیر لیا تھا، جب کہ حسرت کے ساتھ تاریخ کے گذشتہ صفحات کو ہم پڑھتے، اور اپنی موجودہ نامرادیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے تھے جبکہ تاریخ عثمانی کی

تعمد داستانیں ہیں یاد آتی تھیں، اور ہم متعجب ہو ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے تھے، کہ اگر آج محمد فاتح، سلیم ثالث، اور بایزید مہدوم دنیا سے نابود ہو گئے ہیں، تو کیا کوئی عہد پاشا، احمد طوسون، اور عثمان پاشا کبھی ترکوں میں باقی نہیں رہا؟ یعنی جب کہ غیروں کی فتح مندیوں نے ہمارے دلوں کو دو نیم اور اپنی نامرادیوں نے ہماری عزت ہزار سالہ کوسرنگوں کو دیا تھا، تو پھر جنگ کے آخری ایام میں ایک اسی پکیر شجاعت و بسالت، ستون آہنیں، عزم و ثبات و نصرت قہرمان دفاع ملی، بلند ساز لولئے عزت اسلامی، اسلام پرست ارجمند وغیرہ و جا تفرودش ملک و وطن محبوب کا وجود عظیم و جلیل تھا، جو عظمت ناکامی میں تیر درخشندہ حرب دفاع و استقلال، اور ضیاء تابان عظمت و جبروت ابطال بن کر سما، مجد خالد پر نظر افروز نگار گیان عالم ہوا، اور اپنے حیرت انگیز خوارق دفاع، اور مہجر العقول عزم و ثبات سے اس دور ناکامی و نامرادی میں عزت اسلامی و مجد عثمانی کو نابود و فنا ہونے سے بچا لیا! فالسلام علیک یا قذرة الابطال! والسلام علیک یا زبدة الامجاد!!

قوموں کی زندگی اپنے ناموران ابطال کی عزت و یاد سے وابستہ ہے۔ محاصرہ ادرنہ نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ با اتفاق موافق و مخالف، تمام تاریخ حرب عالم میں درجہ اعزاز سے نمایاں ہے۔ تاریخ قریب کے مشہور محاصرے مثل پیرس، باسٹوپول، پلیونا، لیڈی اسمتھ، پورٹ آر تھر ہائے سائے ہیں، اور جب تمام حالات و واقعات کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ آخری محاصرہ محاصرے کے ہر پہلو، بلکہ عام جزئیات تک میں اپنا نظیر و مماثل نہیں رکھتا۔

اس واقعہ کی عظمت نے یورپ کے ارباب بدینش و انصاف کی گروہیں
 جھکا دی ہیں۔ فرانس اور جرمنی کی فوجی حلقوں اور مشہور اخبارات نے تحریکیں
 شروع کر دی ہیں کہ اس قلعہ عظیم کے اعتراف کے ثبوت میں ان کے ملک
 قوم کی طرف سے غازی شکری پاشا کو تحائف دے جائیں۔ مصر میں بھی اس
 کی تجویز ہو چکی ہے، اگرچہ اس نے تا اس کا سامان بھی کر لیا ہے۔

